وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ
﴿۵۹:۷﴾
اور جو کچھ دے دیا تم کو رسول نے، تو لے لو اسے
﴿معارف القرآن﴾
الاربعین الاشرفی
فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ
شارح
رئیس المحققین
شیخ الاسلام والمسلمین
حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی
شیخ الاسلام ٹرسٹ
Shaikh-ul-Islam Trust

الاربعین الاشرفی

فی تفہیم الحدیث النبوی صلی اللہ علیہ وسلم

شارح

شیخ الاسلام والمسلمین

حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی

نام کتاب: 'الاربعین الاشرفی' ﴿فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ﴾

مصنف: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی، مدظلہ العالی

کور ڈیزائن وکمپیوٹرائزڈ کتابت: منصور احمد اشرفی ﴿نیویارک، یو ایس اے﴾

اشاعت اوّل: اگست ۲۰۰۵ء تعداد: ۲۰۰۰

ناشر اوّل: گلوبل اسلامک مشن، انک ﴿نیویارک، یو ایس اے﴾

اشاعت دوئم: رجب ۱۴۳۰ھ --بمطابق--- جون ۲۰۰۹ء

ناشر: شیخ الاسلام ٹرسٹ ﴿احمد آباد، انڈیا﴾

طباعت: مدنی آفسیٹ پرنٹرز ﴿کرجن، گجرات، انڈیا﴾

نگرانِ طباعت: سید شوکت علی اشرفی ﴿کرجن، گجرات، انڈیا﴾ (91) 9374657272

قیمت:

ملنے کا پتہ

- **انڈیا:** درگاہِ عالیہ، حضور محدث اعظم ہند، رحمۃ اللہ علیہ کچھوچھہ شریف، ضلع فیض آباد، یوپی
محدث اعظم مشن ﴿کرجن، گجرات﴾ اور مشن کی تمام شاخیں
- **انگلینڈ:** محدث اعظم مشن ﴿یو کے﴾: Blackburn ... Bolton ... Birmingham Dewsbury ... Leicester ... London ... Preston
- **امریکہ:** گلوبل اسلامک مشن انک ﴿نیویارک، یو ایس اے﴾ 800-786-9209
- **پاکستان:** (92) 346-298-5267 / (92) 302-284-3818

Madni Maskan, opp. Quraish Hall, Mirzapur,
Ahmedabad 380001 - Gujrat, India

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ۔۔۔اَمَّابَعۡدُ

عرض ناشر

اکتوبر ۲۰۰۸؁ء میں شیخ الاسلام ٹرسٹ (احمد آباد، انڈیا) نے حضور شیخ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی دامت برکاتہم العالیہ کی تصنیف لطیف، 'سید التفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی' ﴿جلد اوّل﴾ کی اشاعت کا جو پروگرام بنایا تھا، اللہ رب العزت کے کرم سے وہ دسمبر ۲۰۰۸؁ء ہی میں پایہء تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ شیخ الاسلام ٹرسٹ (احمد آباد، انڈیا) کی پہلی کوشش تھی، جسے قارئین نے بے حد پسند فرمایا اور کتاب ہزاروں ہاتھوں میں پہنچتی چلی گئی۔

حضور شیخ الاسلام نے کرم فرمایا اور تفسیر اشرفی ﴿جلد دوئم﴾ کیلئے تین اور پارے، یعنی چوتھے، پانچوے اور چھٹے کی تفسیر بھی فوراً ہی قلمبند فرمادی۔ ہم نے اس دوسری کتاب پر بھی مستعدی سے کام شروع کردیا اور اب یہ تفسیر اشرفی ﴿جلد دوئم﴾ بھی طباعت کے مرحلوں سے گزر رہی ہے، جو بہت جلد قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگی۔ ساتھ ہی ہمارے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی، کہ حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضور شیخ الاسلام مدظلہ العالی کے دوسرے رشحاتِ قلم بھی، اپنے ادارے سے شائع کرکے قارئین کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔

لہٰذا زیر نظر کتاب، 'الاربعین الاشرفی فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضور اکرم ﷺ کی چالیس احادیث مبارکہ کی شرح ہے، شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کتاب کو اس سے پہلے، اگست ۲۰۰۵؁ء میں گلوبل اسلامک مشن انک (نیویارک، یو ایس اے) نے شائع کیا تھا، جسکی مزید تفصیل قارئین اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمالیں گے۔

حضور شیخ الاسلام کے قلم گوہر بار سے نکلی ہوئی اربعین احادیث شریفہ کی شاندار شروحات کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ، حدیث اور کتابت حدیث اور حجیت حدیث کے عنوان سے، بہت ہی اہم اور معلوماتی مضامین بھی اس مجموعے میں شامل کئے گئے، جس سے کتاب کی افادیت اور اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ ہم گلوبل اسلامک مشن کی طرح اس اشاعت میں بھی، وہ تمام اہم مضامین شامل کررہے ہیں۔

ہم حضور شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی کے بے حد شکر گزار ہیں کہ وہ اردو زبان سے تعلق رکھنے والے مسلمانانِ عالم کیلئے، بہت ہی شاندار تحریری خزانہ چھوڑ رہے ہیں اور جسکی اشاعت کا شرف ہمیں حاصل ہو رہا ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے، کہ وہ حضور شیخ الاسلام والمسلمین کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے۔ ﴿امین﴾ ۔۔علاوہ ازیں۔۔ وہ تمام احباب جو اس کارِ خیر میں کسی بھی انداز سے مصروف ہیں، ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور شیخ الاسلام ٹرسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرماتے ہوئے دین متین کی بیش از بیش خدمت کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔

﴿ امین! بِجَاہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمُ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ﴾

ادارہ

شیخ الاسلام ٹرسٹ

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ ۔۔مطابق۔۔ ۹ جون، ۲۰۰۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَمَّا بَعْدُ

زیرِ نظر مجموعہ احادیث بمعہ شروحات، المعروف:

الاربعین الاشرفی

فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ

۔۔۔۔کی اشاعت ہمارے لئے ایک امتیازی نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اول اسلئے کہ یہ محبوب رب العالمین یعنی رحمۃ للعالمین ﷺ کے ارشادات عالیہ سے چن کر احادیث کا ایک گلدستہ تیار کیا گیا ہے اور دوم اسلئے کہ یہ رئیس المحققین، شیخ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی دامت برکاتہم العالیہ کے قلم گوہر بار سے نکلی ہوئی سیر حاصل شروحاتِ احادیث کا ایک مجموعہ ہے۔

شارح مدظلہ العالی دنیائے اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ خانوادۂ محدث اعظم ہند کچھوچھوی اور سلسلہء عالیہ اشرفیہ کے بزرگوں میں ایک روشن چراغ کی طرح ہیں جنھوں نے نہ صرف دنیائے خطابت پر نورانی جلوے بکھیرے بلکہ علم و عمل اور تحریر و تصنیف کے ذریعے بھی حُبِّ مصطفیٰ ﷺ کی نورانی کرنوں سے دور دور تک فرزندانِ توحید اور غلامانِ رسول ﷺ کے دلوں کو منور فرمادیا۔

آپ ۱۹۳۷ء میں کچھوچھہ شریف، یوپی، انڈیا، میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ شہزادۂ محدث اعظم ہند کی شان کے لائق تھا، تعلیم و تربیت مکمل کر لینے اور علوم ظاہری و باطنی پر کامل دسترس حاصل کر لینے کے بعد، جب حضور شیخ الاسلام نے تبلیغ اسلام و خدمت مسلک حقہ کی غرض سے دنیائے خطابت میں قدم رکھا، تو فن خطابت کو چار چاند لگاتے ہوئے، جلد ہی اپنے کو صف اول کے خطیبوں میں شمار کروالیا۔ حضور شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں صاحب دامت برکاتہم العالیہ شہزادۂ محدث اعظم ہند ہونے کے

ساتھ ساتھ سجادۂ آستانہء عالیہ حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

خانقاہی ذمہ داریاں، انتظاماتِ معمولات آستانہء عالیہ، اندرون و بیرون ملک جس میں امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، ہالینڈ، ساؤتھ افریقہ، وغیرہ ممالک شامل ہیں کے سفر کی سالانہ مصروفیات، مریدین ومعتقدین کے ایک جم غفیر کی ظاہری و باطنی تربیت کے انتظامات اور خاص طور پر انڈیا اور برطانیہ میں قائم شدہ محدث اعظم مشن کی سرپرستی اور دیکھ بھال، یہ وہ مصروفیات ہیں کہ جنہیں تمام تر خوش اسلوبیوں کے ساتھ سرانجام دینا، آج کے دور میں ایک بہت ہی بڑی کرامت ہے جو فضل خداوندی بوسیلہء حُبّ مصطفیٰ ﷺ سے آپ کو حاصل ہے۔

تبلیغی مساعی میں خطابت اور سفر کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ جب جب ضرورت پیش آئی اور موقع ملا، حضرت نے نوکِ قلم سے بھی دین متین اور مسلک حقہ کی خدمت کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور نہایت ہی محققانہ انداز میں معاملات کو سلجھا کر مسائل کا شرعی حل علمائے امت اور عوامِ اہلسنّت کے سامنے پیش کیا۔۔۔۔ چنانچہ غزالیٔ دوراں، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ (بانیء مدرسہء انوار العلوم، ملتان، پاکستان) آپکی تصنیف، 'وڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال' کے سلسلے میں آپ کو رئیس المحققین کے خطاب سے نوازتے ہوئے اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

'حضرت کا مکتوب گرامی شرف صدور لایا۔ یاد فرمائی کا بے حد شکریہ۔ جناب کے ارسال کردہ استفتاء وفتاویٰ کو بغور سنا۔ تینوں فتاویٰ حضرت کی فہم وذکاء اور تحقیق وجستجو کا منہ بولتا شاہکار ہیں۔ بے شک جناب کی ذہانت اور استنباط لائق صد ستائش اور قابل تحسین وآفرین ہیں۔ آپ نے جس آسانی سے ایسے مشکل مسائل کو عام فہم انداز میں ڈھال کر حل فرمایا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ بزرگان دین اور علماء امت کے مختلف اقوال کو جس عمدگی سے بیان فرمایا اور جس حسن وخوبی سے نبھایا ہے وہ آپ کی انشراح صدر اور علوم عقلی ونقلی میں مہارت تامہ کا مظہر اتم ہے۔ خصوصاً طرز استدلال اور انداز تحریر باعث رشک ہیں۔

میں ہر سہ فتاویٰ میں آپ سے متفق ہوں۔ بالخصوص وڈیو کیسٹ، ٹی وی اور فلم کے بارے میں جس قدر عرق ریزی سے جناب نے تحقیق فرمائی اور پھر جس خوبصورتی سے ان حقائق کی روشنی میں جائز وناجائز صورتوں میں امتیاز کرتے ہوئے فتویٰ قلمبند فرمایا وہ قابل تقلید ہے۔ اسی طرح فوٹو کے مسئلے میں بھی حضرت نے علماء اہلسنّت کے تمام اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ممنوع اور ناجائز صورتوں کو ممتاز فرما کر آپ نے حق واضح فرمادیا۔۔۔۔ نماز عشاء کے اوقات کے سلسلہ میں، میں نے بھی ایک فتویٰ مرتب کیا تھا جو پیش خدمت ہے۔

میں بارگاہِ عظمت پناہ میں صمیم قلب سے دعا گو ہوں کہ آپ جیسے اہل علم اور صاحب فہم و ذکا حضرات کا سایہ اہلسنّت پر تادیر قائم رہے۔اللہ تعالیٰ جل شانہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔'

حضرت کی یہ مایہء ناز تصنیف، 'ویڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال' بے حد مقبول ہوئی اور ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ شرع کی روشنی میں واضح ہو گیا۔۔۔۔اسکے علاوہ جس مسئلہ پر بھی حضرت نے قلم اٹھایا، نہایت ہی باریک بینی سے اسکا تجزیہ کرتے ہوئے ایک روشن راستے کا انتخاب کر کے امت مسلمہ کے سپرد کر دیا۔آپکی کچھ تصانیف بہت پہلے ہی منظر عام پر آچکی ہیں جو نہایت ہی مشہور ہوئیں جن میں سے ایک کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے اور جن میں 'اسلام کا تصور الٰہ اور مودودی صاحب'، 'اسلام کا نظریہء عبادت اور مودودی صاحب'، 'دین اور اقامت دین' (لفظ 'دین' پر مودودی خیالات کا عالمانہ تنقیدی جائزہ)، اور 'کتابت نسواں اور عصری تقاضے' وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے علاوہ زیر نظر تصنیف لطیف سے قبل اس ادارے کو حضور شیخ الاسلام اور آپ کے والد بزرگوار المعروف محدث کچھوچھوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی بیش بہا تصانیف کی اشاعت کا شرف حاصل ہو چکا ہے، جن میں اردو ترجمہء قرآن، 'معارف القرآن'، 'تفسیر اشرفی (پہلا پارہ)'، 'مسئلہ قیام وسلام اور محفل میلاد'، 'حدیث محبت'، 'حدیث جبرئیل' اور 'حدیث نیت' کی شروحات، 'دین کامل'، 'فریضہء دعوت وتبلیغ'، 'نظریہء ختم نبوت اور تحذیر الناس'، اور 'مقالاتِ شیخ الاسلام' شامل ہیں۔

رب ذوالجلال کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے کہ ہمیں ایک طرف تو بچپن ہی سے سہروردیہ سلسلہ میں ایک عظیم بزرگ، شیخ الشیوخ حضرت چودھری محمد اقبال حمید سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت ہونے کا موقع میسر آیا اور دوسری طرف امریکہ میں حضرت شارح، شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی دامت برکاتہم العالیہ کے قدموں سے وابستگی نصیب ہوئی۔ان ہی بزرگوں کا فیض کرم ہے کہ اس بیکار کو کارآمد بنا دیا اور دین متین اور مسلک حقہ کی خدمت پر مامور فرما دیا۔

ہم نے ۱۹۹۶ء میں گلوبل اسلامک مشن، انک کی بنیاد نیویارک، یو ایس اے میں رکھی جسکو قائم کرنے کا مقصد اخلاص کی بنیادوں پر بزرگانِ دین کے راستوں پر چلتے ہوئے دین متین اور مسلک حقہ کی ترویج واشاعت ہے۔یہ ہماری خوش بختی ہے کہ رب کائنات نے اپنے محبوب، آقائے دو جہاں ﷺ کے دین کی اس خدمت کا ہمیں موقع عطا فرمایا۔۔۔۔کہاں ہم کمتر اور کہاں یہ اعزاز۔۔۔۔جو کچھ ہے فضل خداوندی، عطائے مصطفوی ﷺ اور دعائے مرشد ہی سے ہے، کہ خاندان کے ہر فرد کی ہمراہی میں گلوبل اسلامک مشن کے کاروان کو لیکر آگے بڑھ رہے ہیں۔

میرے اور میرے اہل خانہ کیلئے یہ انعام واکرام کافی ہے کہ اللہ رب العزت ہم سب کو بزرگانِ دین وعلماءِ حق کے دامانِ کرم سے وابستہ رکھے اور یونہی دنیائے چندروزہ میں حیات کا ہر لمحہ دینِ متین اور مسلک حقہ کی خدمت میں صرف ہوتا رہے، یہاں تک کہ بارگاہِ الٰہی اور دربارِ رسول ﷺ میں مقبول ومنظور ہو۔ اللہ رب العزت سے دست بدعا ہوں کہ دین کی اس ادنیٰ سی خدمت کو اس مشن کے تمام اراکین کیلئے توشہءِ آخرت بنادے اور دیارِ غیر میں دین اسلام کی بیش از بیش خدمت کرنے کی توفیق مرحمت فرمادے۔ ﴿آمین﴾

زیرِ نظر کتاب، 'الاربعین الاشرفی' (فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ۴۰ احادیث مبارکہ کی شروحات پر مشتمل ہے۔ حضور شیخ الاسلام نے ۱۹۷۰ء میں حدیث کی مشہور و معروف کتاب، 'مشکوٰۃ شریف' کی مفصل شرح لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ماہنامہ 'المیز ان'، کچھوچھہ شریف، یوپی، انڈیا، میں قسط وار بعنوان 'تفہیم الحدیث' ہر ماہ پابندی سے چھپنے لگا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک 'المیز ان' نکلتا رہا۔ 'المیز ان' کے بند ہوجانے کے بعد شرح لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا۔ ہماری خواہش ہوئی کہ ان احادیث کی شروحات کو جمع کر کے ایک مجموعے کی صورت میں شائع کیا جائے تو ہماری درخواست پر حضور شیخ الاسلام کی وساطت سے شروحات کا یہ خزانہ ہم تک پہنچ گیا۔

مشہور حدیثوں کی عالمانہ، فاضلانہ ومحققانہ شرحوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، انکی افادیت اور بآسانی تقسیم کی خاطر چند شرحوں کو ہم نے انفرادی طور پر بھی شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا حدیث محبت کی شرح بعنوان 'محبت رسول ﷺ روحِ ایمان'، حدیث جبرئیل کی شرح بعنوان 'تعلیم دین وتصدیق جبرئیل امین' اور حدیث نیت کی شرح پہلے ہی قارئین کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہیں۔ بقیہ شروحات، اربعین کیلئے ناکافی ہونے کے باعث ہماری درخواست پر حضور شیخ الاسلام نے چند اور احادیث کی شروحات قلمبند کر کے ہمیں عنایت فرمادیں جس سے چالیس حدیثوں کی شروحات کا یہ مجموعہ مکمل ہوگیا اور اب قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائینگے کہ اس مجموعے کی ساری ہی احادیث، 'مشکوٰۃ شریف'، 'کتاب الایمان' سے لی گئی ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایسا اسلئے ہے کہ حضرت نے 'مشکوٰۃ شریف' کی مفصل شرح لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو ماہنامہ 'المیز ان' کے بند ہونے کے بعد منقطع ہوگیا اور ہمیں وہ ہی حدیثیں مل سکیں جنکی شرح ترتیب وار قلمبند کی جاچکی تھیں اور وہ سب کی سب 'کتاب الایمان' ہی کا حصہ ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا آتا ہے کہ یہ تمام حدیثیں ایک ہی جیسے مضامین پر مشتمل

ہیں، لیکن اگر حضرت کی شروحات کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو یہ بات اظہر من الشّمس ہو جائیگی کہ ہر ہر حدیث میں ایمان، اسلام، عقائد، اعمال اور دوسری ضروریاتِ دین اور انکے جزئیات کا بیش بہا خزانہ موجود و محفوظ ہے جنکا جاننا ہر مسلمان کیلیئے از حد ضروری ہے۔ حضرت نے احادیث کے ہر ہر لفظ کو لیکر 'جواہر پاروں' اور 'فوائد' کے تحت انکی تفصیلات درج فرما دی ہیں جن سے احادیث کا مفہوم و مضمون روز روشن کی طرح واضح ہو گیا ہے۔

سب سے پہلی حدیث کو، جو حدیث نیت کے نام سے مشہور ہے، لے لیجئے! شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جس نے یہ حدیث 'اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔۔۔' نہ سن رکھی ہو۔ مگر ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ حدیث کا جو مفہوم حضرت کی اس مفصل شرح کو پڑھ کر سمجھ میں آیا ہے، اس سے پہلے کبھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ اسی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس ادارے نے اس حدیث کو علیحدہ سے بھی شائع کر کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا اور اس مجموعے میں بھی سرفہرست رکھا۔ علماء اور عوام میں سے جس نے بھی اس حدیث کی اس شرح کا مطالعہ کیا، اس نے اسے بہت پسند کیا۔ حضرت کی تبحر علمی کو دل سے تسلیم کیا اور ہمیں دعاؤں سے نوازا۔

''عمل مباح'، نیت خیر سے مستحب و مستحسن ہو جاتا ہے'

حدیث نیت کی شرح کرتے ہوئے حضرت نے اس نکتہ کو اس سادگی سے سمجھایا کہ اہلسنّت کے سینکڑوں معمولات، کہ جن میں عوام تذبذب کا شکار رہو رہی ہے، کی حقیقت اور اصلیت کھل کر سامنے آ گئی۔۔۔۔ حضرت نے فرمایا:

> 'بلکہ جتنی عظیم نیت کے پیش نظر یہ اعمال انجام دیئے جائینگے، اُتنے ہی عظیم فوائد اور ثواب ان پر مرتب ہونگے۔۔۔۔ اور حدیث شریف کو سمجھ لینے کے بعد اختلافی مسائل کی بہت ساری گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔'

۔۔۔۔ حضرت نے شرح کے تحت، ہجرت کے باب میں بڑی سیر حاصل گفتگو کی اور حدیث کا مفہوم کھولکر سامنے رکھ دیا۔ ہجرت کے ضمن میں 'جہاد بالنفس' کا ذکر کرتے ہوئے عقل اور نفس کی پہچان کرائی اور ان دو کے تقاضوں پر روشنی ڈالی۔ حضرت نے اسی حدیث کی شرح کے تحت 'اہل عقل' و 'اہل نفس' کا تعارف بھی بڑی ہی خوبصورتی سے کروا دیا ہے۔

حدیث ۲ کی شرح کو لے لیجئے اور اسکے فائدہ ۷ کو بغور مطالعہ فرمائیے۔ حضرت وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کے تحت رقم طراز ہیں:

رسولِ کریم کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جملہ ارشادات کو تسلیم کیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی کسی عقیدے کا منکر ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس ایک عقیدے کا منکر ہے، بلکہ اسے رسالت محمدی ﷺ کا منکر قرار دیا جائیگا۔۔۔۔ المختصر۔۔۔۔ رسول کریم کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ سارے عقائد اسلامیہ پر ایمان لایا جائے۔

۔۔۔۔آگے چل کر حضرت نے قرآن وحدیث کی روشنی میں حضور علیہ السلام کی عبدیت کو 'مخصوص ترین عبدیت' ثابت کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ ہمارے نبی کی 'صفت عبدیت'، خود انکی 'صفت رسالت' پر افضل ہے۔۔۔۔ حضرت فرماتے ہیں:

مقامِ نبوت ورسالت بڑا ہی بلند و بالا مقام ہے جہاں تک کسی ایک غیر نبی کی کیا بات کی جائے بلکہ سارے غیر نبیوں کو جمع کر لیا جائے اور سب کے سب اپنے جملہ صفات کی توانائیوں کو سمیٹ کر پرواز کرنا چاہیں جب بھی وہ مقام نبوت کی ہوا تک نہیں پا سکتے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی غیر نبی کی عبدیت کسی نبی کے مقام نبوت ورسالت تک نہیں پہنچ سکتی اور اسکے برابر نہیں ہو سکتی، تو اس غیر نبی کی عبدیت، نبی ورسول کی اس عبدیت کے مقام کو کیسے چھو سکتی ہے جو اس نبی ورسول کی 'صفت نبوت ورسالت' سے بھی افضل ہے۔ ایسی صورت میں صرف لفظی اشتراک کی بنیاد پر کسی غیر نبی کا اپنی عبدیت کو رسول کی عبدیت جیسا تصور کرنا دبے لفظوں میں رسول کی 'صفت رسالت' پر اپنی برتری کا اظہار کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی جسارت کی توقع ایمان والوں سے نہیں کی جا سکتی۔ اسلئے کہ یہ جرأت صرف یہی نہیں کہ روحِ سعادت کے منافی ہے بلکہ دین و دیانت کو بھی خیر باد کہنا ہے۔

حدیث ۳ میں ایمان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے مستند حوالہ جات کے ذریعے ایمان کی ستہتر شاخوں کا ذکر فرمایا اور باور کرا دیا کہ:

جس کی اعتقادی اور عملی زندگی مذکورہ بالا جملہ شاخوں کے انوار سے مزین اور آراستہ ہے، یقیناً وہ مؤمن کامل ہے اور جو باوجود مکلّف ہونے کے، ان میں سے کسی ایک پر عمل پیرا نہ ہو سکا، اسکا ایمان ناقص ہے۔

۔۔۔۔اس حدیث مبارکہ کی شرح کا مطالعہ کر لینے کے بعد ہمارے لئے یہ بات پتہ لگانی آسان ہوگئی کہ ہم ایمان کی کس منزل پر کھڑے ہیں اور کاملیت ایمان کو پانے کیلئے ہمیں کہاں کہاں سے گزرنا پڑیگا۔

حدیث ۴ کی شرح میں حضرت نے واضح کر دیا کہ ہاتھ اور زبان سے کس کس طرح کی اذیتیں پہنچ سکتی ہیں کیونکہ حدیث میں اس قسم کی ایذاء رسانی کی سختی سے ممانعت کی جارہی ہے۔

حدیث ۵ کی شرح میں اُن تین خصلتوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے کہ جنکے سبب مؤمن ایمان کی لذت کو پالیتا ہے۔اسی حدیث کے فائدہ ۳ پر ذرا بغور نظر ڈالیں ،تو بات آسانی سے معلوم ہو جائیگی کہ حدیث میں مذکور خصائل ہمارے اندر نہ ہونے کے باعث جو ہم ایمان کی لذت محسوس نہیں کر پاتے ہیں،اس میں ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم نے اپنے کو مریض بنالیا ہے ۔۔۔حضرت فرماتے ہیں:

انسانوں میں کچھ ایسے ہیں جو صحتمند ہیں اور جنکی قوت ذائقہ کھانوں کی اصلی لذت کا ادراک کرتی ہے اور کچھ ایسے ہیں جو صفراوی مریض ہیں جنکی قوت ذائقہ اپنے صحیح احساسات کھو چکی ہے، ایسوں کو شہد میں بھی کوئی لذت نہیں ملتی۔ بلکہ شہد میں جو اصلی لذت ہے بالکل اسکے خلاف ذائقہ کا انھیں احساس ہوتا ہے۔اب اگر مریضوں کو شہد تلخ معلوم ہو،تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ شہد میں فی نفسہ شیرینی نہیں ۔شہد کی شیرینی سے لطف اندوز ہونا ہوتو اس کیلئے ضروری یہ ہے کہ تمام خارجی عوارض وموانعات سے اپنی قوت ذائقہ کی تطہیر کر لی جائے ،تاکہ قوت ذائقہ کا وہ فطری احساس بیدار ہو جائے جسکا فقدان شہد کو بھی تلخ بنائے ہوئے ہے۔بس کچھ اسی سے ملتا جلتا حال ایمان کا ہے۔ایمان میں شیرینی ہی شیرینی ہے،لذت ہی لذت ہے،مگر اس حقیقی شیرینی کے فطری احساس کیلئے ضروری ہے کہ انسانی قلب غفلتوں کی آلائشوں سے دور اور خواہشات شیطانیہ سے پاک و صاف ہو۔اسکے بغیر لذت ایمانیہ سے بہرہ وری ناممکن ہے۔قلب انسانی کی تطہیر کی صورت یہی ہے کہ انسان مکمل طور پر ان خوبیوں کا جامع ہو جائے جنکا ذکر حدیث زیر عنوان میں ہے۔

حدیث ۱۳ کی شرح میں نجد کے جغرافیہ کے تعلق سے جو مضمون اور نقشہ حضرت لائے ہیں،وہ اپنی مثال آپ ہے۔۔۔۔بہر حال ہر ہر حدیث کے ہر ہر لفظ کو لیکر حضرت شارح نے قرآن واحادیث کی روشنی میں اور اقوالِ محدثین کو سامنے رکھتے ہوئے،احادیث شریفہ کے مضامین کی نہایت ہی مفصل اور سادہ شروحات قلمبند فرمائی ہیں جسکا اندازہ قارئین کو اربعین کا مطالعہ کرنے کے بعد خود ہی ہو جائیگا۔ہم حضور شیخ الاسلام کے بے حد شکر گزار ہیں کہ حضرت نے ان شروحات کو شائع کرنے کی اجازت ہمیں مرحمت فرمائی۔اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مالک الملک اپنے حبیب پاک ﷺ کے وسیلہء جلیلہ سے حضور شیخ الاسلام کی عمر پاک اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور آپ کا علمی وروحانی فیض آپ کے مریدین،معتقدین، متعلقین ومتوسلین پر تا دیر جاری وساری رہے۔﴿امین﴾

اس مجموعے کو ایک اہم کتاب بنانے کیلئے اربعین احادیث کی شروحات ہی کافی تھیں،مگر شروحات کے اس گلدستے کو مزید رنگا رنگ اور خوشبودار بنانے کیلئے کچھ اہم مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ان مضامین کو ملاحظہ کرتے وقت ہمارے قارئین انکی اُس اہمیت کا اندازہ

کر لینگے جسکے پیش نظر ہم نے یہ مضامین اس کتاب میں شامل کئے ہیں۔

آج کے اس پُرفتن دور میں مسلمانوں کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے کیلئے اور انہیں اپنے نبی کی محبت اور تعلیمات سے دور رکھنے کیلئے جہاں دوسرے تمام ذرائع استعمال کئے جارہے ہیں، وہیں احادیث مبارکہ کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے اور مختلف شکوک وشبہات پیدا کر کے حدیث وسنت پر عمل کرنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ ایسے میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ان شکوک و شبہات کے پھیلاؤ کی وجہ سے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا بھرپور انداز میں جواب دیا جائے تاکہ سادہ لوح مسلمان حق و باطل میں امتیاز کرسکیں۔ لہٰذا حدیث، کتابت حدیث اور حجیت حدیث کے تعلق سے دلائل و براہین پر مبنی اہم مضامین اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں شامل، 'حجیت حدیث' کے تعلق سے شاندار مضمون ہمارے نہایت ہی محترم بزرگ، علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی مدظلہ العالی نے قلمبند کر کے عنایت فرمایا ہے۔ آپ جامعہ نضرۃ العلوم، کراچی، پاکستان سے منسلک ہیں۔ نہایت ہی سادگی و اخلاص کے ساتھ درس وتدریس، امامت وخطابت اور دارالافتاء کے فرائض کی انجام دہی کے ذریعے دین متین کی خدمت اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی شمع کو روشن رکھنے کیلئے اپنے کو وقف کررکھا ہے۔ اللہ رب العزت انکی صحت وعمر میں برکت عطا فرمائے۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت نکال کر یہ مضمون قلمبند فرمایا جس کیلئے ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔

'حدیث اور کتابت حدیث' کے عنوان سے ایک مفصل اور پرمغز مضمون ہمارے ادارے کے مشیر مذہبی امور اور نوجوان عالم دین، جناب مفتی محمد فخر الدین علوی اشرفی صاحب نے قلمبند فرمایا ہے۔ اپنا قیمتی وقت نکال کر نہایت ہی عرق ریزی سے اس مجموعے میں جہاں ضرورت ہوئی، اعراب وغیرہ لگانے اور عربی و فارسی متن کی پروف ریڈنگ کا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔ آپ دار العلوم فیض الرسول، براؤں شریف، یوپی، انڈیا، سے فارغ التحصیل ہیں، حافظ ہیں، حضرت شارح سے بیعت ہیں اور انہی سے خلافت واجازت حاصل ہے۔ امریکہ کی نیوجرسی اسٹیٹ میں دین اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ ہمارے ادارے گلوبل اسلامک مشن ﴿نیویارک، یوایس اے﴾ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ایک احسانِ عظیم ہیں کہ انکی مدد کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تمام مذہبی معاملات اور اشاعتی کام کاج میں ہماری معاونت فرماتے ہیں، جس کیلئے ہم انکے بے حد مشکور ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اس دیارِ غیر میں انہیں دین متین اور مسلک حقہ کی بیش از بیش خدمت کے مواقع مرحمت فرمائے اور انہیں اپنی امان میں رکھتے ہوئے، انکی صحت اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ ﴿آمین﴾

اس مجموعے میں شامل دونوں مقالوں میں عقلی ونقلی، ہر قسم کے دلائل و براہین کی روشنی میں منکرین حدیث کے بے بنیاد اعتراضات کے جوابات دیئے گئے اور انکی طرف سے پھیلائے ہوئے شکوک وشبہات کو رفع کیا گیا ہے۔قرآن کریم کی روشنی میں 'حجیت حدیث' ثابت کی گئی اور حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مختلف ادوار میں کتابت حدیث کو ثابت کیا گیا ہے۔

اس بات کو سمجھانے کیلئے کہ جس طرح اللہ عزوجل کا ہر ارشاد واجب التسلیم ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ہر فرمان بھی واجب الاعتقاد والعمل ہے، قرآن کریم کی ان گنت آیاتِ کریمہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔۔۔۔علاوہ ازیں۔۔۔۔حدیث شریف اوران پر عمل سے انکار کرنے والوں کے بارے میں آیاتِ قرآنی ظاہر کردی گئیں جن میں منکرین کیلئے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ان مضامین میں قرآن مجید کی روشنی میں حدیث رسول ﷺ کو واجب العمل والاعتقاد ثابت کردینے کے بعد منکرین حدیث کی قسموں کا ذکر کیا گیا اور پھر انکے انکار کو رد کرنے کیلئے تاریخ تدوین حدیث کا ایک طویل ترین جائزہ پیش کیا گیا ہے جس نے ہر قسم کے شکوک وشبہات کو دور کردیا۔تاریخ تدوین حدیث قلمبند کرتے وقت نہایت ہی قوی اور دقیق دلیلیں لائی گئیں ہیں۔

امام علوی کا مقالہ 'حدیث اور کتابت حدیث' دیکھنے میں طویل معلوم ہوتا ہے مگر بغور جائزہ لیا جائے تو ہر ہر واقعہ یا حوالہ، حدیث کی اہمیت اور صحابہء کرام کے احادیث کے بارے میں کمالِ احتیاط کو ظاہر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔۔۔۔تبع تابعین اور بعد کے دور سے ہی نہیں، بلکہ حقائق کی روشنی میں دور تابعین اور دور صحابہء کرام بلکہ خود حضور ﷺ کی موجودگی میں کتابت حدیث کو ثابت کیا گیا ہے۔

اتنے دلائل کی موجودگی میں اور شروع زمانے سے ہی کتابت حدیث ثابت ہوجانے کے باوجود بھی، اگر کوئی اپنی ہٹ دھرمی سے ماننے کو تیار نہیں، تو اسکا کیا علاج ہے۔اصل میں ایسے ہٹ دھرم لوگوں کا منشاء ماننا یا نہ ماننا نہیں، بلکہ انکی زندگی کا مقصد احادیث نبوی کے تعلق سے غلط فہمیوں کو پھیلانا ہوتا ہے، کیونکہ وہ اسی کام کی روٹی کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو انکے رسول ﷺ اور انکی تعلیمات سے دور رکھتے ہوئے کمزور کردیا جائے۔جب اہل حق کی صفوں میں اپنے کو کھڑا نہیں کر پاتے، تو دنیا کی عزت و دولت حاصل کرنے کیلئے نت نئے فتنے پیدا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو منفرد بنانے کیلئے دین اور دین کی تعلیمات کو برباد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔بہر حال ان مقالوں نے علم حدیث کے طالب علموں کیلئے اور عام قارئین کیلئے بھی اس کتاب کی افادیت کو دوبالا کردیا ہے۔

ہم اپنے نہایت ہی شفیق اور محترم بزرگ، حضور مسعود ملت، ماہر رضویات، جناب ڈاکٹر پروفیسر

محمد مسعود احمد صاحب مدظلہ العالی کے بے حد مشکور ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب پر تقدیم قلمبند کر کے اسے مزید بابرکت بنا دیا ہے۔ آپ کے چند الفاظ ہی ہماری اس اشاعت کیلئے سند بیش بہا اور مہر برکت ہیں۔ آپ ہم پر اور ہمارے ادارے پر نہایت ہی کریم ہیں بلکہ ہر ایک کیلئے جو اخلاص وحکمت کے ساتھ دین متین اور مسلک حقہ کی خدمت میں لگا ہوا ہے، آپکے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔۔۔آیئے، اور۔۔۔شفقت و محبت۔۔۔حوصلہ اور ہمت۔۔۔رہنمائی اور بے نیازی۔۔۔عجز وانکساری۔۔۔سادگی و بردباری۔۔۔کے خزانے پا جایئے۔ آپکا در کھلا ہے۔۔۔خدا کرے یہ در کھلا ہی رہے۔۔۔کہ ہم جیسے لوگوں کی آس بندھی رہے اور کام چلتا رہے۔۔۔خدا کرے آپکا سایہ تادیر ہم سب پر قائم ودائم رہے۔﴿امین﴾

تمام گھر والوں کے ساتھ ساتھ، میں مشکور ہوں خاص طور پر ۱۷ سالہ منصور احمد اشرفی کا کہ جنھوں نے ۳۶۸ صفحات کی اس کتاب کی کمپیوٹر سے کتابت اور کئی کئی مرتبہ اسکی تصحیح کی۔ امریکی پیدائش اور امریکی ماحول میں پلنے والے بچے کیلئے اس قسم کا کام کرنا جس میں اردو، عربی اور فارسی زبان کا استعمال ہو، آیاتِ قرآنی کی کتابت اور قرآن وحدیث پر اعراب وغیرہ لگانے کا معاملہ ہو، یہ کام آسان نہیں۔ مگر صرف بزرگانِ دین کی سرپرستی اور توجہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ منصور احمد اشرفی اور میرے گھر کے تمام بچوں کو تادم آخیر دین اسلام کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائے۔﴿امین﴾ سید ریاض علی اشرفی (کراچی، پاکستان) اور جناب سلیم الدین صاحب کا بھی نہایت مشکور ہوں کہ انکی کاوشوں کے باعث ایک خوبصورت کتاب طباعت کے مرحلے سے گزر کر شائع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انکو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ نہایت ہی عرق ریزی سے کئی کئی مرتبہ پروف ریڈنگ کی جا چکی ہے، پھر بھی قارئین سے گزارش ہے کہ اگر کوئی غلطی نوٹ فرمائیں، تو فوراً مطلع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

ہم پروردگار کے حضور دعا گو ہیں کہ ہماری اس کوشش ومحنت کو، جو اسی کی توفیق ہی سے ہے، منظور ومقبول فرمائے اور اسکو ہمارے لئے اپنے حبیب ﷺ سے قربت اور سچی غلامی حاصل کرنے کا وسیلہ بنا دے اور ہمیں روزِ محشر غلامانِ مصطفیٰ ﷺ کی صفوں میں جگہ عطا فرما دے۔

﴿ امین ! بِجَاہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ﴾

ناچیز

ابوالمنصور
محمد مسعود احمد
سہروردی، اشرفی

چیئرمین
گلوبل اسلامک مشن، انک
نیویارک، یو ایس اے

۲۴ جمادی الثانی، ۱۴۲۶ھ ۔۔۔ بمطابق ۔۔۔ ۳۱ جولائی، ۲۰۰۵ء

پیکرِ محبت واخلاص جناب محمد مسعود احمد صاحب زید مجدہ ﴿چیئرمین، گلوبل اسلامک مشن، نیویارک﴾ کرم فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کیلئے اپنے سینے میں دل اور دل میں درد رکھتے ہیں۔ انکی علمی اور تبلیغی کاوشیں لائق صد تحسین وآفرین ہیں۔۔۔۔ حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی الجیلانی مدظلہ العالی کی شرح مشکوٰۃ شریف کے چند اوراق 'تفہیم الحدیث' کے عنوان سے مدوّن کر کے فقیر کو تقدیم قلمبند کرنے کیلئے ارسال فرمائے۔ فقیر اس لائق نہیں کہ حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں دامت برکاتہم العالیہ کی نگارشات پر اپنے تاثرات قلمبند کرے۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث پاک کی شرح محبت وادب والا ہی کر سکتا ہے۔ جسکی محبت عقل کے تابع ہو، وہ نہ سمجھ سکتا ہے، نہ بیان کر سکتا ہے۔۔۔۔ روح کو عقل کے تابع ہونا چاہئے کہ فیض کے دروازے کھلے رہیں اور مضامین وارد ہوتے رہیں۔ الحمد اللہ! شارح محترم علامہ سید محمد مدنی میاں مدظلہ العالی علم وفضل اور صاحب قلب ونظر ہیں۔۔۔۔ آپ کی تصانیف، محبت رسول ﷺ روح ایمان ﴿نیویارک، ۲۰۰۳﴾، دین کامل ﴿نیویارک، ۲۰۰۳﴾، فریضہء دعوت وتبلیغ ﴿نیویارک، ۲۰۰۳﴾، تعلیم دین وتصدیق جبرئیل امین ﴿نیویارک، ۲۰۰۴﴾ وغیرہ آپکے علم وفضل پر گواہ ہیں، مولیٰ تعالیٰ اہلسنّت وجماعت پر آپ کا سایہ قائم رکھے۔ ﴿امین﴾

'الاربعین الاشرفی' فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ' میں چالیس احادیث کی شرح کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سینوں میں محفوظ کیں، سفینوں میں محفوظ کیں، مجتہدوں نے روح ورواں کو محفوظ کیا، محدثوں نے جسم وجاں کو محفوظ کیا۔۔۔ اللہ، اللہ، حفاظت کا کتنا عظیم اہتمام کیا گیا۔۔۔ ایسا اہتمام تو تاریخ میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔۔۔ جن باتوں کو سننے کیلئے ہر امت ترستی تھی، وہ باتیں اللہ کے کرم سے ہمیں مل گئیں۔ جن احادیث شریفہ کا اس مجموعہ میں انتخاب کیا گیا ہے، انکا تعلق مندرجہ ذیل موضوعات سے ہے۔۔۔۔ ارکانِ خمسہ، ایمان کے درجات، ایمان کی لذت، مسلمان کی تعریف، معیارِ محبت رسول، زمانے کی حقیقت، حقوق اللہ، حقوق العباد، فرائض ونوافل، جہاد، اوامر ونواہی، صدقہ وخیرات، مغفرت گناہ، صبر وثواب، دخول جنت۔۔۔۔ وغیرہ۔۔ وغیرہ۔۔۔۔

اللہ اللہ! حضور سید عالم ﷺ کی باتیں، یقین کی باتیں، شک وشبہ سے پاک باتیں، خوشبودار باتیں، تجربوں سے بے نیاز باتیں۔۔۔اللہ اکبر! زندگی کو تجربوں سے بے نیاز کردیا، کیسا کرم فرمایا ۔۔۔سفر کے بغیر منزل تک پہنچادیا۔۔۔آیاتِ قرآنیہ اوراحادیث نبویہ میں صدیاں گم ہوگئیں۔۔۔ تجربوں کے پرستاروں نے نظروں سے گرادیا، حیف! یہ کیا کیا؟۔۔۔اللہ اکبر! نقطوں میں سمندر، کلیوں میں گلشن، ستاروں میں آفتاب و ماہتاب، بولنے والے مول تول کرتے ہیں، مگر یہاں انمول باتیں، بے مول باتیں، سبحان اللہ۔۔۔اس وقت ضرورت ہے کہ سارے عالم کو حضور سید عالم ﷺ کی باتوں سے آشنا کیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ جس نے لامکاں میں پرواز کی، اس نے ہم کو بھی پرواز کرنا سکھایا ہے۔۔۔سوچنے کی بات ہے کہ انکواس کریم نے پڑھایا جسکی شان علم یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی ہوجائیں، سات سمندر اور روشنائی ہوجائیں۔۔۔قلم گھس گھس کر ختم ہوجائیں، روشنائی لکھتے لکھتے سوکھ جائے، پھر بھی اس کریم کی باتیں ختم نہ ہونگی، جس نے انکو پڑھایا ہے۔۔۔غور کیجئے جب پڑھانے والا اس شان کا ہے تو پڑھنے والا کس شان کا ہوگا۔

بے شک سید عالم ﷺ نے بے دست و پا انسان کو پرواز کرنا سکھایا۔۔۔انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ اسکے حضور حاضر ہوں اور زندگی میں پرواز کرنا سیکھیں۔۔۔ہماری پروازیں عذابِ جاں بنی ہوئی ہیں، یہ جسموں کو بلند کرتی ہیں اور جسموں ہی کو پامال کرتی ہیں۔۔۔آیئے وہ پرواز سیکھیں جو روحوں کو بلند کرے، جو مردوں کو زندہ کرے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم زندگی کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں اور بے عقلی یہ کہ سنوارنے کی کوشش کررہے ہیں۔۔۔جتنا ہم سنوارتے جاتے ہیں، زندگی بگڑتی جاتی ہے۔۔۔ وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام!

فقیر کی دعا ہے کہ مولیٰ کریم جناب محمد مسعود احمد سہروردی، اشرفی زید لطفہ، کی مساعی جمیلہ کو مقبول ومحمود اور مشکور فرمائے اور اسی طرح وہ آگے بڑھتے رہیں، کام کرتے رہیں، زندگیاں سنوارتے رہیں، اس وقت سب سے اہم مسئلہ انسان سازی کا ہے۔۔۔بے شک جس نے ایک جاں کو زندہ کیا اسنے سارے جہاں کو زندہ کیا۔۔۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں ۔۔ ۔ ۔۔ خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

احقر
محمد مسعود احمد، عفی عنہ
کراچی، سندھ، پاکستان

زیر نظر کتاب مستطاب 'تفہیم الحدیث' سے موسوم ہے اس نام میں دو کلمے ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔'تفہیم' ﴿۲﴾۔۔۔'الحدیث'

۔۔۔پہلا کلمہ 'تفہیم' باب تفعیل سے مصدر ہے بمعنی (سمجھانا) اسکی جمع 'تفہیمات' بنالی جاتی ہے اسکا مادہ (فاہ، ھاہ، میم) ہے۔۔۔قرآن مجید میں اس مادہ سے صرف ایک فعل، باب مذکور ہی سے آیا ہے۔

۔۔۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۔۔۔ ﴿سورۃ الانبیاء:۷۹﴾

پس ہم نے وہ معاملہ سلیمان (علیہ السلام) کو سمجھا دیا۔

دوسرا کلمہ 'الحدیث' اسماء عربیہ میں سے ایک اسم ہے بمعنی (بات) اسکی جمع 'احادیث' آتی ہے۔ قرآن کریم میں 'حدیث' (واحد) اور 'احادیث' (جمع) دونوں بعض مقامات پر 'لام تعریف' کے ساتھ اور بعض مقامات پر اسکے بغیر آئے ہیں، یہ کل اٹھائیس[۲۸] مقامات ہیں جن میں سے پانچ[۵] مقامات پر 'جمع' آئی ہے اور تیئیس[۲۳] مقامات پر 'واحد' آیا ہے۔ جملہ مقامات کی نشاندہی 'اَلْمُعْجَمُ الْمُفَهْرَسُ لِاَلْفَاظِ الْقُرْآنِ الْکَرِیْم' میں کی گئی ہے۔ سردست یہاں صرف ایک مقام کا ذکر کیا جاتا ہے۔۔۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۔۔۔ ﴿سورۃ التحریم:۳﴾

اور جب نبی (علیہ السلام) نے اپنی ایک بی بی سے ایک راز کی بات فرمائی۔۔۔

محترم قارئین! کتاب منیف 'تفہیم الحدیث' میں چونکہ کلمہ اولیٰ 'تفہیم' کی اضافت، کلمہ ثانیہ 'الحدیث' کی طرف ہے سو یہ مرکب اضافی ہے اور لغوی معنی (بات کو سمجھانا) ہے اور اسکا مفہوم اور مراد 'اس چیز کو سمجھانا ہے جس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف ہے خواہ قول ہو یا فعل یا تقریر۔ کیونکہ 'الحدیث' معرف باللام ہے اور اس میں 'لام' عہد خارجی کا ہے۔۔۔ کَمَالَا یَخْفٰی عَلٰی مَنْ لَّہٗ اَدْنٰی فَھْمٌ۔

۔۔۔نیز۔۔۔'تفہیم الحدیث' میں اضافۃ المصدر الی المفعول یعنی مصدر کی اضافت، مفعول بہ کی طرف ہے اور مفعول بہ کا ذکر، دلیل ہے وجود فاعل پر، عام اس سے کہ مذکور ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ 'تفہیم الحدیث' یعنی حدیث رسول مکرم ﷺ کو سمجھانا بغیر سمجھانے والے کے کیونکر ہوگا اور یہاں ظاہر میں وہ کتاب 'الاربعین الاشرفی' ہے جو شیخ طریقت، رہبر شریعت، شیخ الحدیث، جامع

المنقول والمعقول حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی کی تصنیف لطیف ہے۔ یوں دراصل بذریعہ کتاب ھذا، بعض احادیث رسول معظم ﷺ کو اپنے فہم عالی اور اسلاف کی تحریرات ساطعہ کے مطابق سمجھانے والے علامہ موصوف ہیں۔ اظہر من الشمس ہے کہ تفہیم بغیر فہم کے، یعنی سمجھانا بغیر سمجھنے کے کیسے ہوگا؟ کہ تفہیم موقوف ہے فہم پر۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث مبارک کو سمجھانے کیلئے پہلے اسے سمجھنا ضروری ہے اور فہم دین، کہ حدیث رسول مصطفیٰ ﷺ دین مقبول کی اصل ثانی ہے، ہر کس و ناکس کو کب حاصل؟ بلکہ وہ خوش نصیب جسکے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین متین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔۔۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ﴿متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح: صفحہ ۳۲﴾

اللہ تعالیٰ جسکے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کا فقیہ بنا دیتا ہے

مکرم قارئین! آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ 'تفہیم' مصدر سے قرآن مجید میں صرف ایک[۱] ہی فعل آیا ہے اور اسکا فاعل اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اور لام تعریف کے ساتھ یا اسکے بغیر لفظ 'حدیث' قرآن کریم میں تیئیس[۲۳] مقامات پر آیا ہے۔ اہل محبت، ان دونوں باتوں کو دل و دماغ میں محفوظ کرتے ہوئے ایک محبت آمیز بات سے محظوظ ہوں، اگرچہ اسکا تعلق دلائل و براہین سے نہیں ہے۔ وہ بات یہ کہ نبی مکرم نور مجسم ﷺ نے چالیس[۴۰] سال کی عمر مبارک میں اعلان نبوت فرمایا اور اعلان نبوت فرمانے کے بعد نبوت کے تیرہ[۱۳] سال مکہ مکرمہ میں اور بعد ہجرت دس[۱۰] سال مدینہ منورہ میں دَاعِیَ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی کی حیثیت سے گزارے۔ یوں نبوت کے تیئیس[۲۳] سال ہوئے اور اس عرصہ میں آپ پر وحی کا نزول ہوتا رہا۔

﴿الف﴾۔۔۔ وحی متلو کا جو 'القرآن' ہے ﴿ب﴾۔۔۔ وحی غیر متلو کا جو 'الحدیث' ہے

اب آیئے ذکر کردہ دو باتوں یعنی ایک[۱] اور تیئیس[۲۳] کی جانب۔ اس میں گویا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یکتا و یگانہ نے بے مثل و بے نظیر خاتم النبیین پر نبوت کے تیئیس[۲۳] سال میں وحی نازل فرما کر آپکو 'قرآن عظیم' عطا فرمایا جو اصل الاصول اور شرع مطہر کی اصل اول ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ سرمدی جوامع الکلم یعنی 'الحدیث' سے سرفراز فرمایا جو شرع مطہر کی اصل ثانی ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ ظاہر ہے کہ تفہیم و فہم یعنی سمجھانا اور سمجھنا دونوں سے متصف ہونیوالا اپنے اندر جس درجہ کی کاملیت واکملیت لئے ہوگا، اسی درجہ کی اسے تفہیم اور فہم حاصل ہوگا۔ صاحب (تفہیم الحدیث) کو اللہ تعالیٰ نے فہم دین کی عظیم دولت علمیہ و روحانیہ سے سرفراز اور بہرہ مند کیا ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ تفہیم پر وہ ملکہ و مہارت عطا فرمائی ہے کہ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

رب کریم کا کرم ہے کہ آپکو اپنے اسلاف و اکابرین کا علمی و روحانی فیض بالعموم اور محدث

اعظم ہند حضرت علامہ سید محمد کچھوچھوی علیہ رحمۃ کا بالخصوص عطا ہوا، جو آسمان شریعت وطریقت اور معرفت کے ایک تابندہ ستارے ہیں اور آپ انہی کے فرزندار جمند اور ’الولد سر ابیہ‘ کے کامل مصداق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ متعدد خوبیوں سے متصف ہیں بلکہ اپنی حد میں جامع الصفات ہیں۔ خصوصاً تحریر و تقریر میں کہ آپکی تصانیف سنیہ اور خطابات رفیعہ اہل اسلام کے قلوب و اذہان میں فہم دین کے وہ تخم بو رہے ہیں جو آنیوالے کل میں علمی و عملی پھلدار تناور شجر کی صورت میں ظاہر ہونگے۔ ﴿امین! یارَبَّ الْعالَمِینَ بِجاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِینَ﴾

مُقدّمۃ
حجیت حدیث

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْاٰیَاتِ الْقُرْاٰنِیَۃِ وَھَدٰنَا بِھَا اِلَی الْعَقَائِدِ الْاِیْمَانِیَّۃِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْحَبِیْبِ سَیِّدِ الْاَفْرَادِ السَّابِقَۃِ وَالْمَوْجُوْدَۃِ وَالْاٰتِیَۃِ وَعَلٰی اٰلِہِ الْعِظَامِ الْعَلِیَّۃِ وَصَحْبِہِ الْکِرَامِ الْبَرَرَۃِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ

وبعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔۔۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴿سورۃ المائدۃ:۳﴾

’اور میں نے پسند کیا تمہارے لئے اسلام کو بطور دین‘

مذکورہ بالا آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ’اسلام‘ دین مرضی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین، اسلام ہی ہے۔۔ نیز۔۔ یہی دین مقبول ہے۔۔۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ﴿سورۃ آل عمران:۱۹﴾

’بے شک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے‘

علامہ ابن کثیر نے اسلام کے مفہوم کو بڑے آسان اور واضح الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

’ھُوَ اتِّبَاعُ الرُّسُلِ فِیْمَا بَعَثَھُمُ اللّٰہُ بِہٖ فِیْ کُلِّ حِیْنٍ حَتّٰی خُتِمُوْا بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ الَّذِیْ سَدَّ جَمِیْعَ الطُّرُوْقِ اِلَیْہِ اِلَّا مِنْ جِھَۃِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ‘۔

ہر زمانہ کے نبی پر اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا اسکی اطاعت و اتباع کو اسلام کہتے ہیں، یہاں تک کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے جب نبوت کا سلسلہ ختم ہوا تو اسلام نام ہو گیا اتباعِ محمدی کا۔

اس ذاتِ اقدس کو چھوڑ کر کوئی شخص اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کریگا، تو وہ گمراہی کا راستہ ہوگا۔
اس آیت سے تاریخ ادیان کے طالب علم کیلئے قرآن نے ایک بڑی الجھی ہوئی گرہ کھول دی۔ اس نے بتا دیا کہ مختلف انبیاء، مختلف زمانوں میں الگ الگ دین لیکر نہیں آئے، بلکہ سب نے اپنے اپنے وقت میں ایک ہی دین کی دعوت دی اور ایک ہی دین کی تبلیغ کی، کیونکہ وہ سب حق کے پیغامبر تھے، حق کی طرف بلانے والے تھے، حق کے ساتھ مبعوث کئے گئے تھے۔ اور حق ایک ہی ہے، اسلئے سب ایک ہی دین کے مبلغ بن کر آئے تھے۔
اب خاتم الانبیاء بھی اس دین کے داعی بن کر آئے ہیں، کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے۔ اسلئے اب حضور کا دین ہی 'دین اسلام' ہے۔ حضور کی غلامی چھوڑ کر جو شخص بھی کوئی دوسرا دین اختیار کریگا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں ہوگا۔ ﴿ضیاء القرآن: جلداول، صفحہ ۲۱۵﴾
اظہر من الشمس ہوا کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ جو دین متین اللہ عزوجل کی طرف سے لیکر آئے وہ اسلام ہی ہے۔ اب دین اسلام کے سوا کوئی دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں ہوگا۔
۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار جو اپنے دین کو افضل و مقبول کہتے ہیں، اس آیت کریمہ نے انکے دعویٰ کو باطل کر دیا کہ اب یہی دین اسلام، اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اور اسکی بارگاہ میں مقبول ہے۔۔۔۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

﴿سورۃ آل عمران: ۸۵﴾
'اور جس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کیا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا'

روزِ روشن سے زیادہ واضح ہوا کہ اب اگر کوئی محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین، اسلام کو قبول نہیں کرتا، کسی اور دین کو مانتا ہے، تو اسکا وہ دین اللہ عزوجل کی بارگاہ میں مقبول نہیں بلکہ مردود ہے۔
۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ اخروی فوز و فلاح، کامیابی و کامرانی، دائمی عذاب سے نجات اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جنت اور گمان سے ماوراء بے انتہا جنتی نعمتیں، سب سے بڑھ کر دیدارِ الٰہی، اب اسی کیلئے ہے جو نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین اسلام کو قبول کر کے اس پر ثابت قدم رہے گا۔ سو اب جو اسے قبول نہیں کریگا تو وہ آخرت کی نعمتوں سے محروم اور دائمی عذاب میں محبوس ہوگا۔
جاننا چاہئے کہ اسلام و ایمان باہم متلازم ہیں۔۔۔۔ بایں معنی۔۔۔۔ کہ اسلام بغیر ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے معتبر نہیں۔ لہٰذا اسلام و ایمان کی قدر و قیمت، مقام و منزلت اور اہمیت جاننے

کیلئے کفر کے انجام پر غور کرنا چاہیئے کہ۔۔۔ تُعرَفُ الْاَشیَاءُ بِاَضدَادِھَا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۠ (۹۱)

﴿سورۃ ال عمران:۹۱﴾

’بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ حالت کفر میں مر گئے تو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا، اگر چہ اپنے چھٹکارے کو دے، ان ہی لوگوں کیلئے دردناک عذاب ہے اور انکا کوئی مددگار نہیں ہے‘

جو کافر، کفر پر فوت ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اسکی کسی نیکی کو ہرگز قبول نہیں فرمائے گا، خواہ اس نے عبادت کی نیت سے روئے زمین کے برابر سونا خیرات کیا ہو اور نہ روئے زمین کے برابر سونا آخرت میں اسکے عذاب کا فدیہ ہو سکتا ہے۔ ﴿تبیان القرآن: جلد دوم، صفحہ ۲۴۴﴾

امام محمد بن اسماعیل بخاری ﴿م ۲۵۶ھ﴾ روایت کرتے ہیں:

’حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: قیامت کے دن ایک کافر کو لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا یہ بتا کہ اگر تیرے پاس اتنا سونا ہو کہ تمام زمین کو بھر لے، کیا تو اس کو فدیہ میں دے گا؟ وہ کہے گا، ہاں!۔۔۔ اس سے کہا جائے گا تجھ سے تو دنیا میں اس سے کہیں آسان چیز (اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے) کا سوال کیا گیا تھا۔

﴿صحیح بخاری: جلد دوم، صفحہ ۹۶۸﴾

اس آیت کے اخیر میں فرمایا کہ کفار کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور اس میں حصر فرمایا ہے، یعنی صرف انہی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ اس آیت میں مومنین کیلئے شفاعت کے قبول ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر مومنوں کیلئے بھی شفاعت قبول نہ ہو، تو اول تو حصر صحیح نہیں رہے گا۔۔۔ ثانیاً: اگر مسلمانوں اور کافروں دونوں کے حق میں شفاعت کا مقبول نہ ہونا مشترک ہو، تو یہ چیز صرف کافروں کیلئے کیونکر حسرت و حرمان اور وعید کا سبب بن سکتی ہے۔ ﴿تبیان القرآن: جلد دوم، صفحہ ۲۴۵﴾

معظم قارئین! اسلام و ایمان مشتق منہ اور مسلم و مؤمن مشتق ہیں۔ آپ اسلام و ایمان کی اہمیت انکے باہمی تلازم اور انجام کفر سے متعلق تحریر پڑھ چکے ہیں۔ اب اختصاراً مسلم و مؤمن سے متعلق تحریر ملاحظہ ہو۔

ایمان اور اسلام واحد ہیں یہ مفہوماً متغائر ہیں اور مصداقاً متحد ہیں۔ غرضیکہ از روئے لغت

ایمان و اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بنا پر ایمان و اسلام کے اختلاف کا ذکر ہے، لیکن خود قرآن و حدیث ہی کی تصریحات کے مطابق یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً، ایمان بدونِ اسلام یا اسلام بدونِ ایمان کے معتبر نہیں۔ اسی مضمون کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی ساخت تو ایک ہے، فرق مبداء و منتہی کا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر پر منتہی ہوتا ہے اور اسلام ظاہر سے شروع ہو کر قلب پر منتہی ہوتا ہے۔ اگر قلبی تصدیق، ظاہری اقرار تک نہ پہنچے، تو وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح ظاہری اقرار اطاعت اگر تصدیق قلبی تک نہ پہنچے، تو وہ اسلام معتبر نہیں۔۔۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

'شریعت میں ایمان کا معنی یہ ہے کہ نبی ﷺ، اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو کچھ (احکام اور خبریں) لیکر آئے ہیں ان سب کی تصدیق کی جائے۔ یعنی جن چیزوں کے متعلق ہدایت کے ساتھ یہ اجمالاً معلوم ہو کہ آپ انکو اللہ تعالیٰ کے پاس سے لیکر آئے ہیں انکو دل سے مان لینا مؤمن ہونے کیلئے کافی ہے۔' ﴿شرح عقائد: صفحہ ۹۰﴾

اور اجمالاً یہ مانے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو خبریں لیکر آئے ہیں وہ سب سچی ہیں اور آپ جو احکام لیکر آئے ہیں وہ سب برحق ہیں۔ جن کاموں کا آپ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرے گا اور جن کاموں سے روکا ہے ان سے اجتناب کرے گا، اس عہد کو ماننے اور اس کی تصدیق کرنے والا مسلمان ہے۔۔۔ صدر الشریعہ، حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

'ایمان اسے کہتے ہیں کہ سچے دل سے ان سب باتوں کی تصدیق کرے جو ضروریاتِ دین ہیں اور کسی ایک ضرورتِ دینی کے انکار کو کفر کہتے ہیں اگرچہ باقی تمام ضروریات کی تصدیق کرتا ہو۔'

ضروریاتِ دین وہ مسائل دین ہیں جن کو ہر خاص و عام جانتے ہوں، جیسے اللہ عزوجل کی وحدانیت، انبیاء کی نبوت، جنت و نار، حشر و نشر وغیرہا۔۔۔ مثلاً: یہ اعتقاد کہ حضور اقدس ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ حضور کے بعد کوئی نیا نبی نہیں ہوسکتا۔

عوام سے مراد وہ مسلمان ہیں جو طبقۂ علماء میں نہ شمار کئے جاتے ہوں، مگر علماء کی صحبت سے شرفیاب ہوں اور مسائل علمیہ سے ذوق رکھتے ہوں۔ نہ وہ کہ کوردہ اور جنگل اور پہاڑوں کے رہنے والے ہوں، جو کلمہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے کہ ایسے لوگوں کا ضروریاتِ دین سے ناواقف ہونا اس ضروری کو غیر ضروری نہ کردیگا، البتہ انکے مسلمان ہونے کیلئے یہ بات ضروری ہے کہ ضروریاتِ دین کے منکر نہ ہوں اور یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ اسلام میں جو کچھ ہے حق ہے، ان سب پر اجمالاً ایمان لائے ہوں۔

رہا اقرار۔۔۔اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تصدیق کے بعد اسکو اظہار کا موقع نہ ملا، تو عند اللہ مؤمن ہے اور اگر موقع ملا اور اس سے مطالبہ کیا گیا اور اقرار نہ کیا، تو کافر ہے اور اگر مطالبہ نہ کیا گیا تو احکامِ دنیا میں کافر سمجھا جائے گا مگر عند اللہ مؤمن ہے، اگر کوئی امر خلافِ اسلام ظاہر نہ کیا ہو۔

واضح ہوا کہ ضروریاتِ دین کی دو قسمیں ہیں۔قسم اول تو وہ ہے جسکا دینی ضروری ہونا خواص کو معلوم ہوتا ہے اور ان عوام کو بھی معلوم ہوتا ہے جو علماء سے ربط وضبط رکھتے ہیں۔تو قسم اول کا انکار خواہ عوام کریں یا خواص، بہر حال یہ کفر قطعی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جسکا ضروری دینی ہونا بعض عوام پر مخفی ہوتا ہے مگر عوام میں سے کوئی انکار کردے تو اسے کافر قرار نہیں دینگے، لیکن جب کہ علماء اسکو بتادیں کہ یہ مسئلہ بھی ضروری وقطعی ہے اور اس پر بھی وہ از راہ عناد انکار پر اڑا رہے، تو اب اسکی تکفیر کی جائے گی۔

۔۔۔الغرض۔۔۔ضروریاتِ دین، اصطلاحِ شریعہ میں انہی امور کو کہا جاتا ہے جو حضور سرورِ دوعالم ﷺ سے بطریق تواتر ثابت ہوں اور عام طور پر مسلمان ان امور کو جانتے ہوں۔اسلام وایمان کیلئے ان امور کا تسلیم کرنا لازم وضروری ہے اور انکا انکار کفر ہے بلکہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ضروریاتِ دین پر ایمان کیلئے انکی پوری تفصیل کا معلوم ہونا ضروری نہیں۔نفس ایمان کیلئے اجمالی تصدیق بھی کافی ہے۔۔۔۔تفصیلی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

مؤمن: وہ شخص ہے جو حضور اکرم ﷺ کی دل سے تصدیق کرے
ہر اس امر میں جسکا ثبوت آپ سے قطعی طور پر ہوا ہے۔

مسلمان: وہ شخص ہے جو اللہ ورسول کی اطاعت کا اقرار کرے
بشرطیکہ اسکے ساتھ تصدیق قلبی بھی ہو۔

عزیز قارئین! بات طویل ہوگئی۔۔۔۔خیر اب مقصود اصلی کی طرف آتے ہیں جسکی تمہید آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔۔۔۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

﴿سورۃ الشوریٰ:۱۳﴾

'اللہ نے تمہارے لئے اسی دین کا راستہ مقرر کیا ہے جسکا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس دین کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے اور جسکا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو'۔۔۔

۔۔۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے اور وہ اسلام ہے۔
۔۔نیز۔۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ ﴿سورۃ المائدۃ:۴۸﴾

'ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے الگ الگ شریعت اور واضح راہ عمل بنائی ہے'

۔۔۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کی شریعت الگ ہے۔علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

عَنْ قَتَادَةَ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا قَالَ الدِّيْنُ وَاحِدٌ وَّالشَّرِيْعَةُ مُخْتَلِفَةٌ

﴿عمدۃ القاری: جلد ا صفحہ ۱۱۷﴾

'شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کی تفسیر میں قتادہ نے کہا دین ایک ہے اور شریعت مختلف ہے'

۔۔۔صدرالافاضل، بدرالاماثل لکھتے ہیں:

'حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایمان حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے
یہی ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا
اسکا اقرار کرنا اور شریعت وطریق ہر امت کا خاص ہے۔'

حاصل یہ ہے کہ جو عقائد اور اصول تمام انبیاء میں مشترک ہیں۔۔۔مثلاً: توحید، رسالت، قیامت، جزاء، سزا، اللہ کی تعظیم اور اسکے شکر کا واجب ہونا، قتل اور زنا کا حرام ہونا، انکا نام دین ہے اور ہر نبی نے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے عبادات اور نظام حیات کے جو مخصوص احکام بتائے وہ شریعت ہے۔انکو مدون اور منضبط کرنا ملت ہے اور امام اور مجتہد نے کتاب اور سنت سے جو احکام مستنبط کئے انکا نام مذہب ہے۔

پس ہمارا دین، اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ہے۔البتہ ہماری شریعت، شریعت محمدیہ ہے جو شرائع سابقہ کی ناسخ ہے۔اس شریعت مطہرہ کے چار اصول ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔قرآن مجید ﴿۲﴾۔۔۔حدیث رسول ﷺ

﴿۳﴾۔۔۔اجماعِ امت مسلمہ ﴿۴﴾۔۔۔قیاسِ مجتہد

تفصیل کتاب اصول میں مذکور ہے، یہاں صرف یہ بات عرض کرنی ہے کہ:

'حدیث رسول ﷺ شریعت مطہرہ کی اصل ثانی ہے۔اور یہ بات امت مسلمہ نے ابتداء سے مانی ہے'
۔۔۔مگر اب کچھ حضرات اپنی من مانی کررہے ہیں۔

۔۔۔۔نیز۔۔۔۔اصل سے مراد دلیل ہے۔یعنی حدیث رسول، دلیل وحجت ہے۔مگر وہی اپنی

من مانی کرنے والے حضرات اس پر حجت کر رہے ہیں، حالانکہ حجیت حدیث پر امت مسلمہ متفق ہے۔
چالیس احادیث کریمہ کے متون، انکے تراجم ۔۔۔۔نیز۔۔۔۔انکی بصورت 'فوائد' اور 'جواہر پارے' تشریحات پر مشتمل کتاب پر تاب کے حوالہ سے انسب یہ ہے کہ 'حجیت حدیث' پر ایک مختصر و جامع مضمون قلمبند کر دیا جائے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دراصل وہ حضرات روحانی علیل ہیں جو حدیث رسول کے حجت اور دلیل ہونے کے منکر ہیں۔

حسب سابق، علمائے حق اہلسنّت و جماعت کے حدائق علمیہ سے چند پھول چن کر ایک گلدستہء حجیت حدیث سے قرطاس کو زینت دی جارہی ہے۔ بارگاہ خداوند قدوس سے امید واثق ہے کہ قارئین کے اذہان وقلوب، اسکی خوشبو اور مہک سے معطر و معنبر ہونگے۔مولیٰ تعالیٰ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اسے عامۃ المسلمین کیلئے وجہ تسکین دل اور منکرین کیلئے باعث ہدایت بنائے۔

گلدستہء حجیت حدیث

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور افعال کی پیروی کا حکم دیا ہے۔۔چنانچہ۔۔اللہ تعالیٰ ارشادفرماتا ہے:

﴿۱﴾ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴿سورۃ النساء:۵۹﴾
اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو

﴿۲﴾ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ﴿سورۃ حشر:۷﴾
اور رسول تم کو جو (احکام) دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ

﴿۳﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۔۔۔ ﴿سورۃ آل عمران:۳۱﴾
آپ فرمادیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔

﴿۴﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔۔۔ ﴿سورۃ احزاب:۲۱﴾
تمہارے (اعمال کیلئے) رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور آپکے افعال کی اتباع قیامت تک کے مسلمانوں پر واجب ہے۔اب سوال یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے احکام اور آپکے افعال کا کس ذریعہ سے علم ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو ہمارے لئے نمونہ بنایا

ہے، پس جب تک حضور کی زندگی ہمارے سامنے نہ ہو، ہم اپنی زندگی کو حضور کے اسوہ میں کیسے ڈھال سکیں گے۔ اور جبکہ ہمیں اسوۂ رسول پر اطلاع صرف احادیث سے ہی ممکن ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس طرح صحابہ کیلئے بہ نفس نفیس رسول اللہ ﷺ کی ذات ہدایت تھی، اسی طرح ہمارے لئے حضور کی احادیث ہدایت ہیں اور اگر احادیث رسول کو حضور کی دی ہوئی ہدایت اور آپکے نمونہ کیلئے معتبر ماخذ نہ مانا جائے، تو اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر ناتمام رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رشد وہدایت کیلئے صرف قرآن کو کافی قرار نہیں دیا، بلکہ قرآن کے احکام کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے احکام کی اطاعت اور انکے افعال کی اتباع کو بھی لازم قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور افعال کو جاننے کیلئے احادیث کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

احادیث شریفہ کو اگر معتبر نہ مانا جائے، تو نہ صرف یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہدایات سے ہم محروم ہونگے بلکہ قرآن کریم کی دی ہوئی ہدایات سے بھی ہم مکمل طور پر مستفید نہیں ہوسکیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کیلئے قرآن نازل فرمایا لیکن اسکے معانی کا بیان اور اسکے احکام کی تعلیم رسول اللہ ﷺ کے سپرد کردی۔۔چنانچہ۔۔ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴿سورۃ نحل:۴۴﴾

اور ہم نے آپکی طرف ذکر (قرآن کریم) نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کو بیان کردیں کہ انکی طرف کیا احکام نازل کئے گئے ہیں۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴿سورۃ البقرہ:۱۲۹﴾

اور (رسول مسلمانوں کو) کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہہ دے کہ آیات کے معانی کا بیان اور کتاب وحکمت کی تعلیم صرف صحابہ کیلئے تھی، تو میں:

۔۔۔اولاً: یہ کہوں گا کہ اسلام صرف صحابہ کا نہیں بلکہ قیامت تک کے مسلمانوں کا دین ہے، اسلئے جس ہدایت کی انھیں ضرورت تھی ہمیں بھی ضرورت ہے۔

۔۔۔ثانیاً: صحابہ کرام جب اپنے بلند مقام اور جناب رسالت مآب ﷺ سے قرب کے باوجود قرآن مجید کے احکام کو سمجھنے کیلئے رسول اللہ ﷺ کے بیان اور آپ کی تعلیم کے محتاج تھے، تو بعد کے لوگ تو بدرجہ اولیٰ، اس بیان اور تعلیم کی طرف محتاج ہوں گے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ ﴿الجمعہ:۲،۳﴾

وہ ذات جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک بہت بڑا رسول بھیجا جوان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انکا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور بعد کے لوگوں کو جو ابھی پہلوں کے ساتھ لاحق نہیں ہوئے۔

قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی جو تعلیم دی، وہ صحابہ کیلئے بھی ہے اور بعد کے لوگوں کیلئے بھی۔ پس ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا قرآن کریم کی تعلیم دینا اور آیات کے معانی بیان کرنا، جس طرح صحابہ کیلئے تھا، اسی طرح قیامت تک کے مسلمانوں کیلئے بھی ہے اور اگر احادیث کو معتبر نہ مانا جائے، تو بعد کے لوگوں کیلئے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اور تزکیہ کا کس طرح ثبوت ہوگا اور اس آیت کا صدق کیسے ظاہر ہوگا۔

آپ ہی سوچئے اگر رسول اللہ ﷺ نہ بتلاتے تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ لفظ 'صلوٰۃ' سے قیام، رکوع اور سجود کی یہ ہیئت مخصوصہ مراد ہے۔ مؤذن کی آذان سے لے کر امام کے سلام پھیرنے تک نماز اور جماعت کی تفصیل ہمیں کیونکر معلوم ہوتی۔ اسی طرح حج اور عمرہ کا بیان، احرام کہاں سے اور کس دن سے باندھنا ہے، وقوفِ عرفہ، طوافِ زیارت، طواف وداع اور ان تمام احکام کی تفصیل اور تعیین قرآن میں نہیں ملتی۔ حد یہ ہے کہ قرآن میں یہ بھی مذکور نہیں کہ حج کس دن ادا کیا جائے۔ زکوٰۃ کا صرف لفظ قرآن میں مذکور ہے لیکن عشر اور زکوٰۃ کی کسی تفصیل کا قرآن میں بیان نہیں۔ پھر ان کی شرعی ہیئت کذائی جس سے فرائض، واجبات اور آداب کی تمیز ہو، قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔

قرآن مجید کے بیان کردہ ان تمام احکام کی تفصیل اور تعیین صرف رسول اللہ ﷺ کے بیان سے ملتی ہے۔ عہد رسالت میں صحابہ کو یہ بیان زبانِ رسالت سے حاصل ہوا اور بعد کے لوگوں کو یہی بیان احادیث نبویہ سے حاصل ہوگا اور جو شخص ان احادیث کو معتبر نہیں مانتا، اسکے پاس قرآن کریم کے مجمل اور مبہم احکام کی تفصیل اور تعیین جاننے کیلئے کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح معانی قرآن کے مبین اور معلم ہیں، اسی طرح آپ بعض احکام کے شارح بھی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آپ کی اس حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴿سورۃ الاعراف: ۱۵۷﴾

رسول اللہ ان کیلئے پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جن چیزوں کو حلال اور حرام کیا، قرآن میں کہیں انکا ذکر نہیں ہے۔ انکا ذکر صرف احادیث رسول سے ہی ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شکار کرنے والے درندوں اور پرندوں کو

حرام کیا، دراز گوش اور حشرات الارض کو حرام کیا اور ہمارے لئے ان احکام کا علم صرف احادیث رسول سے ہی ممکن ہے اور اگر احادیث رسول کو حجت نہ مانا جائے، تو حلت وحرمت کے تمام احکام کیلئے شریعت اسلامیہ متکفل نہیں ہوگی۔

قرآن کریم کے نفس مضمون کو سمجھنے کیلئے بھی ہمیں احادیث کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ قرآن کریم کی بعض آیات کا نزول کسی خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کسی خاص سوال کے سبب سے کوئی آیت نازل ہوتی ہے اور بعض دفعہ مشرکین یا منافقین کی کسی بات کے رد میں کوئی آیت نازل ہوتی ہے، کبھی کسی آیت میں عہد رسالت میں ہونے والے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور کبھی صحابہ کے کسی عمل پر تنبیہ یا اسکی تائید میں کوئی آیت نازل ہوتی ہے۔ لہٰذا جب تک اس قسم کی تمام آیات کے پس منظر اور اسبابِ نزول کا علم نہ ہو ان کا کوئی واضح معنی سمجھ میں نہیں آتا اور اگر فہم قرآن کیلئے احادیث نبویہ کو ایک معتبر ماخذ اور حجت نہ مانا جائے، تو قرآن مجید کی بعض آیات ایک چیستاں اور معمہ بن کر رہ جائیں گی۔ ﴿شرح صحیح مسلم: جلد اول، صفحہ ۲۷، ۳۷، ۴۷﴾

جو حضرات بظاہر ’کلام اللہ‘ کو ماننے کا اقرار اور درحقیقت ’کلام رسول اللہ‘ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، دراصل وہ کلام اللہ (قرآن مجید) کو بھی نہیں مانتے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے کسی کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ’فتاویٰ رضویہ‘ میں لکھا ہے:

منکر بتائے کہ پانچ نمازوں کا ثبوت کلام اللہ شریف سے کہاں ہے اور صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، باقی کی چار چار، انکا ذکر کلام اللہ شریف میں کہاں ہے اور نمازوں کی ترتیب کہ پہلے قیام اور اس میں قرأت، پھر رکوع، پھر سجود، پھر قعود قرآن مجید میں کہاں ہے۔ وقتوں کی ابتدا وانتہا کہ فجر کا وقت، طلوعِ صبح سے شروع ہو کر طلوع شمس پر ختم ہوتا ہے اور ظہر کا زوال شمس سے سایہ اصلی کے سوا ایک مثل یا دو مثل سایہ ہونے تک، اسکا ذکر قرآن مجید میں کہاں ہے۔ وضو کی ناقض یہ یہ چیزیں ہیں اور غسل کی یہ یہ اور نماز ان ان چیزوں سے فاسد ہوتی ہے، انکی تفصیل قرآن مجید میں کہاں ہے۔ جب وہ ان سوالوں سے عاجز ہوگا اور اپنے کفر وجہل کا اقرار کر کے تائب ہوگا، اس وقت ہم اسے بتادینگے کہ جن چیزوں کا وہ منکر ہے وہ سب قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتائے کہ اس نے اس قرآن موجود کو بے کم وبیش قرآن مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہِ کیونکر مانا۔ کیا اللہ تعالیٰ خود اسکے ہاتھ میں قرآن مجید دے گیا۔ اور جب یہ نہیں تو دلیل دے اور سمجھ رکھے کہ اس دلیل سے جو کچھ ثابت ہوگا سب ماننا پڑے گا ورنہ قرآن بھی ہاتھ سے کھوئے گا۔ کھویا تو ہے ہی، جھوٹے زبانی اقرار سے بھی ہاتھ دھوئے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ یہ مسائل جن کا ثبوت ہم نے قرآن عظیم سے دینا اسکے ذمہ لازم کیا ہے، اس طرح لکھے جس طرح ہم مسلمانوں میں ہے۔

اسکے نزدیک اگراور طور پر ہوں، تو جس طرح اسکے اعتقاد میں ہیں انھیں کا ثبوت قرآن مجید سے دے کہ نماز ہر روز کتنے وقت کی فرض ہے؟۔۔۔ ہر وقت کی ابتداء انتہا کیا ہے؟۔۔۔ نماز میں کیا کیا فرائض ہیں؟۔۔۔ انکی ترتیب اور پڑھنے کی ترکیب کیا ہے؟۔۔۔ وضو وغسل کی ناقض کیا کیا ہیں؟۔۔۔ ہر وقت کی نماز میں کتنی رکعتیں ہیں؟۔۔۔ کس کس چیز سے نماز فاسد ہوتی ہے؟۔۔۔ ﴿جلد ۶، صفحہ ۴۷﴾

خط کشیدہ عبارت کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے مگر یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے؟۔۔۔

اظہر من الشمس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو لکھی لکھائی جلد بندھی کتاب کی صورت میں منکرین حدیث کے ہاتھوں میں تو نہیں دیا بلکہ کتاب اللہ کی معرفت۔۔۔۔ نیز۔۔۔ اسکو لانے والے مقرب فرشتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی معرفت، قول رسول مقبول پر موقوف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ: مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی، مجھ پر یہ سورت نازل ہوئی اور اس کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سن کر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے جانا اور مانا کہ یہ قرآن مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ ہے اور جس کے متعلق یہ نہیں فرمایا وہ احادیث ہوئیں۔ یعنی ایک منہ مبارک سے دو قسم کی باتیں نکلیں مگر منکرین حدیث کے نزدیک ایک قسم مقبول و حجت اور دوسری غیر مقبول اور غیر حجت۔

اب کوئی ان سے پوچھے کہ یہ کیونکر درست ہوگا۔ حالانکہ ایک قسم کو غیر مقبول اور غیر حجت قرار دینے کا مطلب، دوسری کو بھی غیر مقبول اور غیر حجت قرار دینا ہوگا۔ غرضیکہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مقبول اور غیر حجت ماننے کے بعد قرآن مجید کا غیر مقبول اور غیر حجت ہونا لازم آئے گا اور یہ باطل ہے۔ پس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقبول و حجت ہونا ثابت ہوا۔

۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ تقریباً تیئس ۲۳ سال کے عرصہ میں نبی مکرم، رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کا نزول مکمل ہوا، مگر اسکے باوجود ہر نزول پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کو اسکے قرآن مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہِ ہونے کا علم اس وقت ہوتا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اسکی خبر دیتے اور یہ خبر کلام رسول ہے اور مخبر منہ، قرآن مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہِ ۔ سو اگر کلام رسول حجت نہیں ہوگا، تو اس سے قرآن مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہِ کا حجت نہ ہونا لازم آئے گا، اور یہ باطل ہے۔۔ لہٰذا۔۔ کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حجت ہونا ثابت ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مطلقاً جو شخص حدیث رسول کا منکر ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہے اور جو

رسول مکرم ﷺ کا منکر ہے وہ قرآن مجید کا منکر ہے اور جو قرآن مجید کا منکر ہے وہ اللہ واحد قہار کا منکر ہے اور جو اللہ کا منکر وہ صریح مرتد کافر ہے۔

كَماذَكَرَهُ الْإِمَامُ اَحْمَدُ رَضَا خَانُ عَلَيْهِ رَحْمَةُ الرَّحْمٰنِ۔

ـــ ـ ﴿ خاتمہ ﴾ ـ ـــ

آخر میں برادران اسلام کیلئے حجیت حدیث سے متعلق چند احادیث مبارکہ قلمبند کی جارہی ہیں، ملاحظہ ہو:

ا۔۔۔حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'میں تم میں سے کسی کو مسہری پر تکیہ لگائے ہوئے نہ پاؤں کہ اسکے پاس میرے احکام میں سے جسکا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے منع کیا، کوئی حکم پہنچے تو وہ کہہ دے کہ ہم نہیں جانتے، ہم جو کتاب اللہ (قرآن مجید) میں پائیں گے اسکی پیروی کریں گے۔'

﴿رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والبیہقی فی دلائل النبوۃ، مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ ۲۹﴾

۲۔۔۔حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

آگاہ ہو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسکے ساتھ اسکا مثل بھی۔ خبردار! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا اپنی مسہری پر (بیٹھا ہوا) کہے کہ صرف قرآن کو تھام لو۔ اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال جانو اور جو حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ رسول اللہ (ﷺ) کا حرام کیا ہوا ایسا ہی حرام ہے جیسا اللہ تعالیٰ کا حرام فرمایا ہوا۔۔۔۔الخ۔

﴿رواہ ابوداؤد وروی الدارمی نحوہ وکذا ابن ماجۃ الی قولہ: کما حرم اللہ، مشکوٰۃ المصابیح: صفحہ ۲۹﴾

۳۔۔۔حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے قیام فرما کر ارشاد فرمایا:

کیا تم میں سے کوئی اپنے چھپر کھٹ (امیروں کا چھتری والا پلنگ) پر تکیہ لگائے ہوئے یہ گمان کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بجز ان چیزوں کے کوئی چیز حرام نہیں کی جو اس قرآن میں ہیں۔۔۔خبردار! اللہ کی قسم، میں نے احکام دیئے، وعظ فرمائے اور بہت سی چیزوں سے منع کیا، جو قرآن کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہیں۔۔۔الخ۔

﴿رواہ ابوداؤد وفی اسنادہ اشعث بن شعبۃ المصیصی قد تکلم فیہ، مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ ۲۹﴾

فائدہ۔۔۔مذکورہ بالا تینوں احادیث میں منکرین حدیث کا صراحتاً رد مذکور ہے۔

۴۔۔۔۔حضرت مالک بن انس سے مرسل روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
'میں نے تم میں دو۲ چیزیں وہ چھوڑی ہیں جب تک تم انہیں مضبوط تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے: ﴿۱﴾۔۔۔اللہ کی کتاب اور ﴿۲﴾۔۔۔اس کے رسول کی سنت'۔
﴿رواہ فی المؤطا، مشکوۃ المصابیح، صفحہ ۳۱﴾

۵۔۔۔۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:
حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
اے لوگو! بلاشبہ میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، یعنی کتاب اللہ (قرآن) اور اسکے نبی ﷺ کی سنت۔
﴿المستدرك علی الصحیحین للحاکم: جلد اول، صفحہ ۹۳﴾

۶۔۔۔۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
'بلاشبہ میں نے تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑی ہیں جنکے ہونے کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے: ﴿ایک﴾۔۔۔اللہ کی کتاب اور ﴿دوسری﴾۔۔۔میری سنت۔ اور یہ دونوں ہرگز متفرق نہیں ہوں گی یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر آئیں'۔
﴿المستدرك علی الصحیحین للحاکم: جلد اول، صفحہ ۹۳﴾

فائدہ۔۔۔۔روز روشن سے زیادہ واضح ہے کہ جس چیز کو اپنانے پر گمراہی سے حفاظت کا حصول اور چھوڑنے پر گمراہی میں دخول ہو، اسکی اہمیت اور قدر و منزلت ہر عاقل کے نزدیک ضرور معقول و مقبول اور جو اسکا کسی بھی طور پر منکر ہو، تو اسکا انکار مردود و مطرود اور قولِ انکار مجہول اور اہل عقول کے نزدیک وہ عقل سے عاری و خالی یا اسے حقیقت سے ذہول بلا تمثیل جاننا چاہیئے کہ بے شک، لاریب کتاب اللہ اصل شریعت و ماخذ شریعت ہے، اسکے قانون شریعت ہونے میں کسی کو انکار کی مجال نہیں، اسکا تَمَسُّكُ گمراہی سے بچنے کا ذریعہ اور اس کا ترک، گمراہی میں پڑنے کا باعث اور اس امر میں صاحب القرآن، حبیب الرحمٰن، رسول معظم، نبی مکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اپنی سنت کو بھی رکھا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث کریمہ سے ظاہر و باہر ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں یوم آخر تک تفریق نہ ہونے کا بیان فرما دیا۔ لہٰذا آپ ﷺ کی حیات ظاہریہ و دنیویہ کے بعد تا قیام قیامت آنے والے ادوار میں سے کسی بھی دور میں، ان دونوں میں تفریق و جدائی قابل تسلیم نہ ہو گی۔

اظہر من الشمس ہوا کہ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامنا، جس طرح پہلے گمراہی سے بچنے کا ذریعہ تھا، اب بھی ہے اور تا قیامت رہے گا اور جو ان دونوں میں تفریق و جدائی کرنے کا نظریہ لئے ہوئے

ہیں اور اس نظریہ باطلہ وعاطلہ کی تبلیغ کے درپے ہیں، درحقیقت وہ گمراہی سے بچنے کا ذریعہ چھوڑ کر گمراہی میں اوندھے پڑے ہیں اور وہی منکرین حدیث ہیں۔۔۔امت مسلمہ تو ابتداء سے اس نظریہ وعقیدہ پر قائم ہے کہ جسطرح کتاب اللہ، اصل شریعت، ماخذ شریعت اور قانون شریعت ہے، اسی طرح سنت رسول اللہ بھی اصل شریعت، ماخذ شریعت اور قانون شریعت ہے اور جب ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو کتاب اللہ کی طرح سنت رسول اللہ بھی تا قیام قیامت حجت شرعیہ ہے۔

۷۔۔۔۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنالے'

﴿رواہ البخاری کذا فی مشکوٰۃ المصابیح:صفحہ۳۲﴾

فائدہ۔۔۔ ذکر کردہ حدیث شریف میں اس پر دلالت ہے کہ نبی مکرم نور مجسم ﷺ کے اقوال وافعال اور احوال محض قاصد کی مثل نہیں بلکہ آپ نبوت ورسالت کے ساتھ 'مطاع ومتبع' ہیں۔۔۔قرآن مجید میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔۔۔ ﴿سورۃ النساء:۵۹﴾

'اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا'

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴿سورۃ النساء:۸۰﴾

'جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا'

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔۔۔ ﴿سورۃ اٰل عمران:۳۱﴾

'اے محبوب! تم فرمادو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو، تو میرے فرمانبردار ہوجاؤ'

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔۔۔ ﴿سورۃ الاحزاب:۲۱﴾

'بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے'

۔۔۔۔آپ 'معلم ومزکی' ہیں۔۔۔۔قرآن مجید میں ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴿سورۃ اٰل عمران:۱۶۴﴾

'بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اسکی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے'

۔۔۔۔آپ 'حاکم وقاضی' ہیں۔۔۔۔قرآن مجید میں ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿سورۃ النساء:۶۵﴾

'تو اے محبوب! تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں، پھر جو کچھ تم حکم فرمادو اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں'

۔۔۔۔آپ 'شارح وشارع' ہیں۔۔۔۔قرآن مجید میں ہے:

وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔۔۔ ﴿سورۃ النحل:۴۴﴾

'اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن مجید) نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کو بیان کردیں کہ ان کی طرف کیا احکام نازل کئے گئے ہیں'

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔۔۔

'وہ انہیں بھلائی کا حکم دے گا اور برائی سے منع فرمائے گا ﴿سورۃ الاعراف:۱۵۷﴾
اور ستھری چیزیں ان کیلئے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا'

وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ﴿سورۃ الحشر:۷﴾

'اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو'

نبی کریم ﷺ کے ذکر کردہ مناصب جلیلہ سے متعلق اگرچہ متعدد آیات قرآنیہ ہیں مگر اختصار کے پیش نظر چند آیات لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

حدیث رسول کو حجت شرعیہ ماننے اور نہ ماننے والوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ منکرین حدیث آپ ﷺ کو محض مطاع، حاکم اور معلم وغیرہا مانتے ہیں، مامور من اللہ تعالٰی کی لازمی صفت کے ساتھ ذکر کردہ مناصب جلیلہ کو تسلیم نہیں کرتے، جبکہ حدیث رسول کو حجت شرعیہ ماننے والی امت مسلمہ ابتداء ہی سے اسی عقیدۂ مسلمہ پر قائم ودائم ہے، کہ آپ ﷺ کو ان مناصب جلیلہ پر کسی خاص یا عام گروہ، قبیلہ یا قوم نے فائز نہیں کیا، بلکہ قادر مطلق اللہ سبحانہ وتعالٰی نے آپ کو یہ مناصب جو آپ کی شان کے لائق ہیں، تفویض فرمائے۔

بہرحال آپ پر جھوٹ باندھنا دراصل جھوٹی حدیث گھڑنا ہے اور اس پر جہنم کی وعید ہے۔ پس یہ خود اس پر دلیل ہے کہ حدیث رسول، حجت شرعیہ ہے۔

اظہر من الشمس ہے کہ کھری وکھوٹی، اصلی وجعلی کرنسی ہرگز برابر نہیں، بلکہ ان دونوں کی حیثیت

اور قدر و منزلت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کیونکہ کھری اور اصلی کرنسی کی ویلیو اور قدر ہے، جبکہ کھوٹی اور جعلی کرنسی کی کوئی ویلیو اور قدر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دھوکے باز کھوٹی اور جعلی کرنسی چھاپ کر اسے کھری اور اصلی کرنسی کی جگہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں، صرف اسلئے کہ وہ بھی بخوبی جانتے ہیں، کہ اصل ویلیو اور قدر کھری اور اصلی کرنسی کی ہے۔ اگر اسکی کوئی ویلیو اور قدر نہ ہو، تو جعلی اور کھوٹی کرنسی چھاپ کر، اپنے سر خطرہ مول لیکر، اسے دھوکے سے اصلی اور کھری کرنسی کی جگہ چلانے کی کیا ضرورت وحاجت۔ بلا تشبیہ حدیث رسول کی قدر و حیثیت ہے ---نیز--- وہ حجت شرعیہ ہے، جبھی تو دین متین میں فتنہ ڈالنے والوں نے جھوٹی حدیثیں گھڑیں۔ اگر حدیث رسول کی کوئی قدر و حیثیت نہ ہوتی ----نیز---- وہ حجت شرعیہ نہ ہوتی، تو ان فتنہ پروروں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی چنداں ضرورت وحاجت نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث رسول، حجت شرعیہ ہے۔ مگر منکرین حدیث کی عجیب حالت ہے بلکہ انکی مت ماری گئی ہے کہ انھوں نے احادیث موضوعہ (گھڑی ہوئی حدیثوں) کے پیش نظر احادیث رسول کبریاء کی حجیت ہی کا انکار کر دیا۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ حدیث گھڑنا، گناہ کبیرہ، بلکہ کفر بھی ہوتا ہے۔ مگر فتنہ پردازوں کا حدیثوں کو گھڑنا واضح کر رہا ہے کہ حدیث رسول، حجت شرعیہ ہے۔ کَمَا مَرَّ اٰنِفاً ---نیز--- جس طرح کرنسی کے ماہرین پہلی ہی نظر میں جانچ لیتے ہیں کہ یہ کرنسی اصلی اور یہ جعلی ہے، اسی طرح علم حدیث واسماء الرجال کے ماہرین پرکھ لیتے ہیں کہ کونسی حدیث، موضوع (گھڑی ہوئی) ہے اور کونسی موضوع (گھڑی ہوئی) نہیں ہے۔ جبھی تو منکرین حدیث کو بھی پتہ چلا، کہ ذخیرہ احادیث میں یہ یہ گھڑی ہوئی حدیثیں ہیں۔

علاوہ ازیں جب جعلی کرنسی کا پتہ چل جانے پر کوئی بھی اصلی کرنسی کی حیثیت اور قدر و قیمت کا انکار نہیں کرتا ہے، تو گھڑی ہوئی حدیثوں کے معلوم ہو جانے پر حدیث رسول ﷺ کی قدر و منزلت اور حیثیت و حجیت کا بھلا کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے؟ ---اگر نہیں کیا جا سکتا ہے اور یقیناً واذعاناً نہیں کیا جا سکتا ہے، تو معلوم ہوا کہ حدیث رسول حجت شرعیہ ہے --- وَهُوَ الْمَقْصُودُ وَالْمَطْلُوبُ۔

طالب دعا
محمد الیاس رضوی اشرفی
جامعہ نضرۃ العلوم، گارڈن ویسٹ
کراچی، پاکستان

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

ہر مسلمان اس بات کو بہ خوبی جانتا ہے کہ دین کے اصول وفروع اور اعتقادات واعمال کی بنیاد قرآن واحادیث ہیں۔اجماع امت اور قیاس مجتہدین کی جو بھی حیثیت ہے، وہ کتاب اللہ اور احادیث کی بارگاہ سے سند ملنے کے بعد ہی ہے۔۔۔۔نیز یہ کہ۔۔۔قرآن واحادیث واجب العمل ہونے میں مساویانہ درجہ رکھتے ہیں۔کیونکہ احادیث سے انکار کے بعد،قرآن پر ایمان وعمل کا دعویٰ، باطل محض ہوکر رہ جاتا ہے، اسلئے کہ ہماری دینی اور دنیاوی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل ہیں جو قرآن کریم میں صریحاً مذکور نہیں،صرف زبانِ رسالت مآب ﷺ سے سماعت کئے گئے ہیں اور امت نے اسے بھی قرآن کی طرح واجب العمل جان لیا ہے۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔اذان قرآن پاک میں کہیں مذکور نہیں کہ پنج وقتی نمازوں کیلئے آپ اذان دیں،مگر اذان عہد رسالت مآب ﷺ سے لے کر آج تک شعارِ اسلام رہی ہے اور رہے گی۔

﴿۲﴾۔۔۔نمازِ جنازہ کے بارے میں قرآن میں کوئی حکم نہیں،مگر یہ بھی فرض ہے، جسکی بنیاد ارشادِ رسول ﷺ ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم کہیں قرآن میں نہیں،مگر تحویل قبلہ سے پہلے یہی نماز کا قبلہ تھا۔اور یہ بھی ارشادِ رسول ﷺ ہی سے تھا۔

﴿۴﴾۔۔۔جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا حکم قرآن میں کہیں نہیں،مگر یہ بھی عبادت ہے۔اور اسکی بنیاد بھی صرف ارشادِ رسول ﷺ ہی ہے اور اس شان کے ساتھ ہے، کہ اگر اس میں کوئی کوتاہی ہوئی،تو کوتاہی کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ:

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ ﴿سورۃ الجمعۃ:۱۱﴾

۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔اور جب دیکھ پایا انھوں نے کسی تجارت یا تماشہ کو، تو چل دیئے ادھر،
اور چھوڑ دیا تمہیں خطبہ میں کھڑا۔ کہہ دو کہ جو اللہ کے پاس ہے بہتر ہے، تماشہ
اور تجارت سے۔ اور اللہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔یہ صرف اسی بنا پر ہے کہ قرآن کی طرح ارشادِ رسول ﷺ بھی واجب العمل والاعتقاد ہے۔ اس میں بھی کوتاہی کی وہی سزا ہے جو قرآن کے فرمودات میں کوتاہی کی ہے۔

۔۔۔۔نیز۔۔۔۔یہ امور بھی قابل غور ہیں کہ، قرآن خدا کی کتاب ہے، جو واجب القبول اور لازم العمل ہے۔ لیکن یہ ہمیں معلوم کیسے ہوا؟۔۔۔۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آسمان سے لکھی لکھائی، مجلد کتاب تو نازل نہیں فرمائی؟۔۔۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسی کتاب جو لکھی لکھائی، مجلد اتار بھی دی جاتی، تو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ یہ خدا ہی کی کتاب ہے؟۔۔۔۔کہیں سے بھی اڑ کر آسکتی ہے۔۔۔۔کوئی فریب کار کسی خفیہ طریقہ سے کہیں پہنچا سکتا ہے۔ اگر جبرائیل علیہ السلام یا کوئی اور فرشتہ لے کر آتا، تو یہ کیسے پہچانتے کہ یہ جبرائیل یا کوئی اور فرشتہ ہے؟۔۔۔ کوئی جن یا کوئی شعبدہ باز، یہ کہہ سکتا ہے کہ میں جبرائیل ہوں اور یہ خدا کی کتاب لایا ہوں۔۔۔۔غرضیکہ فرامین رسول ﷺ سے انکار کے بعد، قرآن کے کتاب اللہ ہونے پر کوئی یقینی و قطعی دلیل نہیں رہ جاتی۔

ساری دلیلوں کا ماحصل یہ ہے، کہ رسول ﷺ نے فرمایا، یہ خدا کی کتاب ہے، یہ جبرائیل ہیں، یہ آیۃ لیکر آئے ہیں۔ خیال رہے کہ کتاب اللہ کی معرفت اور کتاب اللہ لیکر آنے والے ملک مقرب، جبرائیل کی معرفت بھی قولِ رسول ﷺ ہی پر موقوف ہے۔ اسلئے اگر خدانخواستہ، قولِ رسول ﷺ ہی ناقابل قبول ہو جائے، تو کتاب اللہ کا کوئی وزن نہیں رہ جاتا۔ اسلئے کہ رسول ﷺ نے لاکھوں باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں مثلاً یہ فرمایا: مجھ پر قرآن نازل ہوا، مجھ پر یہ آیت اتری یا یہ سورۃ اتری اور مخاطبین اولین میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی انکو کتاب اللہ ہی جانا اور مانا۔۔۔۔نیز۔۔۔ یہ کہ رسول ﷺ نے اپنے جن ارشادات کے بارے میں وضاحت فرمادی وہ احادیث کہلائیں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ ایک ہی زبانِ پاک سے دوطرح کی باتوں میں سے ایک کو قبول اور دوسرے کو ترک کر دینا، کس منطق سے درست ہوگا؟ دوسری قسم کو چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہوا، کہ پہلی قسم بھی چھوٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ حدیث کے ناقابل قبول ماننے سے قرآن کا ناقابل قبول ہونا لازم آتا ہے۔

علاوہ ازیں، قرآن کریم یقیناً، **تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ**، ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر ان میں سے کئی ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے لئے بالکل مجمل اور مبہم ہیں۔۔۔۔مثلاً: عبادات میں سے نماز، روزہ،

حج وزکوٰۃ وغیرہ کو لے لیجئے، قرآن کریم میں ان سب کا حکم ہے۔ مگر کیا قرآن سے ان عبادات کی پوری تفصیل بتا سکتے ہو؟۔۔۔ اگر احادیث کو نا قابل اعتبار مان لیا جائے، تو پھر ان عبادات پر عمل کیسے ہو گا؟ کیونکہ ان تمام عبادات کی تفصیل احادیث ہی سے معلوم ہوئی ہے۔ فرمان رسول ﷺ ہے:

صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ ﴿متفق علیہ﴾

اس طرح نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔

۔۔۔۔عبادات کے علاوہ قرآن کریم کی درجنوں آیات ایسی ہیں کہ اگر احادیث انکی وضاحت نہ کریں تو وہ آیات لاینحل رہ جائیں۔۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ﴿سورۃ التوبۃ:۲۵﴾

بیشک، ضرور مدد فرمائی تمہاری اللہ نے، بہتیری جگہوں میں ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔ یہ جگہیں کون کون سی ہیں؟ صرف قرآن سے بتاؤ؟

﴿۲﴾ وَّعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا۔۔۔ ﴿سورۃ التوبۃ:۱۱۸﴾

اور ان تین نفر کی بھی توبہ قبول کی، جو پچھڑ گئے تھے۔۔۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔ یہ تینوں کون تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ انکا معاملہ معرض التواء میں کیوں ڈالا گیا تھا؟ بغیر احادیث کی دستگیری کے انکی وضاحت کریں؟

﴿۳﴾ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ ﴿سورۃ التوبۃ:۱۰۸﴾

ضرور وہ مسجد جسکی بنیاد رکھی گئی ہے خوف خدا پر پہلے ہی دن سے، زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے مرد لوگ ہیں، جو پسند کرتے ہیں کہ خوب پاک صاف رہیں۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔ یہ کون سی مسجد ہے؟۔۔کون سے لوگ ہیں؟۔۔احادیث سے صرفِ نظر کر کے بتائیں؟

﴿۴﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ ﴿سورۃ التوبۃ:۴۰﴾

اگر تم لوگ نبی کی مدد نہ کرو گے، تو بے شک انکی مدد اللہ نے کی ہے، جبکہ انکو نکالنے کی سازش کی تھی جنھوں نے کفر کیا تھا، دو جان، جبکہ دونوں غار میں ہیں۔ جب کہتے ہیں اپنے صحابی سے کہ رنج نہ کرنا، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔کافروں نے کیا شرارت کی تھی؟ رسول ﷺ کو کہاں سے باہر تشریف لے جانا پڑا؟ یہ ساتھی کون تھے؟ یہ غار کون سا تھا؟ اور ساتھی کو تسلی وتشفی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔۔۔۔احادیث سے ہٹ کر کوئی بتا سکتا ہے؟۔۔۔۔

یہ مشتے نمونہ ازخروارے ہیں ورنہ قرآن کریم میں اسکی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں، کہ اگر احادیث انکی وضاحت نہ کرتیں، تو معاملات کی پیچیدگی کسی طرح سے دور ہی نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے علمائے حق اہلسنّت وجماعت فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر ایمان کے بعد قولِ رسول ﷺ کے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ قرآن کریم نے ایک دو نہیں، درجنوں مقامات پر رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا، اور وہ بھی اس شان سے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کو، اللہ کی اطاعت قرار دیا۔۔۔ارشاد قرآنی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴿سورۃ النساء:۸۰﴾

جس نے کہا کیا رسول کا اس نے کہا مانا اللہ کا۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔بعثت رسول ﷺ کا مقصد ہی اطاعت قرار دیا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ ﴿سورۃ النساء:۶۴﴾

اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول، مگر تاکہ اسکے کہے پر چلا جائے، اللہ کے حکم سے۔
اور اگر وہ جب ظلم کر بیٹھے اپنی جانوں پر، چلے آئے تمہارے پاس، پھر بخشش مانگی اللہ کی،
اور مغفرت چاہی انکے لئے رسول نے، تو پالیا اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا، بخشنے والا۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔اور کہیں پر کامیابی کا دارومدار ہی اطاعت پر رکھا:

۔۔۔یعنی۔۔۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ ﴿سورۃ الاحزاب:۷۱﴾

اور جو کہا مانے اللہ اور اسکے رسول کا، تو بیشک کامیاب ہوا بڑی کامیابی۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔شان ایمان ظاہر فرماتے ہوئے قرآن کریم نے بتایا کہ:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ ﴿سورۃ النور:۵۱﴾

مسلمانوں کی بات تو بس یہ ہے کہ جب بھی بلائے گئے اللہ اور رسول کی طرف، تا کہ وہ رسول، فیصلہ فرمادیں ان میں، تو عرض کریں، کہ سن لیا اور کہا مان لیا۔ اور وہی کامیاب ہیں۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔جن لوگوں نے فیصلہء نبوی ﷺ کے تسلیم کرنے میں حیل وحجت یا چون وچرا سے کام لیا، انکے لئے ارشاد فرمایا گیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ ﴿سورۃ النساء:۶۵﴾

تو نہیں کیا، تمہارے پروردگار کی قسم، وہ ایمان نہیں لائے یہاں تک کہ اپنا فیصلہ کنندہ مانیں تم کو ہر معاملہ میں، جس میں انکے درمیان جھگڑا ہو۔ پھر نہ پائیں اپنے دلوں میں کھٹک، جو تم نے فیصلہ کردیا، اور جی جان سے مان لیں۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔محبوب ﷺ کی طلب پر فتویٰ قرآنی ملاحظہ ہو:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ ۔۔۔ ﴿سورۃ الانفال:۲۴﴾

اے وہ جو ایمان لا چکے ہو، اپنی حاضری سے جواب دو اللہ اور رسول کا، جب پکار لیں تم کو رسول۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔محبوب ﷺ کی نافرمانی تو دور کی بات ہے، نافرمانی کی سرگوشی پر بھی پابندی لگادی گئی، ملاحظہ ہو:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ ۔۔۔ ﴿سورۃ المجادلہ:۹﴾

اے ایمان والو، جب تم نے سرگوشی کرنی چاہی، تو مت سرگوشی کرو گناہ اور قانون شکنی اور رسول کی گنہ گاری کی۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔اسلئے کہ رسول ﷺ کی نافرمانی، شیوۂ ایمانی نہیں، بلکہ طریقہء منافقین ہے، ارشاد ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلٰى مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ ﴿سورۃ النساء:۶۱﴾

اور جب انکو کہا گیا کہ آؤ، جسے اللہ نے اتارا اسکی اور رسول کی طرف، تو تم نے دیکھا منافق لوگوں کو، کہ رخ پھیرتے ہیں تم سے، بے رخی سے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔دار آخرت میں اہل جہنم بصد حسرت ویاس کہیں گے:

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾
﴿سورۃ الاحزاب:٦٦﴾

جس دن الٹے جائیں گے انکے چہرے جہنم میں، کہیں گے اے کاش،

ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا، اور کہا مانا ہوتا رسول کا۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد، ایمان والوں سے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار، اللہ عزوجل نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سلب فرمالیا۔ اب سر تسلیم خم کرنے کے سوا، انکے لئے چارۂ کار ہی نہیں، ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿٣٦﴾ ﴿سورۃ الاحزاب:٣٦﴾

اور نہیں ہے کسی مومن یا مومنہ کو حق، جبکہ حکم دے دیا اللہ اور اسکے رسول نے کسی امر کا

کہ رہ جائے انہیں کچھ بھی اختیار، اپنے معاملہ کا۔ اور جو نافرمانی کرے اللہ

اور اسکے رسول کی، تو بیشک بہک گیا علانیہ۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں پر وعید عذاب سنایا گیا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾ ﴿سورۃ النساء:١١٥﴾

اور جو مخالفت کرے رسول کی، اسکے بعد کہ اس پر ٹھیک راہ روشن ہو چکی،

اور چل پڑے رواج و دستور اہل ایمان کے خلاف، تو ہم رہنے دیں گے جیسے رہے،

اور ڈال دیں گے اسکو جہنم میں۔ اور وہ پلٹاؤ کی بری جگہ ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔ایک دوسرے مقام پر حکم خداوندی ملاحظہ فرمائیں:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾
﴿سورۃ النور:٦٣﴾

تو ڈرتے ہی رہیں جو مخالفت کریں حکم رسول سے، کہ پہنچا چاہتا ہے

ان تک کوئی فتنہ۔ اور پہنچ کے رہے گا انہیں دکھ والا عذاب۔ ﴿معارف القرآن﴾

ارشادات قرآنیہ پر بار بار غور فرمائیں اور دیکھیں، ہر ہر مقام پر کس طرح سے اللہ کی اطاعت

کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا، اور اللہ عزوجل کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ کی نافرمانی پر کس طرح عذاب کی وعید سنائی۔۔۔رسول ﷺ کے بلانے کو خدا نے اپنا بلانا قرار دیا۔۔۔نافرمانیٔ رسول پر سرگوشی کی بھی ممانعت کردی گئی۔۔۔رسول ﷺ کے فیصلہ کو واجب التسلیم قرار دے دیا گیا، اور وہ بھی اس حد تک کہ جو رسول کے فیصلہ کو نہ مانیں اور اس میں ذرا بھی تردد کریں، وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہیں۔۔۔احکام رسول ﷺ سے روگردانی کرنے والے کو منافق فرمایا۔۔۔رسول ﷺ کے حکم کو اس درجہ واجب الاتباع قرار دیا کہ، رسول کے حکم کے بعد، نہ ماننے کا حق کسی مومن کو نہیں۔اور جو نہ مانے اسکے لئے جہنم کی وعید سنائی۔۔۔وغیرہ، وغیرہ۔۔۔یہ تمام باتیں کیا اس بات کی دلیل نہیں، کہ جس طرح اللہ عزوجل کا ہر ارشاد واجب التسلیم ہے، اسی طرح رسول کا فرمان بھی واجب الاعتقاد والعمل ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ احکام خدا اور رسول میں تفریق کرنے والوں کے تعلق سے صریحاً قرآنِ کریم نے فیصلہ سنایا کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّفَرِّقُوۡا بَیۡنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یَقُوۡلُوۡنَ نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّ نَکۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ وَّ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ حَقًّا ۚ ﴿سورۃ النساء:۱۵۰-۱۵۱﴾

بے شک جو انکار کریں اللہ اور اسکے رسولوں کا، اور چاہیں کہ ماننے میں امتیاز رکھیں اللہ اور اسکے رسولوں میں، اور کہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کا انکار کریں گے۔

اور چاہیں کہ بنالیں درمیانی راستہ، وہی یقیناً کافر ہیں۔ ﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لیکر آج تک امت بلا نکیر منکر، قرآن کی طرح، احادیث کو بھی واجب العمل مانتی چلی آئی ہے۔البتہ اس زمانہ میں بعض کلمہ گوئی کا دعویٰ کرنے والے ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو احادیث کو نا قابل قبول ہی نہیں، نا قابل اعتبار بھی مانتے ہیں۔ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو سراسر اقوال رسول ﷺ کے منکر ہیں۔اور دوسرے اپنے اعتقاد کو جھوٹی تسلی دینے کیلئے ایک تاویل غلط کا سہارا لے کر یوں گویا ہیں کہ:

قول رسول ﷺ ضرور حجت ہے، مگر موجودہ احادیث کا جو ذخیرہ ہمارے درمیان نظر آرہا ہے، وہ رسول ﷺ کے اقوال و اعمال کا مجموعہ نہیں، یہ عجمی نومسلموں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ، من مانی باتوں کو رسول ﷺ کی طرف منسوب کردیا ہے، اسلئے قطعاً قابل اعتبار نہیں۔

۔۔۔اپنے اس دعویٰ پر دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ:

آج ذخیرۂ احادیث میں جو دفتر ہمیں ملتے ہیں ان کی تدوین نہ تو عہد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی، اور نہ ہی عہد صحابہ و تابعین میں۔ بلکہ انکی تدوین تقریباً تیسری صدی ہجری میں ہوئی ہے۔

۔۔۔اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اساطین محدثین میں اکثریت عجمی النسل بزرگوں ہی کی ہے۔غور فرمائیں۔۔۔امام بخاری، بخارا کے۔۔۔امام مسلم نیشاپور کے۔۔۔امام ترمذی، ترمذ کے۔۔۔امام ابوداؤد، بجستان کے۔۔۔ابن ماجہ قزوین کے۔۔۔ باشندے تھے۔دنیائے علم حدیث کے یہ وہ مسلم الثبوت بزرگ ہیں، کہ جنکی ہر بات فن حدیث میں حرفِ آخر مانی گئی ہے۔منکرین حدیث کے دعویٰ کی بنیاد اس پر ہے کہ:

دوسری صدی ہجری سے پہلے احادیث نہیں لکھی گئیں، صرف زبانی یادداشتوں پر اعتماد کیا گیا، اور رسول اللہ ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد سے اتنی مدت تک، لاکھوں لاکھ احادیث کا یاد رکھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

۔۔۔اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کتابت احادیث کا کام عہد رسالت مآب ﷺ ہی میں شروع ہو چکا تھا اور ہر دور میں تسلسل کے ساتھ باقی رہا ہے، تو انکے دعویٰ کا کوئی وزن نہیں رہ جاتا۔۔۔اسلئے ہم اپنے قارئین و ناظرین کو چند شواہد پیش کریں گے، اور تاریخ و سیر کے چند مقامات کی سیر کرائیں گے، جس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ کتابت احادیث کا کام عہد رسالت مآب ﷺ سے لیکر، اتباع تبع تابعین تک، ہر دور میں تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہا ہے۔۔ ملاحظہ ہو:

﴿۱﴾۔۔۔ ۸ھ؁ میں حضور اقدس ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر انسانی حقوق اور مکہ مکرمہ کی حرمت کے مسائل بیان فرمائے، جن کو سن کر ایک یمنی بزرگ (ابوشاہ) نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ یہ احکام لکھوا کر عنایت فرمائے جائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا:

اُکْتُبُوْہُ لِاَبِیْ شَاۃَ

یہ احکام ابوشاہ کے لئے لکھ دو ﴿بخاری، ابوداؤد﴾

﴿۲﴾۔۔۔ ابوداؤد صفحہ ۵۱۳،۵۱۴ (مطبوعہ، مطبع ولی محمد اینڈ سنز کراچی) پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت فرماتے ہیں۔۔۔متن حدیث ملاحظہ ہو:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ کُنْتُ اَکْتُبُ کُلَّ شَیْءٍ اَسْمَعُہٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ

اُرِيْدُ حِفْظَهٗ فَنَهَتْنِیْ وَقَالُوْا اَتَكْتُبُ كُلَّ شَیْءٍ تَسْمَعُهٗ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ
بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَاءِ فَاَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابَةِ فَذَكَرْتُ
ذٰلِكَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَوْمَأَ اِلٰی فِيْهِ فَقَالَ اُكْتُبْ فَوَ الَّذِیْ
نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ

﴿۳﴾۔۔۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے تعلق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

مَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ اَحَدٌ اَكْثَرَ حَدِيْثًا مِّنِّیْ اِلَّا مَا كَانَ
مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو فَاِنَّهٗ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ ﴿بخاری، جلد۱، صفحہ۲۲﴾

نبی ﷺ کے اصحاب میں، مجھ سے زیادہ کسی کے پاس رسول اللہ ﷺ کی احادیث محفوظ نہ تھیں،
سوا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے، کیونکہ وہ احادیث لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا،
چنانچہ آپ کے مجموعہ کا نام ’صادقہ‘ تھا۔۔۔

﴿۴﴾۔۔۔امام بخاری اور ابو داؤد کی روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ احادیث رسول ﷺ قلمبند کرلیا کرتے تھے۔ مقدمہ فتح الباری، (جلد۱، صفحہ۲۱۷، مطبوعہ مصر) پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے تعلق سے یہ روایت، اہل علم حضرات کی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ، باوجودیکہ آپ کثیر الروایات ہیں، آپ نے اپنی روایت کردہ احادیث کو لکھ کر محفوظ کرلیا تھا۔ چنانچہ عمرو ابن امیہ بیان کرتے ہیں کہ:

تُحَدِّثُ عِنْدَ اَبِیْ هُرَيْرَةَ بِحَدِيْثٍ فَاَخَذَ بِيَدِیْ اِلٰی بَيْتِهٖ
فَاَرَانَا كُتُبًا مِّنْ حَدِيْثِ النَّبِیِّ ﷺ وَقَالَ هٰذَا هُوَ مَكْتُوْبٌ تَجِدُ عِنْدِیْ

۔۔۔علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ابتداءً زمانۂ رسالت ﷺ میں احادیث نہیں لکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد انھوں نے احادیث کو لکھ لیا۔ اُس زمانہ میں وہ کسی اور سے لکھواتے رہے ہوں گے۔

سیدنا ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی شہادت آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ یہ حضرات عہد رسالت مآب ﷺ ہی میں احادیث کو بہ شکل صحائف محفوظ رکھتے تھے۔۔۔ اب ہم ایک ایسی روایت پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوجائے گا، کہ زمانۂ رسالت مآب ﷺ میں بالعموم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، احادیث کو لکھ کر محفوظ کرلیا کرتے تھے۔۔۔ چنانچہ۔۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں:

كَانَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَاَنَا مَعَهُمْ وَاَنَا اَصْغَرُ الْقَوْمِ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّا مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ فَلَمَّا خَرَجَ الْقَوْمُ قُلْتُ كَيْفَ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ سَمِعْتُمْ مَا قَالَ وَاَنْتُمْ تَنْهَمِكُوْنَ فِی الْحَدِيْثِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَضَحِكُوْا وَقَالُوْا يَا ابْنَ اَخِيْنَا اَنْ كُلَّ مَا سَمِعْنَا مِنْهُ عِنْدَنَا فِیْ كِتَابٍ

﴿مجمع الزوائد، جلد ا، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲﴾

﴿۶﴾۔۔۔احادیث کا ایک مجموعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے لکھ کر رکھا تھا ﴿بخاری، تدریب الراوی﴾

قتادہ روایت کرتے ہیں:

كَانَ يُمْلِی الْحَدِيْثَ حَتّٰی اِذَا كَثُرَ عَلَيْهِ النَّاسُ جَاءَ بِمِحْمَالٍ مِّنْ كُتُبٍ اَلْقَاهَا ثُمَّ قَالَ هٰذِهٖ اَحَادِيْثُ سَمِعْتُهَا وَكَتَبْتُهَا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَعَرَضْتُهَا عَلَيْهِ۔۔۔

۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حدیث لکھوایا کرتے تھے۔ جب لوگوں کی کثرت ہوگئی، تو وہ کتابوں کا صحیفہ لے کر آئے اور لوگوں کے سامنے رکھ کر فرمایا، یہ وہ احادیث ہیں جنہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھی ہیں اور پڑھ کر سنا بھی دی ہیں۔ ﴿تفسیر العلم، صفحہ ۹۶، ۹۵﴾

﴿۷﴾۔۔۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث لکھوائی تھیں۔ یہ ذخیرہ ان کے صاحبزادے کے پاس تھا۔ ﴿جامع بیان العلم﴾

﴿۸﴾۔۔۔حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک کتاب میں احادیث کو جمع فرمایا تھا، جسکا نام ہی سعد بن عبادہ تھا۔ یہ کئی پشتوں تک انکے خاندان میں رہا۔ ﴿مسند امام احمد﴾

﴿۹﴾۔۔۔سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مجموعہ تیار کیا تھا (تہذیب) ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَيْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَكْتُبُ ﴿دارمی: صفحہ ۶۸﴾

۔۔۔'نَحْنُ' اور 'نَكْتُبُ' کے صیغوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس خدمت کو ایک جماعت انجام دیتی تھی۔ اسکی مزید تائید حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی گزشتہ روایت سے بھی ہورہی ہے۔

﴿۱۰﴾۔۔۔'اَلْجَامِعُ لِاَخْلَاقِ الرَّاوِیْ وَآدَابِ السّامِعِ' ﴿صفحہ ۱۰۰﴾ پر ہے کہ:

يُرْوٰی عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ كَانَ اِذَا خَرَجَ اِلَی السُّوْقِ نَظَرَ

فِیْ کُتُبِہٖ وَقَدْ اَکَّدَ الرَّاوِیُ اَنَّ کُتُبَہٗ کَانَتْ فِی الْحَدِیْثِ

----یعنی----

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ جب
وہ بازار جاتے تو اپنی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے۔
راوی نے بہ تاکید یہ بات کہی ہے کہ یہ کتابیں حدیث کی تھیں۔

--------'تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ'--------

----علاوہ ازیں----جستہ جستہ جو احکام وفرامین آپ ﷺ مختلف مواقع پر لکھوا کر لوگوں کو عنایت فرماتے رہے:

﴿۱﴾---رسول اللہ ﷺ نے دیت (خونبہا) کے مسائل لکھوا کر بھجوائے ﴿مسلم، صفحہ ۴۹۵﴾

﴿۲﴾---قبیلہ جہینہ کے پاس مردہ جانوروں کے احکام لکھوا کر بھجوائے ﴿مشکوٰۃ، ابوداؤد﴾

﴿۳﴾---ابوداؤد، روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زکوٰۃ سے متعلق مسائل کو ایک جگہ لکھوایا تھا، جسکا نام، 'کتاب الصدقۃ' تھا، مگر عمال وحکام تک اسے روانہ نہ فرما سکے، اور وصال ہو گیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد حکومت میں اسی کے مطابق زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم جاری کیا اور اسی کے مطابق زکوٰۃ وصول ہوتی تھی۔

﴿۴﴾---اسی 'کتاب الصدقۃ' کا مضمون وہ ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس کو دیا تھا، جس وقت انہیں بحرین کا عامل بنا کر بھیجا تھا۔ اس میں اونٹوں، بکریوں، اور سونے چاندی کی زکوٰۃ کے نصاب کی تفصیل تھی۔ ﴿بخاری جلد۱، صفحہ ۱۹۴﴾

﴿۵﴾---حضور اقدس ﷺ نے اپنی حیات ظاہری کے آخری ایام میں، کثیر احادیث کا ایک صحیفہ لکھوا کر عمرو بن حزم کے بدست یمن بھجوایا تھا۔ 'موطا امام مالک' ﴿صفحہ ۲۳۱﴾ پر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کے پاس ایک مکتوب، عمرو بن حزم کے ہاتھ بھیجا تھا، جس میں فرائض، سنن اور دیات لکھے تھے۔

﴿۶﴾---دار قطنی اور مسند امام احمد میں ہے کہ: احکام زکوٰۃ پر مشتمل ایک صحیفہ ابوبکر بن حزم والیٔ بحرین کو لکھوایا تھا۔ یہ صحیفہ دیگر امراء کو بھی بھیجا گیا تھا۔ یہ مکتوب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابن حزم سے لے لیا تھا۔

﴿۷﴾---زکوٰۃ وصول کرنے والے عاملین کے پاس 'کتاب الصدقۃ' کے علاوہ اور بھی تحریریں تھیں۔ ﴿دار قطنی﴾

﴿۸﴾۔۔۔عمرو بن حزم کو یمن کا حاکم بناتے وقت فرائض، صدقات، دیات، طلاق، عتاق، نماز، مصحف شریف چھونے سے متعلق احکام پر مشتمل ایک تحریر لکھائی تھی۔ ﴿مسند امام احمد، مستدرک، کنز العمال﴾

﴿۹﴾۔۔۔علاوہ ازیں مختلف قبائل کیلئے فرامین واحکام۔۔۔۔نیز۔۔۔۔معاہدات کی تحریریں ۔۔۔مثلاً: صلح حدیبیہ کی تحریرات، قبائل کو بھیجنا، سلاطین وامراء اور سرداران قبائل کو والا نامہ سے سرفراز کرنا۔ ﴿ابن ماجہ، طبقات ابن سعد﴾

﴿۱۰﴾۔۔۔عبداللہ بن حکم کے پاس حضور ﷺ کی ایک تحریر تھی جس میں مردہ جانوروں کے احکام مذکور تھے۔ ﴿معجم صغیر طبرانی﴾

﴿۱۱﴾۔۔۔نماز، روزہ، سود اور شراب وغیرہ کے مسائل، وائل بن حجر کو آپ نے لکھوائے تھے۔

﴿۱۲﴾۔۔۔اشیم نامی مقتول کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت دلانے کا فرمان، رسول اللہ ﷺ نے لکھوایا تھا۔ یہ فرمان ضحاک بن سفیان صحابی کے پاس تھا۔ ﴿ابوداؤد، دارقطنی﴾

﴿۱۳﴾۔۔۔ترکاریوں اور سبزیوں پر زکوۃ نہیں، یہ حکمنامہ لکھوا کر حضرت معاذ بن جبل کے پاس یمن بھجوایا تھا۔ ﴿دارقطنی﴾

﴿۱۴﴾۔۔۔رافع بن خدیج صحابی کے پاس ایک مکتوب گرامی تھا، جس میں مندرج تھا کہ مدینہ بھی مثل مکہ حرم ہے۔ ﴿مسند امام احمد﴾

﴿۱۵﴾۔۔۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ احکام لکھوا کر دیئے تھے جو انکے پاس تھے۔ ﴿بخاری جلد ۱، صفحہ ۲۱﴾

﴿۱۶﴾۔۔۔حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو لکھا کہ تم نے جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، وہ لکھ کر بھیج دو۔۔چنانچہ۔۔انھوں نے کچھ احادیث لکھوا کر بھیجیں۔ ﴿بخاری جلد ۲، صفحہ ۱۰۸۳﴾

۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

بالعموم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خود یہ چاہتے تھے کہ مجموعہء اقوال واعمال رسول اللہ ﷺ، محفوظ کر لیا جائے، تاکہ بعد والی نسلیں ان سے مستفید ہوتی رہیں، چنانچہ:

﴿۱﴾۔۔۔ دارمی ﴿صفحہ ۶۸﴾ اور مستدرک ﴿جلد ۱، صفحہ ۱۰۶﴾ پر ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ، علم لکھ کر مقید کر لو۔

﴿۲﴾۔۔۔ مسلم ﴿جلد ۱، صفحہ ۶۸﴾ پر ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے محمود ابن ربیع سے، حضرت عتبان کی ایک طویل حدیث سنی، تو اپنے صاحبزادے کو حکم دیا کہ اسے لکھ لو۔ صاحبزادے نے لکھ لیا۔ طحاوی ﴿جلد ۲، صفحہ ۳۸۴﴾ پر ہے، کہ حضرت انس نے اپنے لڑکے سے حدیث لکھوائی۔

﴿۳﴾۔۔۔فتح الباری ﴿جلد۱،صفحہ۱۸۴﴾ پر ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی روایت کردہ احادیث کومحفوظ کرلیا تھا۔حسن بن عمرو کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ، میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور احادیث کی متعدد کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو یہ سب میرے یہاں لکھی ہوئی ہیں۔

﴿۴﴾۔۔۔طحاوی ﴿جلد۲،صفحہ۳۸۵﴾ پر ہے بشر بن نہیک، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی کتابیں عاریۃً لے کر نقل کرتے۔ نقل کے بعد انکو سناتے۔ بعد میں آپ سے پوچھتے کہ میں نے جو آپ کو سنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ فرماتے، ہاں!

﴿۵﴾۔۔۔حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں، کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو احادیث سنتا انکو لکھ لیتا۔۔۔نیز۔۔۔دارمی ﴿صفحہ۱۲۹﴾ اور طحاوی ﴿جلد۲،صفحہ۳۸۴﴾ پر آپ اور آپ کے دیگر اصحاب کہتے ہیں کہ، ہم لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ کاغذ بھر جاتا تو کسی اور چیز پر لکھتے۔

﴿۶﴾۔۔۔طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کو خاص طور سے نافع نے جمع کیں۔

﴿۷﴾۔۔۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرویات عروہ بن زبیر نے لکھ لیں۔ ﴿الکفایۃ ۱۲۹﴾

﴿۸﴾۔۔۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی احادیث کو قتادہ بن دعامہ سروسی نے لکھ کر جمع کر لیا تھا۔ ﴿طبقات ابن سعد جلد۷، صفحہ۲۷﴾

﴿۹﴾۔۔۔سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرویات کو انکے تلمیذ کریب نے لکھ کر محفوظ کرلیا تھا، ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ﴿جلد۵،صفحہ۲۱۶﴾ وغیرہ۔

۔۔۔﴿ کتابت حدیث: دورِ تابعین میں ﴾۔۔۔

کتابت احادیث اپنے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی جب دورِ تابعین میں آئی، تو اہل ذوق کے مطابق اسکی ترتیب نہ تھی۔ جن بزرگوں کو جہاں، جیسی، اور جس موضوع کی حدیث ملی، نقل کرتے گئے۔ اور ترتیب کی رعایت کا خیال نہ کیا گیا۔ پروردگارِ عالم اپنی رحمتوں کے ساون بھادوں، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، خلیفہ راشد کے مزار پاک پر برسائے، کہ جنکی کاوشوں سے علم حدیث جیسی متاعِ بے بہا امت مسلمہ کو مدون شکل میں مل گئی۔ اپنے دورِ حکومت میں آپ نے اس عظیم الشان کام کو مدون اور مرتب کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کام کیلئے آپ نے امت کے بہترین افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔

چنانچہ بخاری، دارمی، اور موطاء میں آپ کا یہ فرمان بنام 'ابوبکر بن حزم'، قاضئ مدینہ، موجود ہے کہ، احادیث رسول ﷺ واحادیث عمر اوران کے مثل دیگر صحابہ کے آثار، جمع کر کے لکھو۔ کیونکہ مجھے علم کے ضائع ہونے اور علماء کے چلے جانے کا اندیشہ ہے۔ جب یہ فرمان ابوبکر بن حزم کے پاس پہنچا، توانھوں نے احادیث کے مجموعے تیار کرائے، اس ارادہ سے کہ انکو بارگاہِ خلافت میں بھیجیں گے۔ ابھی بھیجنے کی نوبت نہیں آسکی تھی کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا ۱۰۱ھ میں وصال ہوگیا۔

ارکانِ کمیٹی جسکے ایک رکن ابوبکر بن حزم خود تھے، نے وقت کے بہترین افراد کو خدمت حدیث پر مامور فرمایا، جن میں قاسم بن محمد بن ابوبکر، ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب زہری، سعد بن ابراہیم اور اسی دور میں ربیع بن صبیح اور سعد بن عروبہ اور امام شعبی نے بھی احادیث کی تدوین شروع کردی۔ احادیث میں ام المومنین سیدہ عائشہ کی مرویات کو بڑی اہمیت ہے، اسلئے کہ ان سے فقہ وعقائد کے بنیادی مسائل ماثور ہیں۔ اسی لئے سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے ان سے احادیث اخذ کرنے کا اہتمام بھی زیادہ کیا۔ عمرہ بنت عبدالرحمٰن کو ام المومنین سیدہ عائشہ نے خاص اپنی آغوش کرم میں پالا تھا۔ آپ (عمرہ بنت عبدالرحمٰن) بہت ہی ذہین، عالمہ، فاضلہ تھیں۔ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں، کہ آپ احادیث عائشہ کی سب سے بڑی حافظہ تھیں۔ قاضی ابوبکر بن حزم کو، سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے خاص ہدایت کی کہ عمرہ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیجو۔ اور پھر سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے مختلف دیار وامصار سے احادیث کے لکھے ہوئے دفتروں کے دفتر جمع کئے اور انہیں امام زہری کے حوالے کیا تاکہ وہ اسے سلیقہ سے مرتب کریں۔ ﴿تدریب الراوی﴾

کنزالعمال ﴿جلد۵، صفحہ ۲۳۸﴾ پر صالح بن کیسان کہتے ہیں کہ میرا اور زہری کا زمانہ ءطالب علمی ایک ہی ہے۔ زہری نے مجھ سے کہا کہ آؤ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں لکھیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔۔۔۔ معمر کا بیان ہے کہ امام زہری کی لکھی ہوئی احادیث کے ذخیرے کئی اونٹوں پر لادے گئے۔ حدیث وفقہ میں آپ کا کوئی مثل نہ تھا۔ تمام اکابرین محدثین، اصحاب ستہ، حتیٰ کہ امام بخاری کے بھی شیخ الشیوخ ہیں۔ آپ نے احادیث رسول ﷺ کو اس اہتمام، محنت اور لگن سے جمع کیا کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جا جا کر مرد، عورت، بچے، بوڑھے، جو مل جاتا حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین سے بھی پوچھ پوچھ کر حضور اقدس ﷺ کے احوال واقوال سنتے اور لکھتے۔

اسی انہماک کا ثمرہ اور نتیجہ تھا کہ آپ اپنے وقت کے اعلم علماء (سب سے زیادہ علم والا) کہلائے۔ آپکے بعد آپکے قابل قدر تلامذہ نے اپنے شیخ کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے اس موضوع

پر قابل قدر اضافے کیئے۔ یہاں تک کہ آپ کے مشہور تلمیذ، امام مالک بن انس ﴿م ۱۷۹ھ﴾ نے موطاء لکھی جس میں احادیث کو فقہی ابواب کے مطابق ترتیب وار جمع کیا۔ سعد بن ابراہیم، مدینہ منورہ کے قاضی تھے، جلالت علم کا یہ عالم تھا کہ سیدنا عمر بن عبد العزیز نے بھی ان سے احادیث کے دفتر لکھوائے اور تمام بلادِ اسلامیہ میں بھجوائے۔

دارمی ﴿صفحہ ۶۹﴾ پر عطاء بن رباح اور نافع رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے کہ یہ حضرات حدیثیں بیان کرتے اور انکے تلامذہ انکے سامنے لکھتے جاتے۔ ترمذی ﴿جلد ۲، صفحہ ۲۳۹﴾ پر ہے کہ ایک صاحب حضرت حسن بصری ﴿م ۱۱۰ھ﴾ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے پاس آپکی روایت کردہ کچھ احادیث لکھی ہوئی ہیں، کیا میں انکی آپ سے روایت کرسکتا ہوں؟ آپنے اسکی اجازت دی۔ حمید الطّویل نے بھی حضرت حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں ﴿تہذیب التہذیب جلد ۳، صفحہ ۳۹﴾ اسطرح سے کاروانِ علم حدیث مختلف مراحل طے کرتا ہوا دورِ تابعین میں داخل ہوا جسے آپنے مختصراً ملاحظہ فرمالیا۔

﴿کتابت حدیث: دورِ تبع تابعین میں﴾

تبع تابعین اور انکے مابعد کے ادوار میں کتابت احادیث کی وہ کثرت ہوئی کہ انکا احاطہ، مجھ جیسے کم علم کی بساط سے باہر ہے۔ صرف چند مشاہیر کے بیانات پر اکتفاء کرتا ہوں:

﴿۱﴾ ---تذکرۃ الحفاظ ﴿جلد ۱، صفحہ ۱۰۷﴾ پر محمد بن بشر کا بیان ہے کہ، مِسْعَرُ ﴿م ۱۵۵ھ﴾ کے پاس ایک ہزار احادیث لکھی ہوئی تھیں۔ دس کے سوا سب میں نے لکھ لیں۔

﴿۲﴾ ---عبد الرزاق کہتے ہیں کہ میں نے معمر ﴿م ۱۵۳ھ﴾ سے سن کر دس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ ﴿تذکرۃ، جلد ۱، صفحہ ۱۷۵﴾

﴿۳﴾ ---حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی۔ ﴿ایضاً﴾

﴿۴﴾ ---ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔

﴿۵﴾ ---حضرت عبد اللہ بن مبارک ﴿م ۱۸۱ھ﴾ شاگردِ امام اعظم ابوحنیفہ، نے اپنی لکھی ہوئی بیس ہزار احادیث لوگوں کو سنائیں۔ ﴿تذکرۃ﴾

﴿۶﴾ ---امام غندر ﴿م ۱۹۳ھ﴾ کے پاس اپنی مسموع احادیث کی کئی کتابیں تھیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا، انکی کتابیں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ ابن مہدی نے کہا، ہم حضرت شعبہ کی زندگی ہی میں 'غندر' کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

﴿۷﴾۔۔۔امام اعظم کے تلمیذ یحیٰی بن زائدہ ﴿م ۱۸۲ھ﴾ نے بھی احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا۔
﴿۸﴾۔۔۔امام ابویوسف ﴿م ۱۸۲ھ﴾ نے 'کتاب الآثار'، 'کتاب الخراج' وغیرہ تصنیف کیں اور امام محمد نے 'موطاء'، 'کتاب الآثار'، 'کتاب الحج' وغیرہ تصنیف کیں۔

ان شواہد سے یہ بات واضح ہوگئی کہ محدثین کی عام عادت رہی تھی کہ سلسلہءحدیث میں جو بھی سنتے اسے لکھ لیتے۔اوراسی دورمیں باقاعدہ کتابت حدیث کا سلسلہ بھی قائم ہوگیا۔چنانچہ مکہ مکرمہ میں ابن جریج ﴿م ۱۵۰ھ﴾ نے۔۔۔بصرہ میں سعید بن عروبہ ﴿م ۱۵۲ھ﴾ اور ربیع بن صبیح ﴿م ۱۶۱ھ﴾ نے ۔۔۔یمن میں معمر بن راشد ﴿م ۱۵۳ھ﴾ نے۔۔۔کتابیں لکھیں۔انکے بعد امام اوزاعی نے شام میں ۔۔۔امام ابن المبارک نے خراسان میں۔۔۔حماد ابن سلمہ نے بصرہ میں۔۔۔سفیان ثوری نے کوفہ میں۔۔۔جریر بن عبدالحمید نے رے میں۔۔۔ہشیم نے واسط میں۔۔۔کتابیں لکھیں۔اسی زمانہ میں امام مالک نے موطاء لکھی۔۔۔ابومعشر نے مغازی پر ایک کتاب لکھی۔۔۔امام شافعی کے استاذ،ابراہیم بن محمد اسلمی نے موطاءامام مالک کے طرز پرایک موطاء لکھی۔

موطاءامام مالک کےعلاوہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مرویات کو'کتاب الآثار' کے نام سے پیش کیا،جسکو انکے قابل قدر تلامذہ نے الگ الگ روایت کیا ہے۔انکے علاوہ دوسری صدی ہجری کے جن بزرگوں نے فن حدیث میں قابل قدر خدمات،تحریری طور پرانجام دی ہیں ان میں:
سنن ابوالولید ﴿۱۵۱ھ﴾۔۔۔۔جامع سفیان ثوری ﴿۱۶۱ھ﴾۔۔۔۔مصنف ابوسلمہ ﴿۱۶۷ھ﴾۔۔۔۔ مصنف ابی سفیان ﴿۱۹۷ھ﴾۔۔۔۔اور جامع سفیان ابن عیینہ ﴿۱۹۸ھ﴾ بہت مشہور ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں مسندامام احمد بن حنبل ﴿۲۴۱ھ﴾،امام بخاری کی الجامع الصحیح (بخاری) ﴿۲۵۶ھ﴾،الجامع الصحیح للمسلم (مسلم شریف) ﴿۲۶۱ھ﴾،سنن ابوداؤد ﴿۲۷۵ھ﴾،الجامع للترمذی ﴿۲۷۹ھ﴾، سنن ابن ماجہ ﴿۲۷۳ھ﴾،معرض وجود میں آئیں۔

ان مضبوط اور مستحکم حوالہ جات کی روشنی میں،ہم نے یہ بات آپکے سامنے پیش کردی ہے کہ کتابت احادیث عہدرسالت مآب ﷺ سے لیکر آج تک،سینوں سے لیکر صحیفوں تک،ایک ایک لفظ اوراسکی ترتیب کوبھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی طرح سے امت تک پہونچایا ہے،جس طرح سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا۔چنانچہ امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ:

'کسی شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے آپ ہی کی روایت کردہ حدیث،'بُنِیَ الِاسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ' کی ترتیب بدل کراس طرح سے پڑھ گئے کہ،اَلحَجُّ وَ صِیَامُ رَمَضَانَ۔حدیث پاک

میں روزے سے پہلے حج کا ذکر کر بیٹھے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً تنبیہ فرمائی اور کہا: لَا ! صِیَامُ رَمَضَانَ وَالحَجُّ، مفہوم یہ تھا کہ صیام رمضان پہلے ہے اور حج بعد میں۔ ﴿مسلم: جلد ۱، صفحہ ۳۲﴾

۔۔۔۔معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جس اہتمام سے حدیث رسول ﷺ یاد کرتے تھے اس میں لفظوں کی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ حالانکہ مذکورہ حدیث میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے معنی پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ مگر ارشادات رسول ﷺ کی ترتیب بدلنا بھی ابن عمر رضی اللہ عنہ کو گوارہ نہ ہوا۔

غالباً، منشاء رسول ﷺ یہی تھا کہ آپ کی زبان حق ترجمان کا ایک ایک لفظ محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کلام نبوی ﷺ کا نقشہ ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ اِذَا تَكَلَّمَ اَعَادَهَا ثَلٰثًا حَتّٰى تُفُهَمَ عَنْهُ ﴿بخاری: جلد ۱، صفحہ ۲۰﴾

۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔

حضور اقدس ﷺ جب کلام فرماتے، تو تین بار تکرار فرماتے تا کہ اسے بخوبی سمجھ لیا جائے۔

۔۔۔۔یہ اسلئے کہ آپ کو یہ احساس تھا کہ سامعین آپ کی ہر بات اچھی طرح سنیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ دوسری طرف مجلس نبوی ﷺ کا عالم یہ ہوتا کہ حدیث کی زبان میں:

كَاَنَّ عَلٰى رَءُوسِهِمُ الطُّيُوْرُ

۔۔۔۔صحابہ کرام مجلس اقدس میں ہمہ تن گوش ہو کر اس طرح بیٹھتے کہ گویا انکے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ ایک دفعہ جو سن لیا، پھر اسے یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی، یا پھر اس پر توجہ نہ رہی۔ بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت کریمہ یہ تھی کہ ارشادات رسول ﷺ سننے کے بعد، اس کوشش میں لگے رہتے تھے، کہ سماعت حدیث کے بعد بھولنے نہ پائیں اسلئے اسکو اچھی طرح سے حفظ کرتے اور پھر بار بار اسکا دَور کرتے۔

'مجمع الزوائد' ﴿جلد ۱، صفحہ ۱۶۱﴾ پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ارشادات رسول ﷺ کو سماعت کرتے، اور جب حضور علیہ السلام مجلس سے تشریف لے جاتے، تو ہم لوگ آپس میں اسکا دَور کرتے، ایک دفعہ ایک شخص کُل حدیثیں بیان کر جاتا، سب سنتے۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، کبھی کبھی ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے، اور وہ سب باری باری احادیث کو سناتے، ہماری مجلس کے برخاست ہونے پر، جب ہم اٹھتے تو ہمیں حدیثیں اس طرح سے یاد ہوتیں، گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں۔

'مستدرک' ﴿جلد ۱، صفحہ ۹۴﴾ پر ہے کہ، حضرت معاویہ، اپنا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ فرض نمازوں کے بعد، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھ کر قرآن و احادیث کا مذاکرہ کرتے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کہیں بیٹھتے، تو انکا موضوع، یا تو احادیث ہوتیں یا قرآن کا پڑھنا اور سننا ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ نفوس قدسیہ احادیث کی ایک ایک ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا کرتے۔ اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہی جوش و جذبہ اور ذوق و ولولہ اپنے تلامذہ میں بھی پیدا فرما دیا تھا۔

مستدرک اور کنز العمال وغیرہ کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جس دلچسپی سے اس کام کو آگے بڑھایا، تابعین عظام نے اکابرین صحابہ سے اس امانت کو من و عن دوسروں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، اپنے اصحاب سے فرماتے، کہ احادیث کو ایک دوسرے سے بیان کرتے رہو، اگر ایسا نہ کروگے تو چلی جائیں گی۔ 'مستدرک' ﴿جلد۱، صفحہ۹۵﴾، 'کنز العمال' ﴿جلد۵، صفحہ۲۴۲﴾ پر آپ کا فرمان کچھ اس طرح سے منقول ہے کہ، آپس میں ملتے رہو، احادیث کا دور کرتے رہو، اسے چھوڑ نہ دو۔ مستدرک ہی میں ﴿جلد۱، صفحہ۹۵﴾ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تعلق سے مرقوم ہے کہ، آپ اپنے تلامذہ سے اسکی تاکید کرتے رہتے کہ حدیثیں ایک دوسرے سے سنتے اور سناتے رہو اسی طرح وہ باقی رہ سکتی ہیں۔ دارمی ﴿صفحہ۷۹﴾ پر ہے کہ ایک دفعہ آپ نے اپنے تلامذہ سے پوچھا کہ، تم لوگ آپس میں اکٹھے بیٹھ کر احادیث سنتے سناتے بھی ہو یا نہیں؟ تلامذہ نے جواب دیا جی ہاں! ہم لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، حتیٰ کہ اگر ہمارا کوئی ساتھی حاضر نہ ہو، تو اگر کوفے کے آخری سرے پر ہوتا تو وہیں جا کر اس سے ملتے۔ اور پھر تابعین نے اپنے تلامذہ، یعنی تبع تابعین کو وہی جذبہ عشق رسول ﷺ سونپ دیا، جسکو لیکر وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک گئے تھے۔ اور پھر تبع تابعین نے بھی اس پر جی جان سے عمل کیا۔ چنانچہ چند حوالوں کی سیر فرما لیجئے:

دارمی ﴿صفحہ۸۱﴾، تہذیب ﴿جلد۱، صفحہ۲۷۰﴾ پر امام زہری، علقمہ، عبدالرحمن ابن ابی لیلیٰ سے منقول ہے کہ وہ ہمیشہ دورۂ حدیث کی تاکید کرتے رہتے۔ اسکا اثر یہ تھا کہ مشہور محدثین کے یہاں دورۂ حدیث کی مجلس رات بھر رہتی۔ بعد نماز عشاء مجلس شروع ہوتی تو نماز صبح پر ختم ہوتی۔۔۔۔ یونس کہتے ہیں کہ ہم حضرت حسن بصری کے پاس حدیثیں سننے کے بعد آپس میں انکا دور کرتے یہاں تک کہ اسماعیل بن رجاء کا دستور یہ تھا کہ دورۂ حدیث کیلئے اگر کوئی نہیں ملتا تو مکتب کے بچوں کو جمع کر کے انکے آگے حدیثیں پڑھتے تاکہ ضبط احادیث کی کوشش میں ناغہ نہ ہو۔ دارمی ﴿صفحہ۷۸﴾، تہذیب ﴿جلد۱، صفحہ۲۹۶﴾۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ راویان حدیث نے، احادیث کے محفوظ رکھنے اور انکی زیادہ سے زیادہ نشر و اشاعت کرنے میں، جو اہتمام کیا، جس ذوق و جذبہ اور عقیدت و

محبت کے ساتھ دوسری نسلوں تک پہنچایا، تاریخ عالم کسی فن کے حفظ وضبط اور نشر واشاعت کی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، جو مثال احادیث کے حفظ وضبط سے وابستہ ہے۔۔۔ان تمام مہمات کے ساتھ ساتھ حدیث کے مختلف گوشوں کو مدنظر رکھیں تو ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حفظ حدیث کے سلسلہ میں، امت کو جو معیار اور توازن عطا فرمایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔۔۔مثلاً:

۔۔۔حفظ حدیث اور اسکی نشر واشاعت کے تعلق سے یہ حدیث پاک:

نَضَّرَ اللّٰہُ اِمْراءً سَمِعَ مِنَّا حَدِیْثًا فَحَفِظَہٗ حَتّٰی یَبْلُغَہٗ غَیْرَہٗ

﴿ابوداؤد، کتاب العلم، جلد۲، صفحہ۱۲۶﴾

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر وتازہ رکھے جس نے ہماری حدیث سنی،
پھر اسے یاد کیا تا کہ دوسرے تک اسے پہنچا دے۔

۔۔۔یا۔۔۔بخاری ﴿جلد۱، صفحہ۴۹۱﴾ کی یہ حدیث:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْاٰیَۃً وَمَنْ کَذِبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاءَ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ

۔۔۔یعنی۔۔۔

میری باتیں دوسروں تک پہونچاؤ اگر چہ وہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو۔
اور جو شخص مجھ پر بالقصد جھوٹ باندھے گا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔

۔۔۔یا۔۔۔ترغیب وترہیب کی یہ روایت:

اَللّٰھُمَ ارْحَمْ خُلَفَائِیْ قُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ خُلَفَاؤُکَ؟
قَالَ الَّذِیْنَ یَاتُوْنَ مِنْۢ بَعْدِی یَرْوُنَ اَحَادِیْثِیْ وَیُعَلِّمُوْنَھَا النَّاسَ ﴿جلد۱، صفحہ۸۷﴾

اے اللہ میرے جانشینوں پر رحمت فرما؛ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ آپکے
جانشین کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئینگے،
میری حدیثوں کی روایت کریں گے اور لوگوں کو اسکی تعلیم دینگے۔

۔۔۔ارشاد نبوی ﷺ کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں احادیث کی سماعت اور حفاظت کا ایسا والہانہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ آرام وآسائش سے کوسوں دور ہو کر جذبہ اشاعت حدیث میں لگ گئے۔ یہ جذبہ کیسا تھا؟ اسکا اندازہ لگانے کیلئے بخاری 'کتاب العلم' کی یہ روایت ملاحظہ فرمائیں: کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ جو بذات خود احادیث کا خزانہ ہیں۔ آپ سے تقریباً ایک ہزار پانچ سو چالیس احادیث مروی ہیں، اسکے باوجود صرف ایک حدیث کی سماعت کیلئے ایک مہینہ کی مسافت طے کر کے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے دوسری طرف یہ تاکید شدید فرمائی کہ میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب نہ کرنا، مجھ پر

جھوٹ نہ باندھنا، جو مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ جہنمی ہے۔ وغیرہ، وغیرہ، من المفاہیم۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اجلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس اندیشہ کی وجہ سے، کہ خدانخواستہ روایت احادیث میں کوئی غلطی نہ ہوجائے، بیان حدیث کی کثرت سے بچتے تھے۔

بخاری ﴿جلد۱، صفحہ۲۱﴾ کتاب العلم پر حضرت زبیر بن عوام، حواری رسول ﷺ، کے تعلق سے مذکور ہے کہ آپکے صاحبزادے، حضرت عبداللہ نے عرض کیا: کہ جیسے اور لوگ احادیث بیان کرتے ہیں، آپ کیوں نہیں بیان کرتے؟۔۔۔تو فرمایا: بیٹے، میں ہمیشہ سفر اور حضر میں حضور ﷺ کے ساتھ رہا ہوں۔ مگر چونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّاءَ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ

جو مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

۔۔۔مطلب یہ ہے کہ مجھے اسکا اندیشہ ہے کہ سہواً کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ جو بات رسول اللہ ﷺ نے نہ کہی ہو، میں حضور ﷺ کی طرف منسوب کردوں۔ اسی لئے احتیاط کرتا ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، جو کہ مکثرین حدیث میں ہیں، آپ سے تقریباً دوہزار دوسو چھیاسی احادیث مروی ہیں، دارمی ﴿صفحہ۴۲﴾ پر آپ کا طریقہ اس طرح سے مرقوم ہے کہ جس حدیث کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہوتا، یا واقعہ اچھی طرح سے یاد نہ ہوتا، تو اسے بیان نہیں کرتے۔ اور خود ہی فرماتے غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو بیان کرتا۔ امام بخاری نے آپ کا بیان ان لفظوں میں نقل کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

اِنَّهٗ لَيَمْنَعَنِىْ اَنْ اُحَدِّثَكُمْ حَدِيْثًا كَثِيْرًا اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ

قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّا مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ﴿بخاری جلد۱، صفحہ۲۱﴾

بہت زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے جو بات مجھے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے اسکا ٹھکانہ جہنم ہے۔

۔۔۔'تذکرۃ الحفاظ' ﴿جلد۱، صفحہ۱۳﴾ پر حضرت عبداللہ بن مسعود کے تعلق سے مرقوم ہے کہ:

كَانَ مِمَّنْ يَتَحَرّٰى فِى الْاَدَاءِ وَيُشَدِّدُ فِى الرِّوَايَةِ

وَيَزْجُرُ تَلَامِذَه عَنِ التَّهَاوُنِ فِىْ ضَبْطِ الْاَلْفَاظِ

یہ ان لوگوں میں سے تھے جو حدیث بیان کرنے میں بہت احتیاط

کرتے تھے اور روایت میں بہت سختی برتتے تھے،

اور اپنے شاگردوں کو الفاظ یاد کرنے میں سستی کرنے پر ڈانٹتے تھے۔

۔۔۔ مِمَّنْ یَتَحَرّٰی سے قارئین کرام بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عادت صرف حضرت عبداللہ بن مسعود ہی کی نہیں بلکہ دوسرے حضرات بھی اسکا لحاظ کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ماجہ نے حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ کے تعلق سے لکھا کہ جب آپ بوڑھے ہوگئے تو حدیث بیان کرنا بند کردیا۔ اگر کوئی شخص ان سے حدیث کے معاملہ میں پوچھتا تو فرماتے اب ہم بوڑھے ہوگئے، حضور ﷺ کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے ﴿صفحہ۴﴾۔ دارمی ﴿صفحہ۸۷﴾ پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے تعلق سے یوں منقول ہے کہ، آپ اپنے تلامذہ کو تاکید شدید کرتے رہتے کہ بیان حدیث سے پیشتر اسے تین دفعہ دوہرالو۔

سیدنا صدیق اکبر اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما نے اپنے دور حکومت میں تاکیداً یہ حکم نافذ فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وہی حدیثیں بیان کی جائیں جن پر یقین کامل ہو۔ احادیث کے حفظ وضبط اور غایت احتیاط کے باوجود، اگر روایت میں کوئی بات ایسی ہے جو دیگر صحابہ میں معروف ومشہور نہیں ہے تو اس کیلئے تائید میں دوسرے صحابی کو تلاش کیا جاتا، تاکہ معاملہ کی نوعیت واضح سے واضح تر ہوسکے۔

چنانچہ مشکوٰۃ ﴿صفحہ۲۶۴﴾ پر، حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ دادی کو پوتے کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کتنا؟ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اجلہ صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا اور پوچھا کہ اگر کسی کو رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث یاد ہو تو بیان کریں۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو پوتے کی میراث سے چھٹا حصہ دیا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مطالبہ فرمایا کہ اس بات کو آپ کے علاوہ کوئی اور بھی جانتا ہے؟ انھوں نے محمد بن مسلم کا نام بتایا اور آپ نے آکر عدالت صدیقی میں اس بات کی شہادت بھی دی، تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی فرمان کی روشنی میں فیصلہ سنایا۔

﴿۲﴾۔۔۔ ایک مرتبہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان فرمانا شروع کی تو فرمایا، ڈر لگتا ہے کہ کوئی کمی یا زیادتی نہ ہوجائے، مگر اس حدیث کو عمار رضی اللہ عنہ نے بھی سنا ہے، اسلئے بیان کرتا ہوں۔ انہیں بلوا کر ان سے پوچھ لو۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو بلا کر دریافت کیا گیا۔ اور انھوں نے آکر اسکی تصدیق کی۔ ﴿ابوداؤد﴾

﴿۳﴾۔۔۔ تاریخ ابن الاثیر ﴿جلد۲، صفحہ۱۶۰﴾ پر حضرت ابوموسیٰ اشعری اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے تعلق سے مرقوم ہے کہ آپ نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو باہر سے تین دفعہ سلام کیا لیکن جواب نہ ملا تو آپ واپس لوٹ آئے۔ سیدنا فاروق اعظم نے انہیں بلوا بھیجا اور لوٹ جانے کی وجہ دریافت فرمائی۔ جواباً ابوموسیٰ اشعری نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا کہ حضور کا ارشاد ہے کہ؛ جو شخص تین

دفعہ سلام کہے اور اسے صاحب خانہ اندر آنے کی اجازت نہ دے تو وہ خواہ مخواہ اندر جانے پر اصرار نہ کرے، بلکہ واپس لوٹ جائے۔سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی صحت پر گواہ کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوموسیٰ، صحابہ کے پاس گئے تو ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔صحابہ نے وجہ پوچھی تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔کئی ایک صحابہ نے تائیداً آپ کو بتایا کہ ہم نے بھی اسی طرح سے حضور ﷺ سے حدیث سنی ہے۔چنانچہ ایک صاحب آپ کے ساتھ،سیدنا فاروق اعظم کے پاس تصدیق کیلئے حاضر ہوئے اور اپنی گواہی پیش کی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ کی سماعت کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعری سے اس واقعہ اور اس سے متعلق معاملہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اِنِّی لَمۡ اَتَّھِمۡكَ وَ لٰكِنِّی خَشِیۡتَ اَنۡ یَّتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلیٰ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ﷺ

۔۔۔۔میرا ارادہ تمہیں متہم کرنے کا نہ تھا لیکن اس خوف سے میں نے اتنی شدت کی تاکہ لوگ بے سروپا باتیں حضور ﷺ کی طرف منسوب نہ کرنے لگیں۔

اس قسم کی بہت ساری روایات کتب احادیث میں مذکور ہیں۔اور یہی وہ وجوہات تھیں جنکی بنیاد پر خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ،دیگر لوگوں کو کثرت روایت سے روکا کرتے تھے۔

چنانچہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے سامنے اگر کوئی ایسی حدیث بیان کرتا،جسکے بارے میں آپکو علم نہ ہوتا تو آپ راوی سے قسم لیتے تھے۔یہ ساری تدابیر اور انتھک جدوجہد کا مقصد کیا تھا؟۔۔۔۔ صرف اور صرف یہی کہ روایات احادیث کے سہارے،رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں دیگر اقوال کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ان تمام احتیاطی تدابیر اور مساعیٔ جمیلہ سے لوگوں نے مثبت نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے،خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف یہ الزام اور اتہام منسوب کر دیا کہ،ان حضرات کو احادیث کی صحت کے متعلق یقین نہ تھا اور یہ حضرات احادیث پر عمل کرنے سے دانستہ گریز کرنا چاہتے تھے۔اگر اس مقولہ کو ہم حقائق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو یہ محض افترا اور بہتان نظر آتی ہیں۔اسلئے مختصر مگر جامع اور مبنی برحقیقت شواہد پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

﴿الف﴾۔۔۔سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے خطبہ اول میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اَطِیۡعُوۡنِیۡ مَا اَطَعۡتُ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ فَاِذَا
عَصَیۡتُ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ فَلَا طَاعَةَ لِیۡ عَلَیۡکُمۡ

﴿تاریخ ابن الاثیر: جلد۲،صفحہ۱۶۰﴾

جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا رہوں،
تم بھی میری اطاعت کرتے رہو۔اور جب میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ

کی نافرمانی کرنے لگوں تو اس وقت تم میری اطاعت کے پابند نہیں ہو۔

﴿ب﴾۔۔۔سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ ہمایونی میں، اَحادِیْثِ نَبوِیَّہ عَلیٰ صَاحِبِھَا اَلْفُ اَلْفِ سَلَامٍ وَ تَحِیَّۃٍ کی نشر واشاعت کا وہ اہتمام کیا گیا کہ ساری امت، شرمندۂ احسان ہے۔ حکومت اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں ایسے ایسے اصحاب رسول ﷺ کو قرآن وسنت کی تعلیم کیلئے بھیجا، جنکی فکر وفن پر امت مسلمہ بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ اور انکی علمی تفوق صحابہ میں بھی مسلم تھی، چنانچہ تذکرۃ الحفاظ لامام ذھبی نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ مکتوب نقل کیا ہے جو آپ نے اہل کوفہ کے نام تحریر فرمایا تھا۔۔۔ متن ملاحظہ ہو:

اِنِّی قَدْ بَعَثْتُ اَلَیْکُمْ عَمَّارَبْنَ یَاسِرَ اَمِیْرًا وَعَبْدَ اللّٰہِ بْنَ مَسْعُوْدَ
مُعَلِّمًا وَوَزِیْرًا وَھُمَا مِنَ النَّجَاءِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ
وَمِنْ اَھْلِ بَدْرٍ فَاقْتَدُوْا بِھِمَا وَاسْمَعُوْا وَقَدْ آثَرْتُکُمْ
بِعَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَلیٰ نَفْسٍ

میں تمہاری طرف عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود کو معلم اور وزیر بنا کر
بھیج رہا ہوں۔ اور یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے بزرگ ترین صحابہ میں سے ہیں
اور بدری ہیں۔ انکی پیروی کرو اور انکا حکم مانو۔ عبداللہ بن مسعود کو تمہاری
طرف بھیج کر میں نے تمھیں اپنے نفس پر بھی ترجیح دی ہے۔

وَقَدْ قَامَ فِیْ الْکُوْفَۃِ یَأْخُذُ مِنْہُ اَھْلُھَا حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ
وَھُوَ مُعَلِّمُھُمْ وَقَاضِیْھِمْ۔

۔۔۔یعنی۔۔۔

آپ کا قیام کوفہ میں رہا اور وہاں کے باشندے ان سے احادیث نبوی ﷺ سیکھتے رہے۔
وہ اہل کوفہ کے استاذ اور قاضی بھی تھے۔

۔۔۔۔بصرہ کی امارت پر آپ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا، انھوں نے اپنے آنے کی غرض وغایت ان لفظوں میں بیان کی:

بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ عُمَرُ لِاُعَلِّمَکُمْ کِتَابَ رَبِّکُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے تمھاری طرف اسلئے بھیجا ہے، تا کہ میں تم کو
تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت کی تعلیم دوں۔

۔۔۔قاضی شریح کے نام آپکا یہ مکتوب جس میں آپنے انکے لئے طریقہء فیصلہ ان جامع لفظوں میں بتایا کہ:

اِذَا اَتَاكَ اَمْرٌ فَاقْضِ بِمَا فِی کِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ اَتَاكَ مَالَيْسَ
فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ فَاقْضِ بِمَا سَنَّ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اسکا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرو،
اور اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جسکا حکم قرآن میں نہ پاؤ، تو پھر رسول اللہ ﷺ کی
سنت کے مطابق اسکا فیصلہ کرو۔ ﴿الموافقات للامام الشاطبی: جلد۴، صفحہ۷﴾

۔۔۔۔تاریخ ابن الاثیر: ﴿جلد۳، صفحہ۲۰۸﴾ پر آپ ہی کے تعلق سے یہ واقعہ مرقوم ہے کہ، ایک مرتبہ آپ حج کیلئے گئے تو اسلامی مملکت کے تمام گورنروں اور والیوں کو بلا بھیجا۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو آپ نے ایک بہت ہی مؤثر اور معنی خیز تقریر فرمائی جسکا یہ حصہ قابل غور ہے:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّی مَا اُرْسِلُ اِلَيْكُمْ عُمَّالًا لِيَضْرِبُوْا اَبْشَارَكُمْ
وَلَا لِيَاخُذُوْا اَمْوَالَكُمْ وَاِنَّمَا اُرْسِلُهُمْ لِيُعَلِّمُوْكُمْ دِيْنَكُمْ
وَسُنَّةَ نَبِيِّكُمْ فَمَنْ فُعِلَ بِهٖ شَئٌ سِوٰی ذٰلِكَ فَلْيَرْفَعْهُ
اِلَیَّ فَوَالَّذِیْ بِيَدِهٖ نَفْسُ عُمَرَ لَاَقُصَّنَّهٗ مِنْهُ

اے لوگو! میں نے تمہاری طرف جو حکام بھیجے ہیں وہ اسلئے نہیں کہ تمھیں زدوکوب کریں،
اور تمہارے اموال تم سے چھینیں۔ میں نے انھیں صرف اسلئے تمہاری طرف بھیجا ہے
کہ وہ تمھیں تمہارے دین اور تمہارے نبی ﷺ کی سنت کی تعلیم دیں۔ حکام میں سے اگر
کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہو تو میرے پاس پیش کرو۔ اس ذات پاک کی
قسم جسکے قبضہء قدرت میں عمر کی جان ہے میں اس سے قصاص لئے بغیر نہیں رہوں گا۔

۔۔۔۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ 'ازالۃ الخلفاء' میں لکھتے ہیں:

'چُنَانْکِهْ فَارُوْقِ اَعْظَمْ ،عَبْدُ اللّٰهِ بِنْ مَسْعُوْدَ رَا بَا جَمْعِے بَکُوْفَهْ فِرِسْتَاد، وَ مُغَفَّلْ بِنْ يَسَارْ وَ عَبْدُاللّٰه بِنْ مُغَفَّلْ وَ عِمْرَانْ بِنْ حُصَيْنْ رَا بِه بَصْرَه، وَ عُبَادَهْ بِنْ صَامِتْ وَ اَبُوْ دَرْدَاء رَا بَشَام بِهْ مُعَاوِيَهْ بِنْ سُفْيَانْ کِه اَمِيْرْ شَام بُوْدْ قَدْ غَنِ بَلِيْغْ نَوِشْتْ کِهْ اَزْحَدِيْثِ اِيْشَانْ تَجَاوُزْ نَهْ کُنَدْ'

تعلیم قرآن وسنت کیلئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعود کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ بھیجا، اور مغفل بن یسار، اور عبداللہ بن مغفل وعمران بن حصین کو بصرہ، اور عبادہ بن صامت اور ابو درداء کو شام بھیجا۔ اور امیر معاویہ کو جو اس وقت شام کے گورنر تھے، سخت تاکیدی حکم لکھا

کہ یہ حضرات جو احادیث بیان کریں ان سے ہرگز تجاوز نہ کیا جائے۔

ان تمام شواہد کی روشنی میں کیا یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نہیں ہو جاتی کہ ان حضرات نے احادیث کی نشر و اشاعت میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، امت مسلمہ تا قیام قیامت ان احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اعتراض کا دوسرا حصہ، یہ حضرات احادیث پر عمل کرنے سے دانستہ گریز کرنا چاہتے تھے، کو بھی ہم حقائق و شواہد کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ اعتراض ایک بے بنیاد الزام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان حضرات کا طریقہء فیصلہ بمطابق قرآنی ہوا کرتا۔ اگر معاملہ کا حکم قرآن کریم میں پا جاتے تو بہ تقاضائے قرآن فیصلہ کرتے ورنہ پھر احادیث کی طرف رجوع کرتے۔ معترضین صبح قیامت تک کوئی ایسی روایت نہیں پیش کر سکتے جس میں، ان حضرات نے احادیث کی موجودگی میں اپنے قیاس و استنباط کو جگہ دے کر احادیث سے دانستہ گریز کیا ہو۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود اگر احادیث کا پتہ نہ چلا اور عین وقت فیصلہ، کسی صحابی نے اطلاع دی کہ اس باب میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے، تو یہ نفوس قدسیہ فوراً اپنے اجتہاد کو ترک کر کے احادیث رسول ﷺ پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ جسکی ایک جھلک آپ نے خلافت صدیقی میں ملاحظہ فرمالی ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کتنا معنی خیز ہے:

لَوۡ لَمۡ نَسۡمَعۡ هٰذَا لَقَضَيۡنَا فِيۡهِ بِخِلَافِ ذٰلِكَ

﴿المستصفی للامام غزالی: جلد۱، صفحہ۹۵﴾

اس معاملہ میں اگر ہم نے یہ حدیث سنی نہ ہوتی تو ہم نے اسکے خلاف فیصلہ دیا ہوتا۔

۔۔۔۔معلوم ہوا کہ ان حضرات نے ہمیشہ اور ہر حال میں سنت نبوی ﷺ، اتباع سنت اور منشاء رسالت ﷺ کے مطابق عمل بھی کیا اور فرمان بھی جاری کیا ہے۔ چنانچہ مجوس کے تعلق سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بہت اضطراب کا شکار تھے کہ انکے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اہل کتاب کی طرح ان سے جزیہ لیا جائے یا نہ لیا جائے؟ ۔۔۔۔اسی اثناء میں حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کی روایت پر کہ رسول اللہ ﷺ نے مجوس سے جزیہ لیا ہے، آپ نے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا۔

قَالَ عُمَرُ مَا اَدۡرِیۡ مَا اَصۡنَعُ بِالۡمَجُوۡسِ وَلَيۡسُوۡا اَهۡلَ الۡكِتَابِ؟
فَقَالَ عَبۡدُ الرَّحۡمٰنِ بۡنُ عَوۡفٍ سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ
يَقُوۡلُ: سَنُّوۡا بِهِمۡ سُنَّةَ اَهۡلِ الۡكِتَابِ ﴿المستصفی: جلد۱، صفحہ۹۵﴾

حضرت عمر نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ مجوس کے ساتھ کیا سلوک کروں؟
اور یہ اہل کتاب بھی نہیں کہ انکے ساتھ یہود ونصاریٰ کی طرح کا سلوک کیا جائے،
تو حضرت عبدالرحمان بن عوف نے انہیں بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ
کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ، انکے ساتھ اہل کتاب کی طرح کا سلوک کرو۔

۔۔۔۔ابوداؤد کی ایک روایت جس سے اس واقعہ کو مزید تقویت ہوتی ہے وہ یہ کہ:

لَمْ یَکُنْ عُمَرُ یَاخُذَ الْجِزْیَةَ مِنَ الْمَجُوْسِ حَتّٰی شَهِدَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ
بْنُ عَوْفٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَخَذَهَا مِنْ مَّجُوْسِ هَجَرٍ

حضرت عمر مجوس سے جزیہ نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ عبدالرحمان بن عوف نے
شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے مجوس ہجر سے جزیہ قبول فرمایا ہے۔

غور فرمائیں کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایسے موقع پر اپنے قیاس واجتہاد کے بجائے فرمان رسول ﷺ کو اہمیت دے کر اسے حرز جان بنالیا ہے۔لیکن لوگوں کی تنگ نظری سے خدا کی پناہ جو آج بھی یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ خلفائے راشدین عمل بالحدیث سے دانستہ گریز کرتے تھے۔ بے شمار روایات ایسی ہیں کہ عین وقت فیصلہ، کسی صحابی نے خلفائے راشدین کے قیاس واجتہاد کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بیان کردی ہے، توان نفوس قدسیہ نے اولیت اپنے اجتہاد کونہیں بلکہ حدیث رسول کو دی ہے۔اگرچہ راوی ایک ہی رہا ہو۔

چنانچہ ایک مقدمہ معمہ کی شکل میں آپکی عدالت میں پیش ہوتا ہے،جس میں ایک عورت دعویٰ کررہی ہے کہ اسکا خاوند قتل کردیا گیا ہے اور قصاص کی جگہ پر قاتل سے خوں بہا لے لیا گیا۔اس خوں بہا کی رقم سے وہ عورت بھی حق وراثت مانگ رہی ہے۔یہ ایک عجیب مسئلہ ہے جسکے تعلق سے صریحاً نہ تو قرآن میں کوئی حکم مل رہا ہے اور نہ ہی بروقت کوئی حدیث یاد آرہی ہے۔اسلئے اپنے قیاس سے یہ فیصلہ کررہے ہیں کہ، 'تجھے دیت میں سے کچھ نہیں مل سکتا'، کیونکہ ورثہ مال متروکہ سے نہیں، کہ اس میں سے تجھے حصہ ملے۔عین اسی موقع پر حضرت ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو، اسکے مقتول خاوند کی دیت سے حصہ دیا ہے۔تو فوراً سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

غور فرمائیں کہ قیاس مکمل طور پر آپ کا ساتھ دے رہا ہے۔لیکن فرمان رسول ﷺ کی بجاآوری کا جو جذبہ آپ نے اس واقعہ میں پیش فرمایا ہے وہ اہل بصیرت کیلئے ایک حسین درس کی

حیثیت رکھتا ہے۔۔۔ایک بار عدالت فاروقی میں جنین (وہ بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو) کی دیت کا مسئلہ پیش ہوا۔قیاس کا تقاضہ تھا کہ،جنین اگر زندہ ہے تو پوری دیت دی جائے،اور اگر مردہ ہے تو کچھ بھی نہ دیا جائے۔لیکن آپ نے فقط حمل بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے پیش نظر،موافق حدیث فیصلہ سنایا کہ جنین کی دیت غرہ (دیت کا بیسواں حصہ) ہے،اور مزید فرمایا کہ:

كِدْنَا اَنْ نَّقْضِیَ فِیْهِ بِرَائِنَا وَفِیْهِ سُنَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

قریب تھا کہ ہم اس کا فیصلہ اپنی رائے سے کردیتے،

حالانکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث موجود ہے۔

۔۔۔یعنی اگر ہم ایسا کرتے تو سخت غلطی کرتے۔

چشم بصیرت کو اگر کھول کر مندرجہ بالا شواہد کا مطالعہ کیا جائے تو ہدایت و رہنمائی کے کئی راستے مل سکتے ہیں،لیکن اگر کوئی شخص اس بات پر بضد ہے کہ عامۃ المسلمین کو گمراہ کرنے کیلئے احادیث کو نشانہ ٔ ہدف بنایا جائے،تو ہم اتنی بات ضرور عرض کرنے کی اجازت چاہیں گے:

۱۔۔۔اصولِ مسلم میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ راوی اگر بدعقیدہ ہے تو اسکی روایت نا مقبول ہے۔

۲۔۔۔راوی، حدیث کے علاوہ کسی اور معاملہ میں ایک بار بھی جھوٹ بولدے، تو اسکی روایت نامقبول۔

۳۔۔۔راوی فاسق ہے تو،اسکی روایت نامقبول۔

۴۔۔۔اور اگر اس نے کوئی حدیث گڑھ لی ہے تو اسکی روایت اتنی نا مقبول ہے کہ وہ موضوع ہے۔

۵۔۔۔راوی،خلاف وقار اور خلاف مروت افعال کا ارتکاب کرتا ہے،تو اسکی روایت نامقبول۔

۶۔۔۔اگر اسکا حافظہ کمزور ہے کہ بات اچھی طرح یاد نہیں رکھ سکتا،تو اسکی روایت نامقبول۔

۷۔۔۔اگر کسی کی تلقین قبول کرلیتا ہے۔۔۔مثلا: اس نے بیان کیا کہ یہ حدیث یوں ہے، کسی نے کہا یوں نہیں، یوں ہے اور اس نے مان لیا،تو اسکی روایت نامقبول ہے۔

۸۔۔۔تمام خوبیوں کا جامع ہے،مگر جو روایت کرتا ہے،وہ ثِـقَـہ، عادل اور تام الضبط راویوں کے خلاف ہے،تو اسکی روایت نامقبول۔

۹۔۔۔سب کچھ درست ہے،مگر سند میں ایک راوی کا نام چھوٹ گیا،تو اسکی روایت نامقبول۔

دنیا سے اگر انصاف رخصت نہیں ہوا ہے، تو اس سے پوچھ لو کہ ان تمام پابندیوں کے بعد اور ان تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ کیا کوئی غلط بات رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کرنے کی گنجائش رہتی ہے اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ راوی اور روایت پر اتنی کڑی نظر رکھنے کے باوجود غلط بات حضور علیہ السلام کی جانب منسوب ہو جائے اور گرفت میں نہ آئے۔۔۔۔اسلئے جہاں تک عقل وانصاف اور دیانت کا تقاضہ ہے، یہ ماننا پڑے گا کہ آج احادیث کے جو ذخائر موجود ہیں، ان میں مندرج جن احادیث کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ قابل اعتبار ہیں، تو وہ از روئے عقل ونقل، قابل اعتماد اور لائق عمل رہیں گی۔۔۔۔ذخائر احادیث پر غائرانہ نظر ڈالیں تو محدثین بیانِ احادیث میں حد درجہ احتیاط کرتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔وہی بیان کرتے ہیں جنکے بارے میں اچھی طرح صحیح یاد ہونے پر اطمینان ہوتا ہے۔ ذرا بھی شبہ ہوتا ہے، تو ہرگز بیان نہیں کرتے ہیں۔حتی کہ راوی میں کوئی ایسا نقص ہوتا ہے جسکی وجہ سے اسکی روایت مخدوش ہوتی ہے، تو اسکو برملا ظاہر کر دیتے ہیں۔اس باب میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے ہیں۔صرف انہی راویوں کی روایت قابل تسلیم ہوتی ہے، جن میں کوئی ایسا عیب نہ ہو جس سے روایت مجروح ہو رہی ہو۔۔۔۔ان سب پابندیوں کے باوجود اور احتیاط کے ساتھ اگر احادیث کا ذخیرہ غیر معتبر ہے، تو پھر دنیا میں معتبر کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بغض وعناد اور انکی ذاتِ قدسی صفات پر اعتراض کرنے کیلئے معترضین کو کوئی بہانہ چاہیئے، اسلئے کبھی آپ کے فتاویٰ، کبھی روایات اور کبھی معمولات پر اعتراض کی بوچھار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کہیں سے کچھ نہیں مل پاتا، تو یہ سہارا لیا جاتا ہے کہ محدثین غیر عرب کیوں ہیں۔۔۔۔غالباً ان حضرات کو سیدنا بلال حبشی، سلمان فارسی، صہیب رومی اور نجاشی پر بھی اعتراض ہوگا اور انکی مرویات بھی مشکوک ہونگی؟۔۔۔۔اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو ذہن نشین کر لیں کہ اسلام عربی، عجمی، اسود، احمر، ابیض، اسمر، سب کیلئے ہے، تو پھر محدثین کی جماعت میں عجمیوں کو دیکھ کر حیرت کی بات ہی کیا ہے؟۔۔۔۔اور پھر عجمی محدثین کی روایات کی بنیاد تو عربوں ہی پر ہے، تو پھر آپ کا اعتراض کیا ہے؟ اگر اعتراض ہے تو پھر اعلان کر دیجیئے کہ غیر عرب کا اسلام میں کوئی حق نہیں ہے۔اور اسکے بعد آپ اپنا ہی شجرۂ نسب بیان کر دیں کہ آپ کون ہیں؟ جو آپ خود ہی عربی نہیں ہیں، تو آپ کو احادیث پر کلام کرنے کا حق کہاں سے ملا۔۔۔بلکہ آپ مسلمان کیسے رہے؟ ۔۔۔۔یہ تو بقول آپ کے بحق عرب محفوظ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے شرح اور شارح حدیث مدظلہ عالی کے بارے میں مختصر مطالعہ

کرلیا جائے۔ اہل علم کیلئے یہ بات کافی مشکل ہے کہ وہ حضرت ممدوح کی کوئی حیثیت متعین کرسکیں۔ اسلئے کہ آپکے اندر بیک وقت مفسرانہ کلام، محدثانہ ژرف نگاہی، فقیہانہ بالغ نظری، متکلمین کا استدلال، بخاری ومسلم کا ذوق، امام ابوحنیفہ کا تفقہ، امام بوصیری کا سوز، شیخ رومی کا ساز اور امام احمد رضا کا تیقظ موجود ہے۔۔۔۔

عشق نبوی علیہ السلام آپ کو ورثہ میں ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرامین رسالت کی تشریح وتوجیہہ کیلئے 'تفہیم الحدیث' جیسا سرمایہ امت مسلم کو عطا فرمایا جسکی سطروں سے عشق رسول ﷺ کے انوار پھوٹتے نظر آرہے ہیں۔ پھر فوائد ومسائل میں بے شمار جزئیات کا استنباط کرکے گم کردہ راہوں کو ایک حسین منزل یعنی ارشادِ رسول علیہ السلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، جہاں صحرائے حیات میں بے یارو مددگار جادہ پیمائی کرنے والے مسافر اپنے آپ کو شجر سایہ دار کے نیچے محسوس کررہے ہیں۔

۔۔۔مثلاً: 'اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ' ۔۔۔الحدیث پر گفتگو کرتے ہوئے ہر نقطۂ نظر سے حدیث کا جائزہ لیتے ہیں:

۔۔۔اولاً۔۔۔ مصنفین علم حدیث کی تصنیف سے حدیث کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔

۔۔۔ثانیاً۔۔۔ مقامِ حدیث مذکور کی وضاحت فرماتے ہیں۔

۔۔۔ثالثاً۔۔۔ صحت وعدم صحت پر گفتگو اور مسلک جمہور متعین کرتے ہیں۔

۔۔۔بعدہٗ محدثین کا عمل بھی پیش کرکے اس حدیث کی افادیت پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے جب فوائد ومسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، تو حدیث کے تمام تر مخفی گوشوں کی اسطرح عمدہ توضیح بیان کرتے ہیں کہ موافق ومخالف ہر ایک کیلئے حدیث مذکور کی افادیت یکساں ہوجاتی ہے۔

اس حدیث نیت میں ایک ہی عمل خیر سے متعدد نیتوں کے واسطے سے بہت سارے ثواب کے حصول کی صورت میں تقریباً بارہ ۱۲ مختلف نیات کا ذکر فرمایا ہے۔ جس میں آج کے دور کیلئے بالخصوص امریکن دنیا میں مسلمانوں کو اسلام بیزاری سے بچاتے ہوئے ہدایت کے واضح خطوط عطا فرمارہے ہیں اور اس پر ثواب کی بشارت بھی سناتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھنا ایک ایسا عمل ہے کہ جسکے ذریعے بندۂ مومن اپنے آپ کو علاقہ دنیاوی سے برطرف کرکے خانۂ خداوندی میں حاضر ہو اور دست طلب دراز کرے۔

'فوائد' میں کچھ ایسے نادر مسائل بھی بیان فرمادیئے ہیں کہ اگر عام فہم قاری بہ نظر غائر مطالعہ کرلے، تو موجودہ دور کے درپیش مسائل میں سے بہت سارے مسئلوں کا حل مل جاتا ہے۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔اربابِ کلیسا کا تخیل اور مادہ پرست فلاسفہ کے نظریات، نیز انکے بطلان کے بعد

اسلامی قوانین کی عالمگیری کو اتنے نفیس پیرایہ میں بیان فرمایا کہ موافق اور مخالف دونوں کیلئے، باعث ہدایت ہیں۔

﴿۲﴾۔۔۔قرآن اور احادیث کی روشنی ہی میں رسول اکرم ﷺ کے منجانب اللہ شرعی اختیارات اور تصرفات ثابت کر کے عقائد اہلسنّت کی ترجمانی بھی کر دی۔

﴿۳﴾۔۔۔اصلاح نفس وقلب کیلئے بہت ہی حکیمانہ انداز میں خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سے استدلال فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں۔۔۔۔میں تین چیزوں کی انتہا نہ جان سکا:

۱۔۔۔معارفت الٰہی ۲۔۔۔مقامِ مصطفیٰ ﷺ ۳۔۔۔فریب نفس

بغور دیکھا جائے تو اصلاحِ نفس وروح کیلئے حضرت مدظلہ کا ایک ہی مقالہ کافی ہے، لیکن اپنے الطافِ کریمانہ کے پیش نظر اسی پر اکتفاء نہیں، بلکہ قاری کو اس آستانے پر لے جانے کی کوشش فرماتے ہیں جہاں سے امت مسلمہ کو ایک باوقار زندگی گزارنے کی صدا واضح طور پر سنائی دے رہی ہے۔

نشانِ منزل مقصود ہے میری تربت
نشاں میں چھوڑتا ہوں اہل کارواں کیلئے

حدیث نیت کو درحقیقت ام الاحادیث کہا گیا ہے، حضرت شارح مدظلہ نے حدیث مذکور کی شرح کر کے اسکا حق ادا کر دیا ہے اور عصر حاضر کے شارحین کیلئے ایک لائق تقلید نمونہ پیش فرما دیا ہے۔

اسی طرح بقیہ تمام احادیث کی شروحات نہایت ہی محققانہ انداز میں قلمبند کی گئی ہیں۔نہایت ہی عمدگی سے مفصل اور مبوب، احادیث مبارکہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔متن حدیث، روایت راوی، حسن و صحت حدیث، فوائد ومسائل۔۔۔۔نیز۔۔۔۔دیگر متعلقہ امور پر نہایت فاضلانہ بحث فرمائی ہے۔اندازِ گفتگو اتنے دل نشین پیرائے میں بیان فرمارہے ہیں، گویا سارے معاملات چشم دید ہیں اور قاری بارگاہِ رسول علیہ السلام میں حاضر ہے اور بذاتِ خود ملاحظہ کر رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شرح سے قاری کو حضرت شارح مدظلہ کی رسول علیہ السلام سے والہانہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔واضح رہے کہ وابستگیٔ رسول ﷺ کے بغیر اتنی عمدہ گفتگو متصور نہیں ہوسکتی۔جو شخص ذاتِ رسول ﷺ پر اپنی متاعِ حیات قربان کر چکا ہو، وہی اتنی حسین تفسیر کر سکتا ہے۔

آپ بہت ہی حکیمانہ انداز میں امت مسلمہ کو رسول اللہ ﷺ اور محبوبانِ بارگاہِ الٰہی سے وابستگی کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں اور اس دعوت کیلئے مختلف لب و لہجے میں ذہن انسانی سے خطاب فرما ہیں۔احادیث کی شرح کرتے وقت فوائد ومسائل کا کوئی گوشہ تشنہ طلب نہیں رکھا۔قارئین وسامعین

سبھی معترف ہیں کہ شارح حدیث حضرت شیخ الاسلام فضل و کمال، علم وادراک، زہد وتقوی، ایثار و توکل، شرف و بزرگی، حلم و بردباری، قیادت وسیادت، بصیرت ورفعت، علم وحکمت، جود وسخا، اور فضل وعطا کے اس مقامِ رفیعہ پر فائض ہیں کہ جن تک دنیا دار حضرات کی پہنچ ناممکن ہی نہیں، محال بھی ہے ۔۔۔۔بایں ہمہ۔۔۔۔عنایات خسروانہ اور الطافِ کریمانہ حد درجہ متواضع اور خورد نواز بزرگ ہیں۔

حضرت ممدوح مدظلہ کا یہ وصف آج کے دور قحط الرجال میں اکابرین سے بھی عنقاء ہوتا جارہا ہے۔ مذہبی وملی ذمہ داری پورا کرنے میں، اتباع سنت نبوی کے ساتھ تبلیغ سنت نبوی کیلئے، اور فریضہء احقاقِ حق وابطال باطل کیلئے ہمیشہ چاق و چوبندرہتے ہیں اور علم واخلاص کی تقسیم میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، جسکے معترف ہم جیسے بے ہنر بھی ہیں۔ یہ حضرت ممدوح ہی کا فیض ہے کہ مجھ سنگ ناتراشیدہ کو آب وتاب بخش کر خدمت دین کیلئے وقف کردیا ہے۔

بڑی ناشکری ہوگی اگر ہم اپنے دیرینہ کرم فرما اور محسن عالی جناب محمد مسعود احمد سہروردی، اشرفی کا ذکر نہ کریں کہ موصوف نے امریکہ اور کینیڈا میں جو تبلیغ دین متین کا نمونہ پیش فرمایا ہے وہ آج کی دنیا ہی میں نہیں، آنے والے مبلغین کیلئے بھی لائق تقلید ہے۔ اپنی جیب خاص سے اہلسنّت و جماعت کا صحتمند لٹریچر چھاپ کر احباب اہلسنّت کو پہنچانا، جیلوں میں قیدیوں کو جا کر قرآن واحادیث،۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔عقائد واعمال اہلسنّت کا مواد دیکر مذہب حق، اہلسنّت و جماعت کی دعوت دینا، بذریعہ ڈاک اور ای میل، لوگوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دینا اور پھر لوگوں کے چنین و چناں سے بھی التفات فرمانا۔ درحقیقت ان مذکورہ بالا امور میں ہر معاملہ اپنی جگہ پر مکمل ایک کام ہے، لیکن موصوف ہر کام کو بحسن وخوبی نبھاتے چلے جارہے ہیں۔ یہاں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کئی مذہبی تنظیموں سے منسلک رہنے کے باوجود اپنی تحریری سرگرمیوں میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہونے دیتے۔ حفظ اوقات میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ اہلسنّت کی نمائندگی امریکن ماحول میں ایک اہم مسئلہ تھا، لیکن موصوف کی قلندرانہ پیش قدمی نے اسکو بھی بحسن وخوبی نبھایا اور نبھارہے ہیں۔

ان تمام اوصاف کے باوجود شہرت وناموری سے کوسوں دور، گھر میں مکمل اسلامی ماحول کا نفاذ، خلوت وجلوت میں یکساں ہیں۔ اساطین اہلسنّت پاک و ہند میں قائد اہلسنّت، حضرت مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ، ماہر رضویات، ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ العالی شیخ الحدیث علامہ نصر اللہ خاں صاحب افغانی دامت برکاتہم العالیہ نمونہء اسلاف، مفتی اطہر نعیمی صاحب مدظلہ العالی حضور شیخ الاسلام، علامہ سید محمد مدنی میاں مدظلہ العالی، غازئ ملت، سید ہاشمی میاں صاحب ودیگر بزرگانِ خانوادۂ اشرفیہ۔۔۔۔نیز۔۔۔۔علامہ

توسیف رضا خان وخاندانِ رضویہ کی دعائیں اور ہدایات، انکے ہر ہر قدم پر شامل حال رہا کرتی ہیں۔

راقم الحروف، فقیر علوی پر موصوف تو بہت ہی کریم ومہربان ہیں۔ تبلیغ مذہب حق، اہلسنّت و جماعت میں ہمیشہ شانہ بشانہ رہے ہیں۔ گم گشتگان راہِ اسلام کو جس خوش بیانی سے آپ مذہب کے قریب کررہے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاءاللہ مستقبل قریب میں آپکی ذات گم کردہ راہوں کیلئے خضر منزل ہوگی اور افراد مذاہب باطلہ بہت جلد ہی اپنی کشتیوں سے چھلانگے لگا دیں گے، شاید انہی وجوہات کے پیش نظر شیخ الاسلام مدظلہ العالی نے آپ کو اپنی نیابت کیلئے منتخب فرمایا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ تمام بزرگوں کے فیوض و برکات کو عام وتام فرمائے اور ہم سب کو مسلک حقہ کی بیش از بیش خدمت کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔

﴿ اٰمِین! یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ بِجَاہِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾

فقیر
ابوالفضل
سید محمد فخر الدین علوی

مشیر مذہبی امور
گلوبل اسلامک مشن، انک
نیویارک، یوایس اے

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۶ھ ۔۔ بمطابق ۔۔ ۲ اگست، ۲۰۰۵ء

عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِاِمْرِئٍ مَّانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوْ امْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَاھَاجَرَ اِلَیْہِ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

'امیر المومنین حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور آیۂ رحمت علیہ التحیہ والتسلیم نے فرمایا، 'بارگاہِ حق تعالیٰ میں کوئی عمل بغیر نیت مقبول و معتبر نہیں۔ اور مرد کو صرف اس عمل کا ثواب ملے گا جسکی اس نے نیت کی۔ تو جسکا اپنے وطن کو چھوڑنا اللہ و رسول کی رضا اور ان کے احکام برلانے کیلئے ہے، تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کیلئے ہے۔ اور جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا عورت سے نکاح کرنے کیلئے ہو، تو اسکی ہجرت اس طرف ہوگی جسکے لئے کی۔'

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ.

'امیر المومنین حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور آیۂ رحمت ﷺ نے فرمایا،
'بارگاہِ حق تعالیٰ میں کوئی عمل بغیر نیت مقبول و معتبر نہیں'۔

بعض روایتوں میں ہے اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، بعض میں ہے اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّۃِ اور بعض میں اَلْعَمَلُ بِالنِّیَّۃِ ہے۔ لیکن ان تمام عبارتوں سے مقصود و مراد یہی ہے کہ کوئی عمل، خواہ قلب کا ہو یا قالب کا، 'اخذ' سے متعلق ہو یا 'ترک' سے، قول ہو یا فعل، عبادات سے ہو یا عادات سے، بے نیت مقبول و معتبر نہیں اور اس پر ثواب کا ترتب نہیں۔

اکثر مصنفینِ علم حدیث نے اپنی کتابوں کی ابتداء اسی حدیث شریف سے فرمائی ہے اور بعض مشائخ متقدمین نے امورِ دین کے ہر امر کے آغاز اور دینی تالیفات کی ابتداء میں اس حدیث شریف کی تقدیم کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اس میں طالب علم حدیث۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ طالب علم دین کیلئے یہ تنبیہ و ترغیب ہے کہ اس علم شریف کی طلب و تحصیل کیلئے حسنِ ارادہ اور خلوصِ نیت ضروری ہے۔ اور اخلاص کا اغراض واعواض کے شائبہ سے خالی ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ علم شریف کی طلب کی راہ میں آنا خدا اور رسول کی طرف ہجرت کرنے اور ان کی طرف مائل ہونے کے مترادف ہے۔ تو جس طرح راہِ خدا اور رسول میں آنے کیلئے خلوصِ نیت شرط ہے، اسی طرح یہاں بھی شرط ہے۔

تمامی ائمہ حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حدیث شریف، کثرتِ فوائد کے لحاظ سے فضل و شرف میں بڑا اونچا مقام رکھتی ہے اور اصولِ دین سے ایک اصل عظیم ہے۔ بعضوں نے تو اس کو نصف علم قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں:

۱۔۔ اعمالِ قلب ۲۔۔ اعمالِ قالب اور نیت

۔۔۔۔ ہر عمل قلب کی اصل ہے۔ اور اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ جملہ اعمال، خواہ عبادات سے ہوں یا عادات سے، بے نیت بارگاہِ الٰہی میں مقبول و معتبر نہیں اور ان پر کوئی ثواب مرتب نہ ہوگا، تو اس قول کی بھی گنجائش نکل آئے گی کہ یہ حدیث شریف تمام علم اور مجموع دین سے ہے۔ اس لئے کہ دین کا کوئی عمل نہیں جو بے نیت سود مند ہو۔

تمام علمائے دین اس حدیث کی صحت پر متفق ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ 'متواتر' ہے۔ جب

یہ معلوم ہوگیا کہ جملہ اعمال کے ثواب کا دارومدار نیت پر ہے، تو اب یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہوگا کہ وہ اعمال جن کا مقصود صرف ثواب ہو، وہ بغیر نیت غیر صحیح وناجائز ہونگے۔ اس لئے کہ جب ان اعمال سے ثواب کے سوا کوئی اور غرض نہیں، اور حصولِ ثواب بے نیت ممکن نہیں، تو پھران اعمال کا بغیر نیت کے عبث ونادرست ہونا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے اعمال کو 'مقصود لذاتہٖ' کہا جاتا ہے۔ رہ گئے وہ اعمال جو ثواب کے علاوہ کوئی اور غرض بھی رکھتے ہوں اور جن سے کوئی اور مقصد بھی متعلق ہو ۔۔۔الحاصل۔۔۔وہ 'بذاتہٖ' مقصود نہ ہوں بلکہ دوسرے مقصود کا وسیلہ بنتے ہوں، تو ایسے اعمال کا ثواب اگرچہ 'مشروط بہ نیت' ہے لیکن بے نیت بھی وہ جائز رہیں گے اگرچہ ثواب ان پر مرتب نہ ہو۔ چونکہ یہ اعمال مقاصد رکھتے ہیں تو ان کا وجود اپنے ہر ہر مقصد کے ضمن میں ہوجائے گا۔ اب اگر ان کا کوئی ایک مقصد حاصل نہ ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا دوسرا مقصد بھی حاصل نہ ہو۔ ایسے اعمال کو 'مقصود لغیرہٖ' کہا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسے 'وسیلۂ عمل دیگر' کہہ لیجئے۔۔۔۔ مثلا۔۔۔۔ نماز 'مقصود لذاتہٖ' ہے، اس سے صرف ثواب، یعنی 'تقرب الی اللہ' مقصود ہے۔ اور 'تقرب الی اللہ' کے مقصد کا نام 'نیت' ہے، تو اگر نماز میں یہ قصد نہ ہو، بہ لفظ دیگر نیت نہ ہو، پھر اس کا مقصد فوت ہوجائے گا اور وہ صحیح نہ ہوگی۔

'مقصود لغیرہٖ' کی مثال میں وضو کو لے لیجئے، چونکہ وضو سے مقصود نماز ہے، لہٰذا یہ بے نیت بھی صحیح وجائز ہوگا ۔۔۔الحاصل۔۔۔ 'وضو بے نیت' پر ثواب نہیں، لیکن اس سے نماز ہوجائے گی۔ اس امر کی طرف اشارہ گزر چکا ہے کہ 'نیت' سے یہاں 'قصد تقرب الی اللہ' مراد ہے۔ یعنی جو کام کرے خدا کیلئے کرے اور امتثالِ امر اور طلبِ رضائے الٰہی کو ملحوظِ خاطر رکھے تو نیت دل کے کام کا نام ہوا، زبان سے کہنا ضروری نہیں۔ فقہائے کرام کا ارشاد ہے کہ 'مستحب ہے کہ زبان سے بھی کہہ لیا جائے' تاکہ زبان دل کے موافق، اور ظاہر باطن کے مطابق ہوجائے۔ اگرچہ تلفظِ نیت صحتِ نماز کیلئے شرط نہیں، مگر نیت کے معنی کا تعقل اور اس کا دل میں استحضار ذکرِ الفاظ سے آسان ہوجاتا ہے۔ ہاں الفاظِ نیت کو بالجہر کہنا بالاتفاق نامشروع ہے۔

جب 'نیت' ارادۂ قلب کا نام ہے تو اگر کوئی ایسی شکل ہو کہ زبان پر نہ ہو یا زبان سے کچھ اس کے خلاف نکل جائے تو کوئی حرج نہیں:

وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی

مرد کو صرف اس عمل کا ثواب ملے گا جسکی اس نے نیت کی

بعض روایتوں میں یوں ہے کہ اِنَّمَالِکُلِّ امْرِءٍ یعنی لفظ 'کل' کا اضافہ ہے۔ یہ جملہ کلامِ سابق کی تاکید ہے۔ دونوں کا مآل ایک ہے کہ عمل بے نیت صحیح و معتبر نہیں اور ہر عمل کیلئے ایک نیت مخصوص ہے، تو ہر مرد کی قسمت میں اس عمل سے وہی ہے جس کی اس نے نیت، کی تو اگر کسی عمل سے متعدد نیتیں وابستہ ہوسکتی ہیں، تو اس میں جس جس کی نیت کی جائیگی، اس کا ثواب ملے گا۔۔۔مثلاً۔۔۔کسی ایسے فقیر کو کچھ دیا گیا جو اپنا قریب و خویش بھی ہو اور نیت صرف فقیر کی کی گئی، قرابت کا لحاظ نہ کیا گیا، تو صدقہ کا ثواب ملے گا، لیکن صلہ رحمی کا اجر نہ ملے گا۔ اور اگر قرابت کا خیال کیا اور فقیر کا لحاظ نہ کیا، تو صرف صلہ رحمی کا ثواب میسر ہوگا لیکن صدقہ کے ثواب سے محرومی رہے گی۔ اور اگر دونوں کا لحاظ کر لیا گیا، تو دونوں قسم کے ثواب سے بہرہ مندی ہوگی۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔ایک ہی شخص، ایک ہی عمل خیر سے متعدد نیتوں کے واسطے سے بہت سارے ثواب اکٹھا کر سکتا ہے۔۔۔۔مثلاً۔۔۔۔مسجد میں بیٹھنا ایک عمل ہے، اس سے متعدد نیتیں متعلق ہوسکتی ہیں اور ہر نیت پر ایک ثواب مرتب ہوتا ہے۔ مسجد میں بیٹھنے سے متعلق چند نیتوں کی طرف اشارہ کرتا چلوں:

﴿۱﴾۔۔۔حدیثوں سے ثابت ہے کہ مسجد خانہ خدا ہے، اور جو مسجد میں آتا ہے گویا اللہ کی زیارت و یافت کیلئے آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کریم ہے اور ہر کریم اپنے زائرین کی ضیافت کو اپنے ذمہ کرم پر رکھتا ہے۔ مسجد میں بیٹھنے کی ایک نیت یہ بھی ہے کہ اس فضیلت و کرامت کو پالیا جائے۔

﴿۲﴾۔۔۔حدیث صحیح ہے کہ جو نماز کا انتظار کرتا ہے وہ گویا نماز ہی میں ہے، اور اس نماز کو ادا کر رہا ہے جسکا وہ منتظر ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک آیۂ کریمہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ﴿سورۂ آلِ عمران: ۲۰۰﴾

اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر میں بڑھ جاؤ اور حفاظت ملک اسلامی کیلئے کمر بستہ رہو

۔۔۔۔میں 'مرابطت' سے یہی مراد ہے۔ حدیث میں ہے کہ نماز کے بعد نماز کا انتظار خطاؤں کے محو اور گناہوں کے کفارہ اور رفع درجات کا موجب ہے۔ مکرر ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ

۔۔۔۔مسجد میں نشست کی ایک نیت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نماز باجماعت کے انتظار کی سعادت حاصل کرنی ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ایک نیت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب ہم مسجد میں رہیں گے تو ہماری آنکھیں و ناک ۔۔۔نیز۔۔۔تمام اعضاء ان معاصی و منہیات سے محفوظ رہیں گے جو کوچہ و بازار میں ہوتے رہتے ہیں۔

﴿۴﴾۔۔۔ہر شخص کو چاہئے کہ جب جب مسجد میں آئے تو اعتکاف کی نیت کرے بقول اس

شخص کے جوفرماتے ہیں کہ مدت اعتکاف کم ازکم ایک ساعت ہے۔تو اعتکاف کی نیت سے مسجد میں بیٹھ کر اپنے کواس آسان ترین عبادت سے جسکی تحصیل سے عوام غافل ہیں، اپنے کو مشرف کیا جاسکتا ہے۔

﴿۵﴾۔۔۔حضور آیۂ رحمت ﷺ کی بارگاہِ بےکس پناہ میں صلوٰۃ وسلام کا نذرانہء محبت پیش کرنے کے مقدس ترین عمل کی نیت سے مسجد کی مقدس زمین کا انتخاب کیا جاسکتا ہے اور اسکے علاوہ دوسری ان دعاؤں کی نیت سے مسجد کا رخ کیا جاسکتا ہے جو مسجد میں داخل ہونے اور باہر ہونے سے متعلق مسنون و ماثور ہیں، اور بے شمار فضیلت وثواب کی حامل ہیں۔

﴿۶﴾۔۔۔مسجد میں بیٹھنے کی ایک نیت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن یا سماعت قرآن کیلئے تنہائی حاصل ہو۔یا ذکر خداوندی وغیرہ کی لوگوں کو ترغیب دی جائے اور مجاہد فی سبیل اللہ کا درجہ حاصل کیا جائے۔اسلئے کہ حدیثوں میں ہے کہ جو مسجد میں ذکر تذکیر کیلئے جاتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی مانند ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔روایتوں میں ہے کہ خانہء خدا میں تلاوت کرنے والے کے اِردگرد ملائکہ کا اجتماع ہوتا ہے اور رحمت خداوندی اس پر جلوہ گستر ہوتی ہے۔

﴿۷﴾۔۔۔بہ قصد حصولِ ثواب حج وعمرہ بھی مسجد میں آنا ہوسکتا ہے۔جیسا کہ روایتوں میں ہے جو باوضو مسجد میں جائے اور نماز پڑھے اسکو حج وعمرہ کا ثواب ملتا ہے بالخصوص مسجد نبوی شریف میں۔

﴿۸﴾۔۔۔مسجد میں اس نیت سے بھی آیا جاسکتا ہے کہ چونکہ مسجد میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے لہٰذا علم دین کے افادہ واستفادہ اور امر معروف ونہی منکر کا اچھا موقع میسر ہوتا ہے۔

﴿۹﴾۔۔۔بہ قصد زیارت برادر دینی جو راہِ خدا میں مددگار ہو مسجد کا رُخ کیا جاسکتا ہے۔

﴿۱۰﴾۔۔۔اس ارادہ سے بھی مسجد میں جاسکتے ہیں کہ اس طرح سے مسجد میں رہنے والوں اور آنے والوں کو سلام کرنے کا موقع میسر آئے گا۔

﴿۱۱﴾۔۔۔چونکہ مسجد میں جمعیت خاطر اور حصول فراغ ہوتا ہے، لہٰذا تفکر و مراقبہ وقوتِ فکریہ کی امور آخرت کی طرف توجہ اور تقصیرات سے استغفار کے ارادہ سے آسکتے ہیں۔

﴿۱۲﴾۔۔۔مسجدیں چونکہ اللہ تعالیٰ کی خاص تجلی گاہ ہیں اور خدا کی طرف ان کی نسبت ہے لہٰذا انکی روحانیت سے ایک ایسے ذوق ونورانیت کا حصول ہوگا جس سے مشاہدۂ حق سے اتصال اور ذاتِ مطلق کے شہود میں استغراق کی کیفیت حاصل ہوگی۔۔۔۔نیز۔۔۔۔باطن کا حضور اور دل کا سرور میسر ہوگا۔۔۔مزید برآں۔۔۔۔مسجد میں دخول تو خود اعمال آخرت سے ہے اور مسجد محل عبادت ہے۔۔۔۔الحاصل۔۔۔اس نیت سے بھی مسجد میں دخول ہوسکتا ہے۔

ان اعمال مذکورہ اور انکے امثال ونظائر کو تو جانے دیجئے، نیت خیر اگر اعمال طبعی وشہوانی سے متعلق ہو جائے تو اسکا بھی اجر وثواب ملتا ہے۔۔۔۔مثلاً: خوشبو جمعہ کے دن یا کسی بھی دن لگانا۔

﴿۱﴾۔۔۔بہ قصد اتباعِ سنت رسول اللہ ﷺ کہ آپ خوشبو کو محبوب رکھتے تھے۔

﴿۲﴾۔۔۔بہ قصد تعظیم مسجد اور بدبو کے دفع کے ارادے سے تاکہ اپنے یا دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔۔۔نیز۔۔۔جو لوگ یا ملائکہ اسکے جلیس وہم نشین ہوں انکو راحت وسکون حاصل ہو۔

﴿۳﴾۔۔۔بہ قصد سد باب غیبت یعنی بدبو کی وجہ سے جو اس کی غیبت کر کے معصیت میں مبتلا ہوسکتا تھا اب وہ اسکی معصیت سے محفوظ رہے گا۔ جب اس میں بدبو نہ رہے گی تو پھر کوئی اسکی بدبو کا ذکر بھی نہ کرے گا۔اور گناہِ مذکور کا ارتکاب بھی نہ کرے گا۔

﴿۴﴾۔۔۔بہ قصد معالجہء دماغ: تاکہ دماغ تازہ ہو، فطانت وذکاوت زیادہ ہو اور علوم و معارف کا درک حاصل ہو، وغیرہ وغیرہ۔

اسکے برخلاف اگر محض لذاتِ جسمانی وشہوات نفسانی اور خود نمائی کیلئے خوشبو لگاتا ہے تو ثواب سے محروم رہے گا۔ بلکہ مستحق ملامت وعتاب ہوگا۔ان تفصیلات سے یہ امر واضح ہو گیا کہ ہر کام کا دارو مدار اور ثواب کا حصول نیت پر ہے۔

فوائد

نصوصِ شرعیہ جس کی حلت وحرمت کے بارے میں خاموش ہوں اور کہیں اس عمل کے حلال وحرام ہونے کی تصریح نہ ملے، ایسے عمل کو 'عمل مباح' کہیں گے جس کا کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔اسی مقام پر یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ تمام اشیاء کی اصل 'اباحت' ہے۔اِس کا مطلب یہی ہے کہ جس عمل کو اللہ ورسول نے حرام وحلال نہ فرمایا ہو اس عمل کو 'مباح' کہیں گے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔کسی عمل کو حلال یا حرام کہنا اس عمل کی اصل کے خلاف ایک حکم دینا ہے اور اصل کے خلاف کوئی حکم لگانے سے پہلے دلیل کی ضرورت ہے۔اس دلیل دینے کا ذمہ دار وہی ہے جو ایسا حکم لگائے۔اگر نصوصِ شرعیہ میں اس کی کوئی دلیل نہیں تو وہ عمل اپنی اصل پر رہتے ہوئے 'مباح' رہے گا۔یہیں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو کسی عمل کو 'مباح' کہے اس کے ذمہ کوئی دلیل نہیں۔ اب اگر اس سے کوئی دلیل کا مطالبہ کرے تو یہ کھلا ہوا فریب ہے۔

'عمل مباح' سے 'نیت خیر' بھی متعلق ہوسکتی ہے اور 'نیت شر' بھی۔ اچھی نیت سے وہ عمل مباح مستحب و مستحسن ہوجاتا ہے اور نیت شر سے ناجائز وحرام۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔جس درجہ کی نیت ہوگی اس درجہ کا حکم دیا جائے گا۔۔۔۔مثلاً: کھڑا ہونا یہ ایک 'عمل مباح' ہے لیکن اگر کوئی اِس ارادہ سے کھڑا ہو کہ طاق پر قرآن شریف رکھا ہوا ہے اور اسے اتار کر تلاوت کرنی ہے، تو ایسی صورت میں یہ 'قیام مباح' 'قیامِ مستحسن' ہوجاتا ہے۔ اور اگر اس نیت سے کھڑا ہو کہ طاق سے شراب کی بوتل اتار کر آلودۂ معصیت ہونا ہے، تو ایسی صورت میں یہ 'قیام مباح' 'قیام حرام' ہوگا۔ اور اگر کسی قسم کی کوئی نیت نہ ہو، تو یہ قیام 'مباح' رہے گا جس کے کرنے سے کوئی ثواب نہیں اور نہ کرنے سے کچھ گناہ نہیں۔

۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔عمل مباح سے متعلق کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے، نیت عمل کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص فضول خرچی کرتا ہے اور بلاضرورت روپیہ وغیرہ پانی کی طرح بہاتا ہے، تو اس سے کہا جائے گا:

لَاخَیۡرَ فِی الۡاِسۡرَافِ

'دیکھ فضول خرچی میں کوئی بھلائی نہیں'

۔۔۔لیکن اگر وہ کسی عظیم مقصد اور نیک نیتی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ہاتھ کو کھولے ہوئے ہے، تو اس سے کہا جائے گا:

لَااِسۡرَافَ فِی الۡخَیۡرِ

امرِ خیر اور عظیم مقصد کے حصول کیلئے کتنا بھی خرچ کردیا جائے، فضول خرچی نہیں

۔۔۔۔دیکھئے نیت کے فتور کا وہ نتیجہ تھا اور نیک نیتی کا یہ انجام ہے۔ فائدہ کے ضمن میں جو امور ہیں انکا لب لباب یہ ہے۔

﴿۱﴾۔۔۔ہر چیز کی اصل مباح ہونا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ہر مباح چیز، بہ نیت حسن، مستحسن ہوجاتی ہے اور اس پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔امر مستحسن کے حصول کیلئے کتنا بھی خرچ ہوجائے وہ فضول خرچی نہیں۔۔۔۔لہٰذا فاتحہ، ایصالِ ثواب، تیجہ، چالیسواں، عرس، آستانہ جات اولیائے کرام پر حاضری، ان کے مزاراتِ مقدسہ پر صندل و چادر پوشی، عطر پاشی و گل پوشی، آستانے پر قبہ جات کی تعمیر، بزمِ ذکر میلاد اور اس کی جملہ آرائش، قیام تعظیمی، وغیرہ مِنۡ اَمۡثَالِھَا وَنَظَائِرِھَا کو ان کی حقیقت اور اصلیت پر نظر رکھتے ہوئے 'مباح' ماننے کے باوجود 'امر مستحسنہ' سے شمار کریں گے۔ اسلئے ان تمام کے ساتھ نیک نیتی اور عظیم مقاصد وابستہ ہوچکے ہیں۔ اب ان امور کے انجام دینے کیلئے کچھ بھی خرچ کیا جائے اسراف

کے حکم میں نہ ہوگا۔ بلکہ جتنی عظیم نیت کے پیش نظر یہ اعمال انجام دیئے جائیں گے، اتنے ہی عظیم فوائد اور ثواب ان پر مرتب ہوں گے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کی حقیقت تسلیم کر لینے والے کیلئے گنجائش نہیں کہ وہ مذکورہ بالا 'امورِ مستحسنہ' کے انجام دینے والوں پر طعن و تشنیع کرے۔ ان حقائق کے واضح ہو جانے کے بعد یہ طعن و تشنیع، حدیث رسول سے انکار کے مرادف ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف اسی حدیث شریف کو سمجھ لینے کے بعد اختلافی مسائل کی بہت ساری گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

حدیث مذکور کے پہلے حصے یعنی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی میں نیت کے مدارِ ثواب ہونے کا ذکر بطریق اجمال اور بطور قاعدۂ کلیہ ہے۔ اسی کو دوسرے حصے میں مثالِ جزئی دے کر سمجھایا ہے:

فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَاِلٰی رَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ

۔۔۔۔تو جسکا اپنے وطن کا چھوڑنا اللہ و رسول کی رضا اور ان کے احکام بر لانے کیلئے ہے، تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کیلئے ہے۔ یعنی اللہ و رسول کی بارگاہ میں مقبول ہے اور اس پر ثوابِ عظیم مرتب ہوگا۔ اور جس شخص کی ہجرت دنیا کی طرف ہے تاکہ اسے دنیا حاصل ہو، یا کسی عورت کیلئے ہے کہ وہ اس سے نکاح کرے، اور اس میں خدا اور رسول کی رضا اور انکے کسی امر کی بجا آوری کا پہلو نہ ہو، تو اس کی ہجرت اس کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے، یعنی دنیا یا کسی عوت سے نکاح کرنا۔

ا۔۔۔۔بعض روایتوں میں حدیث کے الفاظ اِلَی الدُّنْیَا کے بجائے لِدُنْیَا ہے۔ دونوں کا حاصل ایک ہے۔

۲۔۔۔۔فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ فرمایا ہے۔ اور تحصیل دنیا یا تزویج ان کا ذکر بہ صراحت اس دوسری عبارت میں نہیں کیا، بخلاف اسکے اللہ و رسول کا ذکر مکرر فرمایا ہے۔ اسلئے کہ 'دنیا' و 'زن' کے ذکر کی تکرار طبع خدا رسا پر مکروہ معلوم ہوتی ہے، بخلاف خدا و رسول کے ذکر کے، جس میں ایک لذت اور چاشنی ہے۔

۳۔۔۔۔مجمل ذکر کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ اس صورت میں یہ ایک قاعدۂ کلیہ کی طرح تمام ان امور کو شامل ہو جائے گا، جس کی طرف ہجرت کی جائے ۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ایسی شکل میں وہ صورتیں بھی اس میں داخل ہو جائیں گی جس میں 'حصول دنیا' اور 'تزوّج زن' کے ساتھ ساتھ 'رضائے حق' اور 'امتثال امر' کی بھی نیت ملی ہوئی ہو۔ یہ آخری صورت بھی حصولِ ثواب سے خالی نہیں۔ بقدرِ نیت اس پر بھی ثواب مرتب ہوگا۔لیکن ظاہر حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ شرکت کی صورت میں ثواب کا ترتب نہ ہوگا۔ ہاں اگر نیتِ حق غالب ہو، تو ثواب کی توقع ہے ۔۔۔ ﴿وَاللّٰہُ اَعْلَمُ﴾

۴۔۔۔۔یہاں دنیا سے مراد ہر وہ شے ہے، جو ماسوائے حق ہو اور خدا سے غافل کر دینے والی ہو۔ چونکہ مردوں کا فتنوں اور ابتلا و آزمائش میں پڑنا عورتوں کے سبب بیشتر و سخت تر ہے۔ یہاں تک کہ سلوک راہ دین اور ذکر خدا کے مواقع میں عام انسانوں کیلئے ایک سخت ترین مانع عورتیں ثابت ہوتی ہیں۔لہٰذا ذکر دنیا کے باوجود ان کا الگ مستقل ذکر کر کے تحذیر و تخویف کی زیادتی مقصود ہے، گو یہ بھی دنیا ہی میں شامل ہے۔

۵۔۔۔۔عورتوں کے ذکر کی ایک قریب ترین وجہ یہ بھی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے اہل عرب نسبی عصبیت میں شدت کے ساتھ مبتلا تھے، اپنے نسب والوں کے سوا دوسرے نسب والوں کو اپنا کفو نہیں سمجھتے تھے، لیکن جب خورشید اسلام طلوع ہوا اور عربی عصبیت کم ہوئی تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنے برابر سمجھنے لگا اور 'بابِ مناکحت' میں پرانی عصبیت ختم ہوگئی، تو کچھ لوگوں نے مدینہ منورہ عورتوں سے نکاح کی غرض سے بھی ہجرت کی تو سرکار نے یہ حدیث فرمائی اور عورتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ موقع کی مناسبت کے پیش نظر فرمایا۔

۶۔۔۔۔لغت میں ہجرت 'ترک و قطع' کو کہتے ہیں اور عرفِ شرع میں ایک زمین چھوڑ کر طلب رضائے حق کیلئے دوسری زمین پر جا بسنے کو ہجرت کہتے ہیں۔

۷۔۔۔۔اس حدیث شریف میں ہجرت سے مراد وطن سے غیر وطن کی طرف منتقل ہو جانا ہے، خواہ وہ مکہ ہو یا اس کے علاوہ مدینہ ہو، یا اس کے سوا۔ طلب رضائے حق کیلئے ہو یا طلب رضائے حق کیلئے نہ ہو۔ایسی صورت میں یہ ہجرت 'دنیا' 'زن' کی طرف ہجرت کو شامل ہو سکتی ہے۔

۸۔۔۔۔اسلام میں دو طریقہ کی ہجرت واقع ہو چکی ہے۔۔۔۔اوّل۔۔۔۔دارِ خوف سے دارِ امن کی طرف، جیسے مشرکان مکہ کے شر و فساد کے خوف سے ابتدائے اسلام میں بعض صحابہ کا حبشہ کی طرف ہجرت کرنا یا بعض کا مکہ سے مدینہ کی طرف رسول ﷺ کی ہجرت اور امر اسلام کے استقرار سے

پہلے منتقل ہو جانا۔۔۔۔دوسرے۔۔۔۔دارِ کفر سے دارِ اسلام کی طرف، جیسے حضور آیۃ رحمت ﷺ کے مدینہ شریف میں تمکن واستقرار کے بعد مسلمانوں کا مکہ شریف سے یا اسکے علاوہ کسی اور جگہ سے مدینہ شریف کی طرف ہجرت کرنا، اس وقت باعتبار غالب، مکہ سے مدینہ کی طرف مخصوص کردی گئی تھی، لیکن فتح مکہ کے بعد جب مکہ دارالاسلام ہو گیا، اس اختصاص کو ختم فرمادیا گیا۔بعض حدیثوں میں:

لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں

۔۔۔۔آیا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت نہیں ہے۔اس لئے کہ اب یہ دار الاسلام ہو گیا ہے۔

اب رہ گئی اصل ہجرت، یعنی دارِ کفر سے منتقل ہونا، تو اس کا حکم آج سے لیکر قیامت تک کیلئے باقی رکھا گیا ہے، ہر اس شخص کیلئے جو اس پر قادر ہو۔حضور آیۃ رحمت ﷺ کے اس قول مبارک سے یہی مراد ہے، فرمایا ہے:

لَاتَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ

ہجرت اس وقت تک منقطع نہ ہوگی اور اس کا حکم اس وقت تک برطرف نہ کیا جائے گا، جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو جائے، اور اس کا دروازہ نہ بند کر دیا جائے۔

۹۔۔۔۔ہجرت کے ایک خاص معنی اور بھی ہیں جس کو 'ہجرت حقیقی' اور 'ہجرت کبریٰ' کہا جائے تو نامناسب نہیں۔ وہ ہے 'موطن طبیعت' سے 'مدینہ شریعت' کی طرف منتقل ہو جانا۔ اور 'منہیات و مکروہات شرعیہ' کی دنیا سے اپنے کو الگ کر کے 'اطاعت مصطفوی' کے عالم میں بس جانا۔

۔۔۔۔حدیث میں آیا ہے:

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ

۔۔۔یعنی۔۔۔

مہاجر حقیقی اور کامل ہجرت کرنے والا وہ ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ چکا ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو۔

۔۔۔۔تو جیسے 'جہادِ نفس'، 'جہادِ اکبر' ہے، تو اسی طرح 'ہجرت از خواہشاتِ نفس'، 'ہجرتِ کبریٰ' ہے۔

۱۰۔۔۔۔حدیث شریف میں ہے:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهٖ

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے

یہ حدیث اگر چہ اصطلاحِ محدثین میں صحیح نہیں ہے، لیکن اسکو موضوع بھی نہیں کہا گیا ہے۔ اسکی توضیح میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

﴿الف﴾۔۔۔نیت تنہا بغیر اقتران عمل بھی عبادت ہے اور اس پر ثواب مرتب ہوتا ہے، بخلاف عمل جوارح کے، اسلئے کہ یہ سارے عمل حصولِ ثواب میں محتاجِ نیت ہیں۔

حدیثوں میں آیا ہے کہ محض اچھی نیت اور اچھے ارادہ کو کامل نیکی میں شمار کرلیا جاتا ہے۔۔۔۔نیز ۔۔۔حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر سونے والا یہ نیت کر کے سوئے کہ مجھے تہجد کی نماز کیلئے بیدار ہونا ہے، تو اس کیلئے تہجد کا ثواب لکھ لیا جاتا ہے، اگر چہ غلبۂ خواب کے سبب وہ صبح تک بیدار نہ ہو سکے، اور اس سے تہجد فوت ہو جائے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی حکایتیں ہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ بہت ساری حدیثیں ہیں۔

﴿ب﴾۔۔۔نیت کا محل دل ہے اور دل مکان معرفت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو محل معرفت سے پیدا ہو اور اس معدن ومخزن سے نکلے، وہ اس سے فاضل اور شریف تر ہوگا جو اس کے غیر سے حاصل ہو۔

حضرت سہیل بن عبداللہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: آپ نے فرمایا ہے کہ عرش سے فرش تک کوئی مکان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن کے دل سے زیادہ عزیز نہیں، اس لئے کہ خدائے عزوجل نے پوری مخلوق کو جتنے عطیہ اور جتنی کرامتیں عطا فرمائیں ہیں، اس میں اس کی معرفت سے بڑھ کر اور عزیز تر اس کے نزدیک کوئی نعمت نہیں۔ اسلئے تو اپنی اس عزیز ترین نعمت، یعنی معرفت کو رکھنے کیلئے اس عزیز ترین مقام، یعنی دل مومن کا انتخاب کیا، اور اس میں یہ دولت بے بہار رکھی۔ اگر دلِ مومن سے زیادہ عزیز خدا کے نزدیک کوئی اور مقام ہوتا، تو وہ اپنی معرفت کو اسی مقام پر رکھتا، یہاں نہ رکھتا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔حضرت موصوف نے فرمایا کہ بندہ کی خسیس ترین ہمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو عزیز ترین مکان ہو، اس کو ذکر حق سے خالی رکھے، اور بے ادب وہ شخص ہے، جو دل میں اللہ کی رکھی ہوئی نعمت معرفت کو نکال دے اور اس کی جگہ دوسری چیز لائے۔

﴿ج﴾۔۔۔نیت عمل سے بہتر ہے، اسلئے کہ نیت پائدار اور باقی رہنے والی چیز ہے اور عمل ناپائدار اور فانی ہے۔ جنتیوں کا ہمیشہ جنت میں رہنا اور دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا، نیت کے سبب ہے جو دائمی ہے۔ اگر مذکورہ بالا انجام بقدر عمل ہوتا، تو اسی زمانہ کے مقدار میں ہوتا، جتنے زمانہ تک عمل کیا ہے۔

﴿د﴾۔۔۔عمل میں ریاء عارض ہوجاتی ہے،جسکی وجہ سے عمل فاسداور بیکار ہوجاتا ہے بخلاف نیت خیر کے، اسلئے کہ یہ امر باطن سے ہے جہاں ریاء کا گزر نہیں۔بعض آثار سے ثابت ہے کہ جب ملائکہ بندوں کے اعمال بارگاہِ حق میں پیش کرنے کیلئے جاتے ہیں، تورب تعالیٰ انکے بعض سے فرماتا ہے:

اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ اَلْقِ تِلْكَ الصَّحِيْفَةَ

اس صحیفہ کونظر انداز کردو

۔۔۔فرشتہ عرض کرتا ہے، الٰہ العالمین! تیرے بندے نے اچھی بات کہی اوراچھا عمل کیا،اسکو میں نے سنا دیکھااور پھر نیکیوں کے دفتر میں لکھ لیا، توجو بات کان سے سنی اور آنکھ سے دیکھی ہو،اسکو کیسے نظرانداز کروں۔۔۔۔ارشادِ باری ہوتا ہے:

لَمْ يُرِدْ بِهٖ وَجْهِيْ

اس بندے نے اس عمل سے میری رضا نہیں چاہی ہے

۔۔۔۔اور بعض فرشتوں سے ارشادفرماتا ہے:

اُكْتُبْ لِفَلَانٍ كَذَا كَذَا

یعنی فلاں بندے کے نامۂ اعمال میں عمل خیر لکھو

۔۔۔فرشتہ عرض کرے گا، الٰہ العالمین اس بندہ نے تو کچھ بھی عمل نہیں کیا، تو پھر کیا اور کیسے لکھوں؟ خطاب آتا ہے کہ اس نے نیت خیر کی ہے اور عمل خیر کا ارادہ کیا ہے۔

﴿ہ﴾۔۔۔اعمال خیر بے شمار ہیں اور مومن کی نیت کا سب سے تعلق ہے۔اگر بندہ چاہے تو سب کی نیت کر کے جملہ اعمال کی نیتوں کو وجود میں لے آئے، لیکن تمام اعمال کا وجود میں لانا ناممکن ہے۔

۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔اعمال بے شمار کی نیت کرنا آسان ترین ہے، لیکن بیشمار عمل کرنا دشوار ترین ہے، تو پتہ چلا کہ نیت کے ثواب کی کوئی حد نہیں اور ساری نیکیاں اور عبادتیں اپنی نیتوں میں محدود و منحصر ہیں۔اس قیاس پر کہا جاسکتا ہے کہ:

نِيَّةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِّنْ عَمَلِهٖ

کافر کی نیت اسکے عمل سے زیادہ بری ہے

۔۔۔اسلئے کہ کافر کیلئے تمام معاصی کی نیت کا وجود تو ممکن ہے، اور پھر اس پر بیشمار عذاب گناہ متفرع، لیکن اسکا عمل بہرحال محدود ومنحصر ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔اس کیلئے جملہ اعمال کا وجود میں لانا ناممکن ہے۔

فوائد

ا۔۔۔۔حدیث کے الفاظ اگر اسی قدر ہوتے:

فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ

۔۔۔۔تو بھی اصل مقصود پر کوئی اثر نہ پڑتا، لیکن اللہ کے نام کے ساتھ 'وَرَسُوْلِهٖ' فرما کر اور رسولِ کریم کا نام ملا کر واضح کر دیا کہ ہر 'ہجرت الی اللہ'، 'ہجرت الی الرسول' ہے۔ ایسے ہی ہر 'ہجرت الی الرسول'، 'ہجرت الی اللہ' ہے۔ ان دونوں میں کوئی مغایرت نہیں۔

۲۔۔۔۔یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ:

فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

۔۔۔۔لیکن ایسا نہیں فرمایا گیا! بلکہ 'مشکوٰۃ المصابیح' کے اس نسخے میں جسکی طرف 'اشعۃ اللمعات' نے واضح اشارہ کیا ہے اور جو نسخہ شیخ محقق کے زیر نظر تھا اس میں جس طرح 'اللہ' سے پہلے لفظ 'الی' لایا گیا ہے، اسی طرح 'رسولہ' سے پہلے لفظ 'الی' کا ذکر فرمایا گیا ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ ہجرت کا تعلق اللہ و رسول دونوں سے بالاستقلال ہے۔ یعنی قرآن جس طرح رضائے الٰہی کیلئے ہجرت کا مطالبہ کرتا ہے اسی طرح رضائے رسول کیلئے بھی ہجرت کا طلب گار ہے۔ اب رہ گیا دوسروں کی رضاء کیلئے ہجرت کرنا! تو یہ اسی وقت نگاہِ شریعت میں پسندیدہ ہو سکے گا، جبکہ ان کی رضا اللہ و رسول کی رضا کی پابند و ماتحت ہو۔ اس مفہوم کی وضاحت اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

۔۔۔۔ارشادِ ربانی ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴿سورۃ النساء:۵۹﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور علماء مجتہدین کی

۔۔۔۔اللہ و رسول کی اطاعت چونکہ مستقل حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔بایں معنی۔۔۔۔کہ ایک کی اطاعت دوسرے کی اطاعت ہے۔ ایک کی اطاعت کا انکار دوسرے کی اطاعت کا انکار ہے۔ اسی لئے لفظ **اَطِيْعُوا** کی تکرار فرمائی گئی، بخلاف **اُولِی الْاَمْرِ** کی اطاعت، جو اللہ و رسول ﷺ کی تابع ہے۔

خیال رہے کہ رسول کی اطاعت اگرچہ اطاعت الٰہی کے بعد ہے، لیکن اطاعت الٰہی کے تابع نہیں ہے۔ بعد ہونا اور ہے، تابع ہونا اور ہے۔ اگر ہمیں کسی حکم کو دیکھنا ہوگا، تو پہلے قرآن کریم کو دیکھیں گے، وہاں نہ ملا تو پھر حدیث رسول پر نظر کریں گے۔ اس میں بھی صراحت نہ ملی تو اجماع اور پھر قیاس مجتہد کی طرف توجہ مبذول کریں گے۔ بشرطیکہ یہ اجماع وقیاس پابند ہوں، ان اصولوں کے جن کا استنباط قرآن وحدیث سے کیا گیا ہے۔ لہٰذا اجماع وقیاس قرآن وحدیث کے احکامات کے ناسخ نہیں ہو سکتے۔ یہی دلیل ہے ان دونوں کے تابع ہونے کی۔ بخلاف حدیث شریف کے، کہ اگر اس کے لبہائے نبوت سے نکلنے کا ثبوت شہرت وتواتر سے ثابت ہو، تو وہ قرآن کے احکام کیلئے ناسخ بھی ہو سکتی ہے۔ اب رہ گئیں بعض حدیثیں جن سے نسخ قرآن جائز نہیں، تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان حدیثوں کے حدیث رسول ہونے کا ثبوت اس پایہ کا نہیں ہے، جس پائے کا ثبوت نسخ کتاب کیلئے درکار ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔نسخ کتاب بالحدیث کا اصولِ مسلمہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اطاعت مصطفیٰ کی ایک مستقل حیثیت ہے کہ ہمارے سرکارِ عربی کو اس بات کا پابند نہیں کیا گیا ہے کہ ان کی انھیں باتوں میں اطاعت کی جائے جن کا ثبوت قرآن سے ہو، بلکہ رسولِ کریم کو اختیار دیا گیا ہے کہ جس چیز کو چاہیں حرام فرمادیں اور جس چیز کو چاہیں حلال، اور امت کو پابند کر دیا گیا ہے کہ رسول کے ہر حکم کی اطاعت کریں اور یہ نہ دیکھیں کہ آخر اس کے بارے میں قرآن نے کیا فرمایا ہے۔

'مسند امام احمد' میں ایک صحیح حدیث ہے جس کے سارے راوی ثقہ ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں اس شرط پر ایمان لائے اور اسلام قبول کیا کہ صرف دو ہی وقت کی نماز پڑھیں گے۔ حضور نے اس کو قبول فرمالیا۔ غور فرمایئے کہ قرآن کریم میں پانچ وقتوں کی نماز کی صراحت کے باوجود، رسول کریم کا ایک فردِ خاص سے دو ہی وقتوں کی نماز کا قبول کر لینا کیا یہ نہیں بتاتا ہے؟ کہ رسول عربی کو شرعی اختیارات منجانب اللہ عطا فرمائے گئے ہیں۔ رسول کریم کے شرعی اختیارات کو سمجھنے کیلئے، 'اَلتَّحقِیقُ البَارِعُ فِیْ حُقُوقِ الشَّارِعِ' مرتبہ حضور محدث اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان۔

۔۔۔نیز۔۔۔مزید تفصیل وتحقیق کیلئے 'الامن والعلی' للمجدد المائۃ الحاضرۃ الامام احمد رضا رضی اللہ عنہ ملاحظہ فرمایئے۔ رسول ﷺ کے یہ سارے تشریعی اختیارات بتا رہے ہیں کہ رسول کریم کی اطاعت، بعد اطاعت الٰہی تو ضرور ہے، لیکن اطاعت الٰہی کے تابع نہیں، جیسا کہ اجماع و قیاس، قرآن وحدیث کے تابع ہیں۔

۳۔۔۔جب دنیا سے مراد ہر وہ شے ہے جو ماسوائے حق ہو اور خدا سے غافل کر دینے والی

ہو،تو ترک دنیا سے مراد ہر وہ شے سے کنارہ کشی اختیار کر لینا ہے جو خدا سے غافل کر دینے والی ہو۔لہٰذا اگر کوئی پہاڑوں کی چوٹیوں پر، غاروں میں، اور جنگلوں میں دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر تنہائی کی زندگی بسر کرے، لیکن خدا سے غافل ہو، تو وہ اسلامی نقطہ ءنظر سے 'تارک الدنیا' نہیں ہے۔ برخلاف اس کے، اگر کوئی آبادیوں میں رہے، بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرے، دنیا کی ہر نعمت سے فائدہ حاصل کرے۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔دنیا کے ہنگاموں سے اپنے کو الگ نہ کرلے۔۔۔۔بہ ایں ہمہ۔۔۔۔ اس کا دل خدا سے غافل نہ ہو، اور اس کے قلب وقالب حدودِ شرعیہ سے متجاوز نہ ہوں، تو وہ دنیا میں رہ کر بھی 'تارک الدنیا' ہے۔ایسے 'تارک الدنیا' اُن ترکِ دنیا کرنے والوں پر فضیلت رکھتے ہیں، جو دنیاوی ہنگاموں سے الگ رہ کر خدا کی یاد کررہے ہیں۔اور عقیدۃً ،عملاً شریعت سے غافل نہیں ہیں۔

ترک دنیا کے مذکورہ بالا مفہوم سے ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا بے خبر تھی۔لیکن جب خورشید اسلام طلوع ہوا، تو دنیا 'ترک دنیا' کے ایک اعلیٰ ترین مفہوم سے روشناس ہوئی۔اسلام سے پہلے ترکِ دنیا کا صرف یہی ایک مفہوم سمجھا جاتا تھا کہ دنیا سے اپنے کو الگ کرلو اور جنگلوں میں چلے جاؤ۔ آبادیوں کو چھوڑ دو، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرلو۔شادی بیاہ سے اپنے کو بچاؤ۔عورتوں کو عذاب محض تصور کرلو۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی نعمت سے کنارہ کش ہو جاؤ۔خلاصہ ء کلام یہ کہ اپنی حیوانیت کے فطری تقاضوں کا بالکلیہ گلا دبادو۔ اسلئے کہ انھیں تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے بعد روحانیت کا فروغ ہوسکتا ہے۔نام نہاد مصلحین انسانیت نے اس ضابطہ کو بناتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ، انسان مرکب ہے روحانیت اور حیوانیت سے، اسلئے اس کی فطرت سے وہی اصول میل کھاسکتا ہے جو ارتقاء روحانیت کے ساتھ ساتھ حیوانی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔

ان حقائق کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ وہی اصول زندگی انسانی حیات کیلئے مفید ہوسکتا ہے، جو اس کے تمام فطری تقاضوں کو کامل اعتدال کے ساتھ پورا کررہا ہو۔نہ تو وہاں دکھتی تڑپتی انسانیت کو سکون مل سکتا ہے، جہاں جذبات کو یکسر پامال کیا جارہا ہوا، ورنہ وہاں انسانیت نکھر سکتی ہے جہاں تہذیب وتمدن کا سوال اٹھ گیا ہو۔ یوں ہی نہ کلیسائی رہبانیت دکھی انسان کا علاج ہے، اور نہ ہی آج کی مادہ پرستی میں قلب وروح کا سکون ممکن ہے۔اربابِ کلیسا ہوں یا آج کے مادہ پرست فلاسفر، دونوں ہی نے انسان کے سمجھنے میں غلطیاں کیں۔ایک نے صرف اسکی روحانیت کو دیکھا اور دوسرے نے محض اسکے مادی پہلوؤں پر غور کیا۔ایک نے کہا انسان فرشتہ ہے، دوسرے نے کہا درندہ ہے۔ حالانکہ انسان نہ صرف روح ہے اور نہ صرف مادہ۔ بلکہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔پس ضروری ہے کہ اس

کے سامنے وہ نظریہء حیات پیش کیا جائے جو اس کے حیوانی اور روحانی تقاضوں کو کامل اعتدال کے ساتھ پورا کر رہا ہو۔ اور میں پوچھتا ہوں کیا وہ دین اسلام کے علاوہ اور کوئی دین ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اربابِ کلیسا نے کہا انسان دراصل فرشتہ ہے، لہٰذا اس کو اپنے اندر ملکوتی شان پیدا کرنی چاہئے، بلکہ کوشش کر کے صفوفِ ملائکہ ہی میں شریک ہوجانا چاہئے۔ یہ حیوانی خواہشات اس کیلئے عذاب ہیں۔ زن وشوہر کے تعلقات ختم کر دینے چاہئیں، یہی اس کے دکھ درد کا علاج ہے۔ رہبانیت الفاظ کے خوشنما پردوں میں چاہے کتنی ہی دل کش کیوں نہ نظر آئے، لیکن نفسیات کا ماہر اسے زندگی کے گوناگوں مسائل کا حل نہیں قرار دے سکتا۔ کسی بھی فطری جذبہ کو صحیح راہ پر لگایا جاسکتا ہے، فنا نہیں کیا جاسکتا۔ فرض کیجئے ہماری آبادیوں کی طرف کوئی سیلاب پوری ہولنا کیوں کے ساتھ بڑھتا چلا آئے، بتایئے اس کا علاج کیا ہوگا؟ کیا موجوں کو لوریاں دے کر سلایا جاسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ موجوں کا رخ آبادیوں سے ویرانوں کی طرف موڑ دو۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ آبادیاں ویران نہ ہونگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ویرانے آباد ہوجائیں گے۔ صحرا لہلہا اٹھیں گے۔ یونہی انسانی جذبات کو فنا کرنے کی کوشش نہ کرو، ورنہ نتائج ہولناک ثابت ہوں گے۔ کوہِ آتش فشاں کے بے قرار شعلوں کو اگر راہ نہ ملی، تو زلزلے ضرور آئیں گے۔ تباہیاں یقیناً پھیلیں گی۔

انسانی جذبات کو فنا کردینے کا بالآخر وہی انجام ہوکر رہا، جس کی توقع تھی۔ خواہشات کے تیز وتند سیلاب میں عیسائیت کا ایوانِ اخلاق بہہ گیا۔ کہا تو یہ گیا تھا کہ شادی نہ کرو، تجرد کی زندگی گزارو، کیونکہ تم فرشتہ ہو، لیکن کلیسائی نام نہاد مقدس فضا میں انسانیت کا وہ عریاں رقص ہوا کہ جس کی مثال قحبہ خانوں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ ہر طرح کے گناہ ہوتے رہے، لیکن مجرم سزا سے بے نیاز رہا، کیونکہ وہ فرشتہ ہے اور فرشتہ کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ اتنا ہی کافی ہے کہ وہ پوپ اعظم کے سامنے اعترافِ جرم کرتا جائے اور وہ لطف لے لیکر تفصیلات پوچھتے جائیں۔۔۔۔ حاصل کلام۔۔۔۔ اسلام نے ارتقائے روحانیت کیلئے ترک دنیا کا جو مفہوم سمجھایا ہے، وہی اور صرف وہی انسان کی فطرت سے پوری طور پر میل کھا رہا ہے۔ جس کا خلاصہ صرف اتنا ہے: اِنَّمَا الدُّنیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ

دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے لیکن تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو

۔۔۔ لہٰذا تم دنیا میں رہو لیکن دنیا کے نہ رہو:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿سورۃ الذّٰریٰت:۵۶﴾

جن وبشر کو صرف عبادت الٰہی کیلئے پیدا کیا ہے

۔۔۔۔یعنی اگر ساری کائنات کا مقصد تخلیق افادۂ انسان ہے، تو انسان کا مقصد تخلیق عبادت الٰہی۔

۴۔۔۔۔نفس سے جہاد کرنا جہادِ اکبر اور جہادِ حقیقی ہے۔'موطن طبیعت' کو چھوڑ کر 'مدینہ شریعت' میں آبسنا 'ہجرتِ کبریٰ' اور 'ہجرت حقیقی' ہے۔ہجرت و جہاد کی مذکورہ بالا تشریحیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں، لیکن مفہوم اور مصداق دونوں کا ایک ہی ہے۔'هِجرَتُ عَنُ خُوَاهِشَاتِ النَفُسِ' ہی 'جِهَادُ بِالنَّفُس' ہے۔اسی طرح 'جِهَادِبِالنَّفُس' ہی 'هِجُرَتُ عَنُ خُوَاهِشَاتِ النَّفُس' ہے۔لہٰذا ہر مجاہد حقیقی، مہاجر حقیقی ہے۔اور ہر مہاجر حقیقی، مجاہد حقیقی ہے۔

'ہجرت شرعی مکانی' کیلئے ضروری ہے کہ رضائے الٰہی کیلئے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف انتقال کیا جائے اور چونکہ یہ ہجرت بھی رضائے الٰہی کی پابند ہے، لہٰذا اس ہجرت میں بھی 'موطن طبیعت' سے نکل کر 'مدینہ شریعت' کی طرف جانا ضروری ہے۔جس سے پتہ چلا کہ 'ہجرت شرعی مکانی' کے ضمن میں 'ہجرت حقیقی' کا وجود پایا جانا ضروری و لازمی ہے۔ برخلاف اسکے کہ 'ہجرت حقیقی' کے ضمن میں 'ہجرت مکانی' کا وجود غیر ضروری ہے۔اسلئے کہ اگر کوئی 'انتقالِ مکانی' کے بغیر عقیدۃً وعملاً پابند شریعت ہو، تو اسے 'مہاجر حقیقی' تو کہا جائے گا، لیکن وہ 'صاحب ہجرت مکانی' نہ ہوگا۔

۵۔۔۔۔عقل چاہتی ہے کہ انسان میرا تابع رہے۔نفس چاہتا ہے کہ وہ میرا مطالبہ پورا کرتا رہے۔عقل اعتدال پسند ہے، نفس انتہا پسند۔عقل دَاعِیُ اِلَی الُخَیرِ اور ناہی عن المنکر ہے، نفس بالکل اس کے برعکس۔دونوں میں شدید ترین تصادم ہے۔ایک آگ دوسرا پانی۔ان میں کا ہر ایک، دوسرے سے کمزور بھی نہیں، کہ زوردار کمزور کو دبا لے اور پھر مملکت انسانیت پر صرف اپنی حکومت رکھے۔عقل کے مطالبہ بظاہر بالکل خشک اور نفس کے تقاضے سرسبز و شاداب۔عقل کے پاس صرف وعدۂ فردا، نفس کے پاس عیش امروز۔ساتھ ہی ساتھ نفس اتنا بڑا کیاد و مکار ہے جس کا کید و مکر اس عقل پر تو چل ہی جاتا ہے جس کے ساتھ تائید الٰہی نہ ہو۔

حضرت ابوالحسن خرقانی نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

سه چیز راغایت ندانستم، غایت معرفت الٰهی ندانستم،
غایت مقام مصطفی ندانستم، غایت کید نفس ندانستم،

۔۔۔۔میں تین چیزوں کی انتہا نہ جان سکا۔

﴿۱﴾۔۔۔معرفت الٰہی ﴿۲﴾۔۔۔مقامِ مصطفیٰ ﴿۳﴾۔۔۔فریب نفس

نفس تنہا بھی نہیں، ایک بہت بڑا نفس والا اس کا معین و مددگار بھی ہے، جسکا نام عزازیل ہے

جس کوقرآن نے شیطان مردود، خناس، انسان کا کھلا ہوا دشمن، وغیرہ وغیرہ، کہہ کراہل نفس کو شیطان مردود، خناس، انسان کا کھلا ہوا دشمن، وغیرہ وغیرہ، کہنے کا جواز پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ اس کہنے اور سمجھنے کو سنت الٰہیہ اور پھر سنت نبویہ بتا تا ہے اور تہذیب واخلاق کے باب میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیا ہے کہ جو جس خطاب کا پورے طور پر مستحق ہوا اور اسکا پورا پورا مصداق ہو اس پر اس خطاب کا اطلاق، ہرگز ہرگز، غیر شریفانہ نہیں۔ اسی اصول کی بنیاد پر چور کو چور اور شرابی کو شرابی کہنے کو انصاف اور دیانت کی کوئی عدالت معیوب نہیں سمجھتی اور اسکو گالی گلوچ سے تعبیر نہیں کرتی۔ نفس کے اس معین و مددگار عزازیل کو اللہ کی جانب سے بڑی قوتیں عطا کی گئیں ہیں اور اسکو انسانی عقل کیلئے ایک بہت بڑی آزمائش بنا دیا گیا ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔طاغوتی طاقتیں نفس کے ساتھ ہیں، لیکن عقل تنہا ہے۔ اگر چہ عقل اپنی توانائی کے اعتبار سے نفس سے کم نہیں، لیکن تنہائی اور اس کے پیغام کی 'ظاہری خشکی' نے اس کو ایک طرح کا ناتواں ہی بنا دیا ہے۔ ایسی صورت حال میں اپنے ظاہری و باطنی حواس کو نفس کے شکنجے سے آزاد کرا کے عقل کی دنیا میں آنا کس قدر دشوار ترین کام، کتنی بڑی ہجرت، اور کیسا عظیم جہاد، اور کس درجہ کی آزمائش ہے۔ لیکن قربان جایئے رحمت خداوندی پر، جس کی قدرت نے اگر ایک طرف ہماری آزمائش کیلئے فریب نفس کو سخت ترین بنانے کیلئے طاغوتی طاقتوں کو اس کا پشت پناہ بنا دیا ہے، تو دوسری طرف عقل کو تقویت پہنچانے کیلئے اپنی تائید کا بھی سامان فراہم کر دیا ہے۔ ایک مقدس جماعت کو اپنی تائید سے مؤید کر کے عقل کا پشت پناہ بنا دیا ہے۔ جن کے ساتھ طاغوتی طاقتیں تھیں، ان کو رب نے **مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ** کہہ کر اپنا غیر یعنی اپنے سے بیگانہ بنا دیا۔ اور جن کے ساتھ اپنی تائید رکھی اس کو، نبی اللہ، رسول اللہ، اولیاء اللہ، فرما کر اپنی طرف نسبت دیکر اپنا یگانہ قرار دیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سارے اللہ کے محبوب ومقبول بندے، اللہ کے یگانے یعنی اس کے اپنے ہیں نہ کہ غیر یعنی بیگانے۔

اللہ نے صحیفہء ہدایت یعنی قرآن کریم اور صاحب قرآن، یعنی رسول کریم کو مبعوث فرما کر سمجھا دیا کہ اے عقل! اگر تو اپنی فلاح چاہتی ہے اور تجھے دنیا وآخرت کی کامیابی درکار ہے، تو آ، قرآن اور صاحب قرآن کو اپنا سہارا بنا لے۔ میں نے تیری ہدایت کیلئے ان کو تیرے قریب کر دیا ہے، اب اگر تو ان کے قریب ہو جائے گی تو میرے قریب ہو جائے گی۔ اگر تو نے انہیں پشت پناہ بنا لیا، تو تجھے میری تائید اپنے سائے میں لے لیگی۔ یہ میرے غیر نہیں، میرے اپنے ہیں۔ اسی طرح میں نے جس جس کو اپنا ولی، اپنا قریب، اپنا دوست، اور اپنے دین کا مددگار کہا ہے، یہ سارے کے سارے میرے اپنے ہیں۔ میں نے اپنے فضل

وکرم سے ان کو جس جس مرتبہ اور جس جس منصب سے نوازا ہے، اس میں اگر اُن کی شانِ محبوبیت کو اجاگر کرنا ہے، تو وہیں یہ حکمت بھی ہے کہ وہ اپنے منصب کے مناسب تمہاری دنیا و آخرت میں مدد کریں۔ اُن کی مدد دراصل ہماری ہی مدد ہے۔ اور اگر تو نے ان سے مدد لی ہے، تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کے غیر سے مدد لی ہے بلکہ یہ تو میرے اپنے ہیں، غیر نہیں۔ لیکن اگر تو نے ان کے سوا شیاطین واصنام وغیرہ کو اپنی مدد کیلئے پکارا، تو یقیناً تو نے میرے غیر کو آواز لگائی جس کا انجام بڑا ہی ہولناک ہے۔

اس حقیقت کو اس مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے کہ ایک حکومت کے ماتحت، حکومت کی جانب سے جو محکمے ہوتے ہیں، انہیں حکومت کا غیر نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ وہ حکومت کے اپنے محکمے ہوا کرتے ہیں لہٰذا ان محکموں کے ذمہ جو کام سپرد کیا جاتا ہے اور پھر وہ اس کو انجام دیتے ہیں، تو یہی کہا جاتا ہے کہ یہ حکومت کا کیا ہوا ہے۔ تھانہ سے آپ مدد لیں یا کوتوالی سے یا کسی عدالت سے، یہ مدد طلب کرنا حکومت سے مدد طلب کرنا ہے اور ان کا مدد دینا حکومت کا ہی مدد دینا ہے۔ لہٰذا ان محکموں سے مدد طلب کرنے کو غیر سے مدد مانگنا نہ کہیں گے۔ بخلاف اس کے کہ اگر کسی دوسری حکومت سے مدد لی جائے یا کسی ایسے محکموں سے نصرت حاصل کی جائے جو حکومت کے غیر متعلق ہوں، تو یہ یقیناً اپنی حکومت کے غیر سے مدد حاصل کرنی ہوئی۔ اور مدد کا حاصل کرنے والا حکومت کا باغی ہوا۔

بلاتمثیل۔۔۔۔نبوت وولایت کے سارے محکمے منجانب اللہ اور حکومت الٰہیہ کے ماتحت ہیں۔ لہٰذا ان محکموں سے طلب اعانت حکومت الٰہیہ سے ہرگز بغاوت نہیں، بلکہ یہ درحقیقت اللہ ہی سے طلب نصرت ہے۔ جس عقل نے اس غیبی ہدایت کے اشارات سمجھ لئے، اس نے اللہ کے مقبول بندوں کو اپنا سہارا بنالیا، اور اپنے کو ان کے سپرد کردیا اور ان کے نقش قدم پر سر رکھ کر چلنے لگی، جس کے نتیجے میں کامیابی وکامرانی نے اس کے قدم چومے۔ اور اس کے عقیدہ وعمل کے دست وبازو اتنے قوی ہوگئے کہ نفس کی توانائیاں اور اس کا ساتھ دینے والی طاغوتی طاقتیں اپنا زور نہ دکھاسکیں۔ اور نفس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ عقل نفس پر غالب آگئی اور نفس کو اپنا تابع بنالیا۔ نفس نے اگر ایک طرف شیطان کو اپنی مدد کیلئے آواز لگائی، تو دوسری طرف عقل کو یہ فریب دیا کہ غیر خدا کی مدد شرک ہے۔ لہٰذا نہ تو اب کسی رسول و نبی سے طلب اعانت کی جاسکتی ہے اور نہ کسی ولی سے، اس لئے کہ یہ سب کے سب خدا کے غیر ہیں۔ نفس نے یہ شعبدہ بازی اسلئے کی کہ عقل دھوکہ میں آجائے اور کسی ایسی طاقت کا سہارا نہ لے لے جس کے آگے اسکی اور اس کے معاونین کی توانائیوں کو سرنگوں ہونا پڑے۔

یہ تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ نفس کا مذکورہ بالا فریب خود اسی کی جانب سے ہے۔ یا اس کو مدد

دینے والے شیطان کا دھوکہ ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسے طاغوتی فکر ونظر ہی نے جنم دیا ہے۔ نفس کو خوب معلوم ہے کہ عقل جب تک اللہ والوں سے وابستہ رہے گی، اس کو شکست دینا ناممکن ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے مختلف انداز میں اللہ کے محبوبوں کی تحقیر کی جائے، ان کے مرتبوں کو گھٹایا جائے۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ان کے مرتبوں کی نفی کی جائے، جن سے وہ اللہ کے فضل وکرم سے نوازے گئے ہیں۔ توحید کا ایسا مطلب سمجھایا جائے، جس میں تقدیس رسالت کا کوئی پہلو نہ ہو۔ رسول کی شخصیت کی ایسی تصویر کھینچی جائے جہاں علم وعمل اور فضل وکمال، حسن وجمال، جودونوال، جاہ وجلال، اور اقتدار واختیار کی کوئی رعنائی نہ ہو۔ نفس کی اس آواز کو جب اہل نفس نے سنا، تو سوچا کہ نسخہ اچھا ہاتھ لگا ہے۔ ان کے قلم متحرک ہوگئے۔ صفحہء قرطاس پر نقوش ابھرنے لگے۔ عقل کی نگاہیں اس پر پڑیں، وہ حیرت زدہ ہوکر اَلْاَمَانَ الْحَفِیْظ کہنے لگی۔

اللہ اللہ وہ رسول جس کو نصوص، 'عالم ما کان وما یکون' بتائیں، اس کے علم شریف کو جانوروں، پاگلوں، بچوں کے علم کے مساوی اور شیطان کے علم سے کم کہا جائے۔ وہ رسول جس کی 'حیاتِ جسمانی' ثابت شدہ امر ہو، اس کو کہا جائے کہ 'مرکر مٹی میں مل گئے'۔ وہ رسول جن کو حکمت وکتاب کا معلم اور ساری کائنات کا استاذ بنایا گیا ہو، اس کو اپنا 'شاگر درشید' جتایا جائے۔ وہ رسول جس کے مقدس جسم سے مس ہونے کے سبب، مزار پاک کی زمین عرش اعظم سے افضل ہو، اس کو اپنے جیسا بشر سمجھا، سمجھایا جائے۔ وہ رسول جس کے بعد کسی نبی کا نہ آنا، 'مَنْصُوْص مِنَ اللّٰہ' ہو، اسی کے زمانے میں یا اس کے بعد کسی اور نبی کے وجود کا امکان ظاہر کیا جائے۔

وہ رسول جو مقامِ شفاعت کبریٰ پر فائز ہو، اسے اپنی ہی عاقبت سے بے خبر بتایا جائے۔ وہ رسول جس کا ظہور سارے عالم کی ہدایت کیلئے ہوا ہو، اسے اپنی ابتدائی چالیس سالہ زندگی میں گمراہ، بھٹکا ہوا، اور شریعت سے بے خبر بتایا جائے۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ان پڑھ، بادیہ نشین، ان پڑھ صحرانشین، عبد باغی، مجبور محض، جیسے الفاظ سے اس کو یاد کیا جائے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں 'اسرائیلی چرواہے' کا اطلاق، معیوب اور دین ودیانت کے خلاف نہ سمجھا جائے، وغیرہ، وغیرہ۔

مِنْ اَمْثَالِهَا وَنَظَائِرِهَا جن کی عقلوں پر نفس کا غلبہ ہوگیا، تو انہوں نے نفس کی ان ساری باتوں کو عقل کی بات سمجھ لی۔ کاش کہ ان کی عقلیں بے سہارا نہ ہوتیں اور وہ لاہوتی توانائیوں کو اپنا پشت پناہ بنالیتیں، تو یقیناً ان میں عقل ونفس کے اشاروں کے مابین خط امتیاز کھینچنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی۔ اور وہ

ان باتوں سے اسی طرح پناہ مانگتے جس طرح اس عقل نے مانگی ہے جس کو اللہ کی تائید حاصل ہے۔

فرشتوں کے پاس صرف عقل ہے اور جانوروں کے پاس صرف نفس، اور انسان عقل و نفس کا مرکب۔ عقل نفس پر غالب آجائے، تو انسان فرشتوں کا مرکز نگاہ بن جاتا ہے۔ اسلئے کہ فرشتے تو صرف عقل والے ہیں۔ تو ان سے تو صرف عقل ہی کا کام ہوگا۔ اور یہ انسان نفس رکھ کر بھی عقل کے دامن کو نہیں چھوڑتا۔ برخلاف اِس کے اگر نفس عقل پر غالب آجائے تو انسان جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ جانور صرف نفس رکھتے ہیں، تو ان سے امور نفسانیہ کے سوا اور کیا صادر ہوگا۔ لیکن یہ انسان عقل رکھتے ہوئے بھی خواہشاتِ نفس کا تابع ہے، لہٰذا جانور سے بدتر ہے۔

طاغوتی طاقتیں چاہتی ہیں کہ نفس عقل پر غالب آجائے اور انسان دوٹانگ کا جانور بن کر رہ جائے، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہوجائے۔ جانور کم از کم اپنے مالک کا احسان فراموش تو نہیں ہوتا، لیکن یہ انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے، جو قاسم نعمت الٰہی، صاحب صفات لامتناہی (انسانی فہم وادراک کے اعتبار سے) دنیا و آخرت میں کام آنے والے شفیق و مہربان رسول کا وفادار نہ ہوسکا۔

لاہوتی توانائیوں کی خواہش ہے کہ عقل نفس پر غالب آجائے اور انسان فرشتوں کا مرکز نگاہ بن جائے۔ صبح و شام اس پر رحمت الٰہی کا نزول ہوتا رہے۔ فرشتوں کی زبان اس کے ذکر اور اس کیلئے دعائے مغفرت سے رطب اللسان رہے۔ عقل و نفس کا یہ تصادم اور ان کے نظریات کا وہ ٹکراؤ جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اہل نفس و اہل عقل کی شناخت کیلئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ اس کی زبان و اس کا قلم ان کی بارگاہوں کا گستاخ تو نہیں، جو عقل کی ہدایت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر تحریریں و تقریریں گستاخ نہیں، بلکہ تابع فرمان ہیں، تو یقیناً وہ اہل عقل سے ہے ورنہ اہل نفس سے۔

اہل نفس بھی عقل رکھتے، ہیں لیکن غلبۂ نفس کی وجہ سے انہیں اہل نفس ہی کہا جائے گا۔ اسی طرح اہل عقل بھی نفس رکھتے ہیں، لیکن غلبۂ عقل کے سبب وہ اہل عقل ہی رہیں گے۔ ان جملہ حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد آپ سمجھ لیں گے کہ عقل والا کون ہے، اور نفس والا کون ہے۔ اور وہ کون ہے جو خواہشات نفس سے مکمل طور پر ہجرت کر کے عقل کی دنیا میں آبسا ہو۔ اور کس کے ساتھ تائید رحمانی ہے اور کس کے اوپر غلبۂ شیطانی۔ پھر آپ پر یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ درحقیقت 'مہاجر حقیقی' کون ہے۔

یہ پوری تفصیلات اس طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں کہ 'صابر حقیقی' اور 'مومن کامل' اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے دو مفہوم رکھتے ہیں، لیکن ان دونوں کا مصداق ایک ہی ہے:

لَاهِجرَۃَ بَعدَالفَتح

۔۔۔۔ کا مطلب گزر چکا کہ فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت نہیں، اسلئے کہ اب یہ دارالاسلام ہوگیا اور دارالاسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر جا کر بس جانا 'ہجرت شرعی' نہیں۔ جو لوگ ہندوستان چھوڑ کر یا پاکستان یا کسی اور طرف بھاگ رہے ہیں اور اپنے اس فرار کو ہجرت کا نام دے رہے ہیں، وہ شدید غفلت میں ہیں۔

ہمارے امام اعظم رضی اللہ عنہ بلکہ علماء ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کے مذہب پر ہندوستان 'دارالاسلام' ہے، ہرگز 'دارالحرب' نہیں۔ 'دارالاسلام' کے 'دارالحرب' ہوجانے میں جو تین باتیں امام اعظم کے نزدیک درکار ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکام شرک علانیہ جاری ہوں اور شریعت اسلامیہ کے احکام وشعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات بِحَمدِ اللّٰہِ یہاں قطعاً موجود نہیں۔

اہل اسلام جمعہ وعیدین واذان واقامت ونماز باجماعت وغیرہا، شعارِ شریعت، بغیر مزاحمت علی الاعلان ادا کرتے ہیں۔ فرائض نکاح، رضاع، طلاق، عدت، رجعت، مہر، خلع، نفقات، حضانت، نسب، ہبہ وقف، وصیت، شفعہ، وغیرہا معاملاتِ مسلمین ہماری شریعت کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں۔ ان امور پر حضرات علماء سے فتویٰ لینا اور اسی پر عمل وحکم کرنا حکام کیلئے ضروری ہے۔ اگرچہ ہنود ومجوس و نصاریٰ ہوں۔

بِحَمدِاللّٰہِ یہ بھی شوکت وجبروتِ شریعت اعلیٰ اللہ تعالیٰ حکمہا السامیہ ہے کہ مخالفین کو بھی اپنی تسلیم اتباع پر مجبور فرماتی ہے۔۔۔ مزید تحقیق وتفصیل کیلئے ملاحظہ فرمایئے:

'اِعلَامُ الاِعلَامِ بِاَنَّ ھِندُوستَانَ دَارالسَّلام'

ازافاضاتِ عالیہ: مجدد مائۃ حاضرہ امام احمد رضا رضی اللہ عنہ۔

۔۔۔ الحاصل ۔۔۔ ہندوستان کے دارالاسلام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن کچھ اہل نفس ایسے ہیں جو محض 'تحلیل ربوٰ' کیلئے اس ملک کو 'دارالحرب' ٹھہرا رہے ہیں۔ اور باوجود قدرت واستطاعت کے ہجرت کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے۔ انہوں نے سوچا کہ ہندوستان کو جب تک 'دارالحرب' نہیں کہا جائے گا، یہاں سودخوری کے جواز کی کوئی اجماعی صورت نہ نکلے گی۔ لہٰذا اس کو 'دارالحرب' کہہ دیا جائے اور پھر بغیر کسی اندیشے کے، سود کے لطف اٹھائے جائیں۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃُ[۱] اَنْ لَّآاِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَاَنَّ مُحَمَّدً اعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ[۲]، وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ[۳] وَالْحَجُّ[۴] وَصَوْمُ[۵] رَمَضَانَ .

﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ خانہء اسلامیت کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اول: لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دینی۔ دوم: نماز کما حقہ ادا کرنی۔ سوم: مال کی زکوٰۃ دینی۔ چہارم: حج کرنا۔ پنجم: رمضان کے مہینہ کا روزہ رکھنا۔

حدیث شریف میں اسلامیت کو ایک گھر اور امورِ مذکورہ کو اس کے کھمبوں سے تشبیہ دی ہے کہ انھیں قواعد و دعائم پر یہ گھر قائم ہے۔

۱۔۔۔ عَنْ اِبْنِ عُمَرُ: آپ کا اسم شریف عبداللہ ابن عمر ہے۔ ظہور نبوت سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے۔ ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ ابن زبیر کی شہادت کے تین ماہ بعد وفات پائی۔ ذی طوی کے مقبرۂ مہاجرین میں آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔ آپ کا وصال ۸۴ سال کی عمر شریف میں ہوا۔ آپ زبردست متقی، صاحبِ زہد و وریٰ اور علم و فضل والے تھے۔

۔۔۔ حضرت جابر کا قول ہے کہ:

مَامِنْ اَحَدٍ اِلَّا حَالَتْ بِهِ الدُّنْيَا وَمَالَ بِهَامَاخَلَا عُمَرُ وَابْنُهٗ عَبْدُ اللّٰهِ

حضرت عمر اور آپ کے فرزندار جمند حضرت عبداللہ ابن عمر نہ
تو دنیا کی طرف مائل ہوئے اور نہ دنیا انکی طرف جھکی

حضرت جابر کے قول مذکورہ سے جو حصر مستفاد ہے وہ حصر، حصرِ اضافی ہے۔ مقصود کلام یہ ہے کہ یہ دنیا میں رہے، لیکن دنیا کے نہ رہے۔ حضرت نافع کا ارشاد ہے کہ حضرت ابن عمر نے کم و بیش ایک ہزار غلاموں کو آزاد فرمایا ہے۔ آپ صغر سنی ہی میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مکہ شریف میں شرف ایمان سے مشرف ہو چکے تھے۔ اہل اسلام کی نگاہوں میں آپ کے اعزاز و اکرام کو دیکھ کر حجاج ابن یوسف کو خوف لاحق ہوا کہ کہیں آپ خلافت کے دعویدار نہ ہو جائیں، تو ایک شخص کو آپ کے پیچھے لگا دیا تا کہ موقع پا کر وہ آپ کو شہید کر ڈالے۔ اس شخص نے اپنے نیزے کی نوک کو زہر آلود کیا اور پھر ایک

راستہ میں آپ کے قریب ہوا اور زہر آلود نوکِ نیزہ آپ کے قدم مبارک کی پشت پر رکھ کر دبا دیا۔ یہی آپ کی شہادت کا باعث بن گیا۔ آپ سے بیشمار لوگوں نے حدیث کی روایت کی ہے، رضی اللہ عنہما۔

۲۔۔۔۔**بُنِیَ الْاِسْلَامُ**: اسلام نام ہے شریعت کا۔ اسلام کا اطلاق اس معنی پر بھی کیا گیا ہے۔۔۔اَلِاذْعَانُ بِالْقَلْبِ وَالِاسْتِسْلَامُ بِجَمِیْعِ الْقُوٰیٰ وَالْجَوَارِحِ فِی جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ۔۔۔ دل سے مطیع ہونا اور ہر حال اپنے جملہ اعضاء وجوارح سے فرمانبردار ہونا۔ دل کی اطاعت، دل کی تصدیق اور اسکے یقین کا نام ہے۔ یہ دوسرا معنی پہلے معنی سے خاص ہے۔ ارشادِ ربانی 'اَسْلِمْ' میں اسی دوسرے معنی کا 'امر' سیدنا ابراہیم کو فرمایا گیا ہے۔ 'بنی الاسلام' میں اسلام سے مراد اسلام کامل ہے۔ اسلئے کہ اسلام کی بناء صرف شہادتین پر ہے۔ اس مقام پر صراحۃً صرف ارکانِ اسلام کو بیان کیا ہے۔ رہ گئیں ایمان کی دوسری شاخیں تو ان کا ذکر ضمناً اور اشارۃً ہے۔

۳۔۔۔۔**عَلٰی خَمْسٍ**: یعنی علی خمس دعائم۔۔۔ اسلام کی تعمیر پانچ کھمبوں پر کی گئی۔۔۔۔یا۔۔۔علی خمس خصال ۔۔۔اسلام کی بناء پانچ خصلتوں پر کی گئی۔۔۔۔یا۔۔۔۔ علی خمس قواعد ۔۔۔اسلام کی تعمیر پانچ بنیادوں پر کی گئی۔ ایک روایت میں علی خمس دعائم ۔۔۔کی صراحت ہے۔ مسلم کی روایت میں 'خمس' کی جگہ 'خمسة' ہے۔ اب تقدیر عبارت یہ ہوگی ۔۔۔علی خمسة اشیاء ۔۔۔یا۔۔۔'علی خمسة ارکان' ۔۔۔یا۔۔۔علی خمسة اصول ۔۔۔یعنی اسلام کی تعمیر پانچ چیزوں۔۔۔۔یا۔۔۔پانچ اجزاء۔۔۔یا۔۔۔پانچ اصول پر کی گئی ہے۔

چونکہ ارشاد مذکور میں معدود کا ذکر نہیں ہے اسلئے امور مذکورہ میں سے ہر ایک کی گنجائش ہے کہ کسی کو بھی معدود قرار دیا جائے۔ تمام صورتوں میں ارشاد مبارک کا حاصل وخلاصہ وہی ہے، جس کی طرف ترجمہ میں اشارہ گزر چکا۔ اس ارشاد مبارک میں اسلام کی اس حالت کی تشبیہ جو اپنے ان پانچوں ارکان سے 'علی وجه الدوام' اسے حاصل ہے، اس خیمے کی حالت سے بھی مقصود ہوسکتی ہے جسے پانچ سہاروں پر کھڑا کیا گیا ہو۔ جس میں ایک درمیانی ستون ہو اور باقی اس درمیانی کھمبے کے کنارے کنارے رہنے والے ستون۔

خیمہء اسلام کا درمیانی کھمبا، لفظ 'شہادت' ہے۔ جو دل کی گہرائی سے ابھرنے والی شہادت پر گواہ ہے۔ ان پانچوں کے سوا ایمان کی باقی شاخیں خیمے کی کھونٹیوں کی منزل میں ہیں۔ ایک جنازہ میں حاضر ہونے والے ایک مجمع میں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرزوق سے دریافت کیا کہ تو نے اس مقام کیلئے کیا تیاری کر رکھی ہے۔ فرزوق نے جواب دیا کہ میں اتنے سال سے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دے رہا ہوں۔ حضرت امام حسن نے فرمایا، یہ تو ستون ہے، مجھے اسکی طنابیں دکھاؤ۔ حضرت امام حسن

کا ارشاد بطور تمثیل ہے۔ آپ نے اسلام کو خیمے کے مشابہ قرار دیا، جس کا ستون کلمہ ءتوحید ہے اور جس کی طنابیں اعمال صالحہ ہیں۔

۴۔۔۔۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے تصدیق قلبی کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دی تو وہ بالاتفاق مسلمان ہو گیا اور اسکی اسلامیت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ حالانکہ ابھی اس سے اعمال صوم وصلوٰۃ اور افعال حج وزکوٰۃ کا صدور ہی نہیں ہوا، تو ان چاروں کھمبوں کے بغیر اسلامیت کا خیمہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسلامیت کی چھت۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسلامیت کا ایوان، صرف ایک کھمبے، یعنی 'شہادت کلمہ ءتوحید' پر کیسے قائم ہو گیا۔ برخلاف اسکے، کہ ایک شخص۔۔۔۔بالفرض۔۔۔۔نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، ان چاروں اعمال پر اسلام کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرتا ہے، لیکن کلمہ ءتوحید کی شہادت نہیں دیتا، نہ قلبی گواہی نہ لسانی، تو وہ بالاتفاق مسلمان نہیں۔ حالانکہ چار کھمبے موجود ہیں صرف ایک ہی کھمبا تو نہیں۔ تو کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟ کہ ایک کھمبے پر تو اسلام کی عمارت قائم ہو جائے۔ لیکن اگر وہ مخصوص کھمبا نہ ہو، تو اسکے سوا چار کھمبے بھی اس کو قائم نہ رکھ سکیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مکان یا خیمہ صرف کھمبوں کا نام نہیں بلکہ کھمبوں کے سوا بھی کوئی چیز ہوتی ہے جو کھمبوں سے مل کر مکان کہلاتی ہے۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو ان کھمبوں سے مل کر اسلام کے نام سے موسوم ہوئی۔ بعض گمراہوں کے سوا سب ہی مدعیان اسلام اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ 'نفس ایمان' کیلئے صرف تصدیق قلبی درکار اور کافی ہے اور صرف 'نفس ایمان' ہی سے ایک شخص اسلام والا ہو جاتا ہے۔ تو شہادت لسانی جسکا ذکر حدیث میں ہے اور دوسرے اعمال مذکورہ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں، یعنی پانچوں کھمبوں میں سے کوئی کھمبا نہیں لیکن اسلام موجود ہے۔ تو آخر یہ اسلام کیسا مکان ہے کہ اپنے وجود میں کھمبوں کا بھی محتاج نہیں۔

ان تمام شکوک وشبہات کو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہے 'نفس اسلام'، اور ایک ہے 'اسلام کامل'۔ 'اسلام کامل' اپنے وجود میں 'نفس اسلام' کا محتاج ہے۔ لیکن 'نفس اسلام' اپنے وجود میں 'اسلام کامل' کا محتاج نہیں۔ 'نفس اسلام' لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی پوری پوری شہادت قلبی کا نام ہے۔ اور 'اسلام کامل' میں اس تصدیق کے ساتھ 'شہادت لسانی' اور 'اعمال' بھی داخل ہیں۔ 'نفس اسلام' 'مانع خلود نار' ہے اور 'اسلام کامل' 'مانع دخول نار'۔ 'شہادت لسانی' گو محققین کے نزدیک 'نفس اسلام' کی حقیقت سے خارج ہے، لیکن اجراء احکام کیلئے ضروری ہے۔ اسی لئے 'شہادت لسانی' کو اسلام کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے کہ اسکے بغیر کسی کو اسلام والا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ 'نفس اسلام' ہی 'شہادت لسانی' کے ساتھ اسی شخص کیلئے 'اسلام کامل' ہے جو عمر تکلیف نہ رکھتا ہو، لیکن باشعور ہو۔۔۔۔یا۔۔۔۔عمر تکلیف تو رکھتا ہو، لیکن اسے وقت وجوب ادائیگی عمل حاصل نہ ہو۔۔۔۔مثلاً: وہ کافر جو ٹھیک نصف النہار کے وقت ایمان

لا یا ہواور پھر نصف النہار ختم ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گیا ہو۔

رہ گئے مسلمانوں کے بے شعور بچے، جو عالم لاشعوری میں انتقال کر گئے ہوں، تو وہ بالاتفاق مومن کامل ہیں۔ گوان کے ساتھ نہ 'تصدیق قلبی' ہے نہ 'شہادت لسانی'۔ اسکی وجہ یا تو یہ ہے کہ انکونفس تصدیق میں انکے والدین کا تابع کر دیا گیا ہے یا یہ کہ اسلام انسان کی فطرت ہے اور جب تک فطرت کے خلاف کسی امر کا ظہور نہ ہو، اس وقت تک حالت فطری ہی کو مدنظر رکھ کر حکم لگایا جائے گا۔ ان دونوں صورتوں میں گو یہ ظاہر ہے کہ بے شعور بچوں سے تصدیق قلبی نہیں، لیکن فی الحقیقت نگاہِ شریعت میں تصدیق مذکور متحقق ہے۔ کفار کے بے شعور بچوں سے متعلق تفصیلی گفتگو اپنے موقع پر آئے گی انشاء المولیٰ تعالیٰ۔ کس کا اسلام کامل ہے اور کس کا ناقص؟ اس کو افراد مسلمین کے حال کو دیکھنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔۔۔۔ مثلا:

﴿۱﴾۔۔۔ ایک شخص کلمہء اسلام کی تصدیق کے ساتھ جملہ اوامر ونواہئ شرعیہ کا پابند ہے لیکن رمضان کا مہینہ اسکو میسر نہیں آتا اور وہ انتقال کر جاتا ہے، تو اسکا اسلام بغیر صوم رمضان کے کامل ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ ایک شخص کلمہء اسلام کی تصدیق کے ساتھ جملہ اوامر ونواہئ شرعیہ کا پابند ہے لیکن حج کی استطاعت نہیں رکھتا اور اسی عالم بے استطاعی میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیتا ہے، تو اس کا اسلام بغیر حج کے کامل ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ ایک شخص کلمہء اسلام کی تصدیق کے ساتھ تمام شرعی اوامر ونواہی کا پابند ہے لیکن صاحب نصاب نہیں، جوزکوٰۃ دے سکے اور اسی حال پر اسکی موت واقع ہوگئی تو اس کا اسلام، بغیر ایتاء زکوٰۃ کے کامل ہے۔ ان تینوں مثالوں کے علاوہ بعض مثالوں کی طرف اوپر کی تحریر میں اشارہ گزر چکا ہے اور اسی نہج پر ذرا سے تامل کے بعد، بہت ساری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جسکی تفصیل طول کلام کا باعث ہے۔

اب مجھے امید ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان جزئیات پر غور کر کے اس کلی حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہے گا کہ 'اسلام کامل' نام ہے 'تصدیق واعمال' کے مجموعہ کا۔ لیکن یہ اعمال کچھ مخصوص ومتعین نہیں کہ فلاں فلاں عمل جب تک تصدیق سے نہ ملے گا اسلام کامل نہ ہوگا۔ بلکہ افراد مسلمین میں سے ہر فرد کی تصدیق کے ساتھ اس عمل کا انتظار اس فرد خاص کے اسلام کو 'اسلام کامل' بناتا ہے جسکا وہ مکلّف ہے خواہ وہ ایک ہو۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ چند ہوں۔ اس مقام پر یہ ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ عمر تکلیف نہ رکھنے والے باشعور لڑکے یا عمر تکلیف رکھتے ہوئے وقت وجوب ادائیگی عمل نہ پانے والے لوگوں کے اسلام کو، 'کلمہء اسلام' کی تصدیق کے ساتھ صرف 'عمل شہادت لسانی' ہی 'اسلام کامل' بنا دیتا ہے۔

۵۔۔۔۔حدیث زیر بحث میں جن پانچ ارکان کا ذکر ہے، ایک ہے انکو اپنی عملی زندگی میں داخل کرنا، اور ایک ہے انکا ماننا۔ دونوں کی دو پوزیشن ہے۔ پہلے پر 'کمال ایمان' موقوف ہے اور دوسرے پر 'نفس ایمان' موقوف ہے۔ لہٰذا اگر کوئی صحیح العقیدہ مسلمان کبھی کلمہ نہ پڑھے، یا صوم وصلوٰۃ کا پابند نہ ہوتو وہ مومن تو رہے گا، مگر مومن کامل نہ رہے گا۔ اور جوان میں سے کسی کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

۶۔۔۔۔ **شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ:** اللہ کی الٰہیت اور الوہیت کی شہادت اور محمد عربی ﷺ کی رسالت کی شہادت کے مابین آپس میں، از روئے شرع، ایسا تلازم ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے باوجود اسکے کہ بظاہر یہ دونوں شہادتیں دو نظر آتی ہیں، لیکن حدیث پاک میں انکو ایک ہی رکن اور ایک ہی خصلت قرار دیا گیا ہے۔ بعض روایتوں میں صرف لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کے بیان پر اقتصار کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ یا تو راوی کا سہو ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔ یہ خیال ہے کہ چونکہ دونوں شہادتیں شرعاً آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ اسلئے ان میں سے کسی ایک کا ذکر کافی ہے ۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ان میں سے کسی ایک کا ذکر معنوی طور پر دوسرے کا بھی ذکر ہے۔

حدیث زیر بحث میں کلمہءاسلام کی جو ترتیب ہے، من وعن یہی ترتیب اکثر روایتوں میں ہے۔ جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صحت اسلام کیلئے ضروری ہے کہ کلمہءاسلام کے دونوں اجزاء میں جو ترتیب ہے ان کی شہادت میں بھی اس ترتیب وتوالی کا خیال کیا جائے۔ یعنی پہلے جزءاول کی شہادت دی جائے پھر جزءثانی کی۔

۷۔۔۔۔ **وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ:** رسولِ کریم کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جملہ ارشادات کو تسلیم کیا جائے ۔۔۔لہٰذا۔۔۔ اگر کوئی کسی عقیدے کا منکر ہے، تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس ایک عقیدے کا منکر ہے، بلکہ اسے رسالت محمدی کا منکر قرار دیا جائیگا۔۔۔المختصر۔۔۔رسول کریم کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ سارے عقائد اسلامیہ پر ایمان لایا جائے۔ نبی کریم کی 'صفت عبدیت' کو آپ کی 'صفت رسالت' پر مقدم فرما کر آپ کی 'صفت عبدیت' کے مقام کی برتری کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی 'صفت عبدیت' آپ کی 'صفت رسالت' سے افضل وبرتر ہے۔

بعض علماء نے صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

اَلْعُبُوْدِيَّةُ اَفْضَلُ مِنَ الرِّسَالَةِ

عبدیت رسالت سے افضل ہے

۔۔۔علماء کرام کے اس ارشاد میں ماوشما کی عبدیت زیر بحث نہیں، بلکہ جس عبدیت کو وہ 'صفت رسالت'

پر افضل قرار دیتے ہیں وہ خود اس صاحب رسالت ہی کی عبدیت ہے۔عبدیت مذکورہ کی افضلیت کی وجہ یہ ہے کہ عبدیت کا رخ معبود کی طرف ہے اور رسالت کا رخ مخلوق کی طرف۔عبد معبود کا۔۔۔۔ رسول مخلوق کا۔۔۔۔عبدیت خلق سے حق کی طرف جانا چاہتی ہے اور رسالت حق سے خلق کی طرف آنا چاہتی ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔عبدیت وصال چاہتی ہے اور رسالت جدائی۔۔۔۔اسلئے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھیجا تو رسول کہہ کر بھیجا۔۔۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ۔۔۔الخ ﴿سورۃ الفتح:۲۸﴾

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا

۔۔۔۔اور جب اپنی طرف لے گیا تو عَبْدِہٖ فرما کر لے گیا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ۔۔۔ ﴿سورۃ بنی اسرائیل:۱﴾

پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو

۔۔۔۔مقام عبدیت کا شرف اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عبدیت کہتے ہیں اپنے معاملات و مہمات کو اپنے آقا و مولیٰ کے سپرد کر دینے کو۔اور رسالت نام ہے دوسروں کے معاملات و مہمات اور دوسروں کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لینے کا۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔عبد کے معاملات و مہمات کی اصلاح اسکے آقا و مولیٰ کے ذمہ کرم میں ہے۔لیکن رسول اپنی امت کے معاملات و مہمات کی اصلاح کا خود ذمہ دار ہے۔تو نبی کریم بہ حیثیت 'عبد' بے فکر بھی ٹھہرے اور بے خوف بھی۔۔۔۔نہ اپنی فکر، نہ دوسروں کی فکر۔۔۔۔نہ اپنا خوف، نہ دوسروں کا خوف۔لیکن بہ حیثیت رسول، آپ کو فکر و غم سے چھٹکارا نہیں۔اپنا نہ سہی دوسروں ہی کا سہی۔تفسیر کبیر میں ہے:

لَمَّا وَصَلَ مُحَمَّدٌ صَلَوٰتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِلَى الدَّرَجَاتِ الْعَالِيَّةِ وَالْمَرَاتِبِ الرَّفِيْعَةِ فِي الْمَعَارِجِ اَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى يَا مُحَمَّدُ بِمَ اُشَرِّفُكَ قَالَ يَارَبِّ بِاَنْ تُنْتَسِبَنِي اِلٰى نَفْسِكَ بِالْعُبُوْدِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ سُبْحَانَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ۔

اپنے سفر معراج میں جب حضور آیہ رحمت ﷺ درجات عالیہ اور مراتب رفیعہ پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی فرمائی کہ اے محمد (ﷺ) میں تمہیں کس چیز سے مشرف و سرفراز کروں۔ حضور نے عرض کیا، اے میرے پروردگار تو مجھے اپنا بندہ فرمادے، تو اللہ تعالیٰ نے واقعہ اسریٰ سے متعلق جو آیت کریمہ نازل فرمائی اس میں ارشاد فرمایا کہ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو۔

کون ہے جوخدا کا بندہ نہیں،مگرخود خدا جس کواپنا بندہ فرمائے،اسکی شان ہی نرالی ہےاور یہ بھی تو دیکھئے کہ بیشماردرجات عالیہ کو طے کرلینے کے بعداور نہ جانے کتنے بلند وبالا مرتبوں سے گزر جانے کے بعد نبی کریم بارگاہِ الٰہی سے کسی چیز کے آرزومند ہیں،تو وہ یہ ہے کہ اُن کا پروردگار اُن کو اپنا بندہ فرمادے۔معلوم ہوا کہ رسول جس عبدیت کو چاہ رہے ہیں وہ ایک ایسی مخصوص ترین عبدیت ہے جس کی رسائی وہاں تک ہے جہاں وہم وخیال بھی نہ پہنچ سکے۔یہی ہے وہ عبدیت کا مسئلہ جس سے بلند و بالا ہونا کسی ممکن کیلئے ممکن نہیں۔

۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔عبدیت کے بھی کئی درجے ہیں۔کسی ایک درجہ والی عبدیت کوصرف لفظی اشتراک کی بنیاد پر دوسرے درجہ والی عبدیت پر قیاس کرنا اصطلاحی زبان میں 'قیاس مع الفارق' کی بدترین مثال ہے۔کفارومشرکین بھی عبد ہیں،اور مومنین وموحدین بھی عبد ہیں،گنہگار بھی عبد ہے،نیکو کار بھی عبد ہے،امتی بھی عبد ہیں،انبیاء بھی عبد ہیں۔اب سب کی عبدیت کوایک ہی صف میں رکھ کر ایک کو دوسرے جیسا تصور کرنا،فہم وفراست اور دین ودیانت کو بالائے طاق رکھنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟
بے شک اللہ کے جلیل القدر نبی ورسول سیدنا کلیم اللہ علیہ السلام اللہ کے عبد تھے اور عبد کامل تھے۔لیکن انکی عبدیت کاملہ طالب جلوہ تھی۔مگر وہ جس کو 'عبدہٗ' کے شرف سے مشرف فرمایا گیا،وہ عبدیت کاملہ کی اس آخری منزل پر رہا کہ جلوہ خود اسکا طالب نظر آیا۔خوب کہا کہنے والے نے: ؎

عبد چیزے عبدہٗ چیزے دگر
ایں سراپا انتظار اومنتظر

مذکورہ بالاتحریر کی روشنی میں 'صفت عبدیت' کی برتری وافضلیت سمجھ لینے کے بعد اب اس قول کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی کہ نبی کی 'صفت رسالت' پر خود اسکی 'صفت عبدیت' افضل ہے۔
اب غور یہ کرنا ہے کہ نبی ورسول کا مقامِ نبوت ورسالت کیا ہے؟ کیا اس مقام تک کسی غیر نبی کی کوئی صفت یا کوئی غیر نبی اپنے جملہ صفات کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ اسکا صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ مقامِ نبوت ورسالت بڑا ہی بلند وبالا مقام ہے،جہاں تک کسی ایک غیر نبی کی کیا بات کی جائے،بلکہ سارے غیر نبیوں کو جمع کرلیا جائے اور سب کے سب اپنے جملہ صفات کی توانائیوں کو سمیٹ کر پرواز کرنا چاہیں،جب بھی وہ مقام نبوت کی ہوا تک نہیں پاسکتے۔
اب سوچنے کی یہ بات ہے کہ جب کسی غیر نبی کی عبدیت کسی نبی کے مقام نبوت ورسالت تک نہیں پہنچ سکتی اور اسکے برابر نہیں ہوسکتی،تو اس غیر نبی کی عبدیت،نبی ورسول کی اس عبدیت کے

مقام کو کیسے چھوسکتی ہے جو اس نبی و رسول کی 'صفت نبوت و رسالت' سے بھی افضل ہے۔ ایسی صورت میں صرف لفظی اشتراک کی بنیاد پر کسی غیر نبی کا اپنی عبدیت کو رسول کی عبدیت جیسا تصور کرنا دبے لفظوں میں رسول کی 'صفت رسالت' پر اپنی برتری کا اظہار کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی جسارت کی توقع ایمان والوں سے نہیں کی جاسکتی۔ اسلئے کہ یہ جرأت صرف یہی نہیں کہ روحِ سعادت کے منافی ہے بلکہ دین و دیانت کو بھی خیر باد کہنا ہے۔ حدیث زیر بحث میں اسلام کے جن پانچ ستونوں کا ذکر ہے، مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں، اب اسکے پہلے ستون کی تشریحی صورت یہ رہی:

شَهَادَةُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدً اعَبْدُهُ الْكَامِلُ وَرَسُوْلُهٗ الْمُكَمِّلُ

اسلام کا پہلا رکن لا الٰہ الا اللہ اور محمد عربی کی عبدیت کاملہ

اور رسالت تامہ اور نبوت عامہ کی شہادت ہے۔

۔۔۔الغرض۔۔۔اسلام کے پہلے رکن میں صرف نبی کریم کی 'نفس عبدیت' اور 'نفس رسالت' ہی کی شہادت نہیں بلکہ اس بات کی بھی گواہی دینی ضروری ہے کہ آپ کی رسالت، 'رسالت عامہ تامہ' ہے اور آپ 'رسول مکمل' ہیں، ہر دور کیلئے، ہر قوم کیلئے، ہر ماحول کیلئے اور محققین کے نزدیک ہر مخلوق کیلئے۔ اور آپ کی عبدیت کمال کی اس منزل پر ہے جہاں وہ آپ کی اس کامل و مکمل رسالت سے بھی افضل و برتر ہے۔ ؎

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

۸۔۔۔**اِقَامُ الصَّلٰوةِ:** نماز سے مراد فرض و واجب نمازیں ہیں۔ نماز کو دل لگا کر صحیح، ہمیشہ اور شریعت کے مطابق پڑھنا، نماز قائم کرنا ہے۔

۹۔۔۔**اِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ:** زکوٰۃ سے مراد صدقات مکتوبہ و مفروضہ ہیں۔ ایتاء زکوٰۃ کا معنی یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین تک زکوٰۃ کی رقم پہنچا کر اُن کو اسکا مالک بنا دیا جائے۔ زکوٰۃ کا دینا انھیں پر فرض ہے جو مالک نصاب ہیں۔ لیکن جو مالک نصاب نہیں ہیں، اُن پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض نہیں۔ ہاں زکوٰۃ کی فرضیت کا ماننا ضروری ہے۔ اسلئے کہ اسکی فرضیت کا انکار کفر ہے۔

۱۰۔۔۔**وَالْحَجُّ:** عبادت و قربانی کی ادائیگی کیلئے بیت اللہ شریف کا قصد کرنا حج ہے، جو ہر صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ ہاں استطاعت نہ ہونے کی صورت میں حج فرض نہیں، لیکن اس کی فرضیت کا ماننا لازمی و ضروری ہے۔ جسکا منکر کافر ہے۔ روزہ زکوٰۃ سے پہلے فرض کیا گیا اور زکوٰۃ

حج سے پہلے فرض کی گئی، لیکن حدیث زیرِ شرح میں ذکرِ حج کو ذکرِ صوم پر مقدم کر دیا ہے، شاید اس سے اس نکتہ کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ عبادت کی تین صورتیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔صرف بدنی ﴿۲﴾۔۔۔صرف مالی ﴿۳﴾۔۔۔بدنی و مالی دونوں

نماز جو صرف بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ جو صرف مالی عبادت ہے، ان دونوں کے ذکر کے بعد مناسب سمجھا گیا کہ فوراً ہی متصلاً اس عبادت کا ذکر کر دیا جائے جو بدنی بھی ہو اور مالی بھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ حج ہی ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔حدیث زیرِ شرح میں ارکانِ اسلام کی مذکورہ بالا ترتیب سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تینوں طرح کی طاعتیں، یعنی صرف بدنی (۱) اور صرف مالی (۲) اور بدنی و مالی دونوں (۳) یا تو یومیہ ہیں جیسے کہ نماز، جو ہر روز فرض ہے، یا سنویہ ہیں جیسے زکوٰۃ، جو سال میں ایک بار فرض ہے، یا عمریہ ہیں جیسے حج، جو عمر میں صرف ایک بار فرض ہے۔ رہ گیا روزہ، تو نہ تو وہ ایسی عبادت ہے جو ہر روز فرض ہو، نہ ایسی عبادت ہے جو ماہ بہ ماہ فرض ہو، اور نہ ایسی عبادت ہے جو ایک سال گزر جانے کے بعد فرض ہو، اور نہ ہی ایسی عبادت ہے جو عمر میں صرف ایک بار فرض ہو۔ لہٰذا اس کے ذکر کو مؤخر کر دیا۔

اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ روزہ ہر سال ضرور فرض ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ سال گزرنے کے بعد فرض ہو۔ اسلئے کہ اگر شوال کو پہلا مہینہ فرض کیا جائے، تو روزہ گیارہ ماہ گزر جانے کے بعد ہی فرض ہو جائے گا۔ ایسا نہیں کہ پورا سال گزر جائے تب فرض ہو۔ لہٰذا عبادت صوم کو سنویہ عبادت کے زمرہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ حدیث پاک میں حج کے ساتھ استطاعت کی شرط نہیں لگائی ہے، اسلئے کہ یہ بات کافی مشہور ہو چکی تھی کہ حج صاحبِ استطاعت ہی پر فرض ہے۔ ویسے بھی بغیر استطاعت کسی طاعت کا وجود کیسے ہو سکتا ہے، تو پھر ہر طاعت میں اسکا اعتبار تو ہوگا ہی، خواہ لفظوں میں اسکا ذکر ہو یا نہ ہو۔

۱۱۔۔۔**صُوْمُ رَمَضَانَ**: رمضان نام ہے شعبان و شوال کے درمیانی مہینے کا۔ لہٰذا شہر رمضان (ماہ رمضان) کہنے کی کوئی ضرورت نہیں اور قرآن کریم میں جہاں شہر رمضان فرمایا گیا ہے وہاں شہر کی اضافت رمضان کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔ روزے کے جو ارکان معلومہ اور شرائط مشہورہ ہیں اُن پر عمل کرتے ہوئے رمضان کے پورے ایام میں روزہ رکھنا، اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ بعض روایتوں میں صوم کا ذکر حج کے ذکر پر مقدم ہے، صرف یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ صوم کی فرضیت حج کی فرضیت پر مقدم ہے۔ امام بخاری نے 'کتاب الحج' کو 'کتاب الصوم' پر مقدم رکھا ہے۔ اس کی وجہ اوپر گزر چکی ہے۔ لیکن امام بخاری کے سوا دوسروں نے 'کتاب الحج' کو تمام عبادات کے

بعد رکھا ہے، اسلئے کہ حج کا وجود انسان کی آخری عمر سے متعلق ہے۔

۱۲۔۔۔۔امام بخاری نے اس حدیث زیر بحث کو 'کتاب الایمان' کے شروع میں رکھا ہے تا کہ ظاہر ہو جائے کہ اسلام کا اطلاق افعال پر ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اسلام و ایمان کبھی کبھی ایک معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسلام کے ایوان میں دخول، شہادتین پر موقوف ہے۔ تو پھر اسکے ذکر کے بعد ضرورت نہیں تھی کہ چار آخری ارکان کا ذکر کیا جاتا۔ مگر کیا گیا، صرف اسلئے کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ یہ ارکان بڑے ہی عظیم الشان ہیں، جو جملہ شعائر اسلام میں سب سے زیادہ ظاہر و ممتاز ہیں۔ اسلئے کہ انھیں سے اطاعت و فرمانبرداری اور اسلام سے سچی وفاداری مکمل ہوتی ہے۔ اور ان میں سے کسی کو ترک کر دینے سے طاعت و انقیاد کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کسی کا ترک، گو کفر نہیں، لیکن گناہ کبیرہ کی بدترین صورت ہے۔ ارکانِ اسلام میں جہاد کا ذکر نہیں کیا، اسلئے کہ جہاد بعض احوال کے سوا تمام حالات میں 'فرض کفایہ' ہے اور یہاں کلام ان ارکان سے متعلق ہے جو 'فرض عین' ہوں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔جو عظیم ترین شعائر اسلام سے ہوں۔ جہاد کی اسی ثانوی حیثیت کے پیش نظر ایک روایت کے اخیر میں یہ فقرہ زائد کر دیا گیا ہے کہ:

'اِنَّ الْجِهَادَ مِنَ الْعَمَلِ الْحَسَنِ'

جہاد نیک کاموں میں سے ہے

۔۔۔۔اس فقرہ میں جہاد کو اسلام کا رکن نہیں فرمایا گیا ہے۔

۱۳۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں صرف پانچ ارکان کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ عبادت یا تو فعل ہے یا ترک ہے۔ ترک والی عبادت روزہ ہے، فعل والی عبادت کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ لسانی ہو، دوسری یہ کہ بدنی ہو، تیسری یہ کہ مالی ہو اور چوتھی یہ کہ بدنی و مالی دونوں ہو۔ لسانی عبادت میں ممتاز مقام، شہادتین کو حاصل ہے۔ بدنی عبادت میں افضل و برتر مقام نماز کو حاصل ہے۔ مالی عبادت میں اونچا، بلند و بالا مقام زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ اور بدنی و مالی عبادت میں حج کو امتیازی شان حاصل ہے۔

۱۴۔۔۔۔شہادتین کا ذکر سب سے پہلے کیا، اسلئے کہ وہ اصل ہیں۔ اسکے بعد نماز کا ذکر فرمایا، اسلئے کہ نماز، عمادِ اعظم، دین کا بہت بڑا ستون ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

عُمُوْدُهَا الصَّلٰوةُ

دین کا ستون نماز ہے

۔۔۔۔ایک دوسری حدیث میں ہے:

اَلصَّلوٰۃُ عِمَادُ الدِّیۡنِ

نماز دین کا ستون ہے

۔۔۔۔ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ ؕ ﴿سورۃ العنکبوت:۴۵﴾

نماز فواحشات اور برائیوں سے روکتی ہے

۔۔۔۔اسی لئے نماز کو 'اُمُّ الْعِبَادَاتُ' کہا گیا ہے۔جیسا کہ شراب کو 'اُمُّ الْخَبَائِثُ' کہا گیا ہے۔نماز کے بعد زکوٰۃ کا ذکر کیا۔اسلئے کہ قرآن کریم میں بھی جا بجا اسکا ذکر نماز کے ذکر کے بعد ہے،جس نے زکوٰۃ کو نماز کا ہم نشین بنادیا ہے۔عبادتِ بدنی کے ذکر کے بعد فوراً ہی متصلاً عبادت مالی کا ذکر چونکہ قرآنی نقطۂ نظر کے بالکل مناسب ہے،تو قرآن کریم کی اقتداء کرتے ہوئے اسی مناسب رویئے کو اس حدیث میں اپنایا گیا ہے۔زکوٰۃ کے بعد حج کا ذکر ہے،اسلئے کہ یہ دوطرح کی عبادتوں (بدنی و مالی) کا سنگم ہے،اور دوطرح کی مشقتوں کا محل ہے،جسکا بے عذر ترک کرنے والے پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔رہ گئی وہ روایت صحیحہ جس میں ذکر حج کو ذکر صوم پر مؤخر کیا گیا ہے،تو اس میں ترکیب کی رعایت ملحوظ خاطر ہے۔اسلئے کہ روزہ ۲ھ میں فرض کیا گیا اور حج ۵ھ۔۔۔۔یا۔۔۔۔۶ھ۔۔۔۔یا۔۔۔۔۸ھ۔۔۔۔یا۔۔۔۔۹ھ میں فرض کیا گیا۔زکوٰۃ بھی ۲ھ میں فرض کی گئی۔نماز ہجرت سے پہلے معراج میں فرض کی گئی۔

۱۵۔۔۔۔**مُتَّفَقٌ عَلَيۡهِ**: اس حدیث کی روایت امام احمد،ابوداؤد،ترمذی اور نسائی نے بھی کی ہے۔یہ حدیث اور اس سے پہلے کی دو حدیثیں 'احادیث اربعینیہ ندویہ' سے ہیں۔
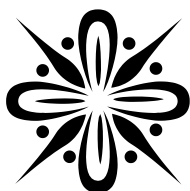
عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً فَاَ فْضَلُهَا قَوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایمان کی ستّر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے برتر و اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ تکلیف دینے والی چیز کا راستے سے ہٹا دینا ہے۔ اور حیاء ایمان کی شاخ ہے۔

جواہر پارے

۱۔۔۔۔بِضْعٌ وَّسَبْعُوْ نَ:۔۔۔بضعٌ۔۔۔عدد کا نام ہے، جسکا اطلاق تین سے دس تک کے اعداد پر ہوتا ہے۔ زبان فارسی میں اس کی تعبیر 'چند'۔۔۔یا۔۔۔'اند کی' کے لفظوں سے کی جاتی ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ ایمان کے وہ شعبے جن کا تعلق اخلاق واعمال، واجبات وسنن اور مستحبات وآداب سے ہے، حد وشمار سے باہر ہیں۔ شارع ہی کو ان تمام کا علم حاصل ہے۔ ایسی صورت میں حدیث مذکور میں ایمان کی جملہ شاخوں کو ستّر سے کچھ اوپر کے عدد میں محدود کرنا اشارہ کرتا ہے کہ حدیث پاک میں ایمان کے اصول وقواعد اور بنیادی امور کا ذکر مقصود ہے۔ ایسے اصولِ احکام اور قواعد ایمان جو ایمان کی مذکورۃ الصدر جملہ شاخوں کا مرجع ہیں۔

۲۔۔۔۔بعض روایتوں میں۔۔۔سبعون (ستّر) کی جگہ۔۔۔ستون (ساٹھ) آیا ہے۔ روایتوں کے اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہو کہ ساٹھ والی روایت مقدم ہو اور ستّر والی مؤخر۔

ایک وقت وہ تھا کہ جو اصول وقواعد ایمان کی جملہ شاخوں کے مرجع تھے، ان کی تعداد ساٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ مگر جب بتدریج بذریعہ وحی ایمان کی شاخوں میں اضافہ ہوا، تو قدرتی طور پر ان اصول وقواعد کی بھی زیادتی ہوئی اور اس اضافے نے ان اصول وقواعد کو ستّر سے کچھ اوپر پہنچا دیا۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ساٹھ والی روایت میں ابتدائی احکام کے اصول وقواعد کا ذکر ہے اور ستّر والی حدیث میں مذکورہ احکام پر زیادہ ہونے والے احکام کے اصول وقواعد کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۔۔۔۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حدیث زیر شرح میں جس عدد کا ذکر ہے اس سے حصر وتعیین مقصود نہیں، بلکہ صرف کثرت وزیادتی دکھانی ہے۔ جسکا حاصل یہ ہوگا کہ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں۔ یہ توجیہہ ستّر والی روایت کے زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اسلئے کہ کلام عرب میں ستّر کے عدد کو کثرت وزیادتی کے معنی میں استعمال کرنا معروف ومتعارف ہے۔ لیکن ساٹھ والی روایت کو اس توجیہہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس مقام پر ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ ستّر والی روایت میں بھی صرف سبعون (ستّر) کا ذکر نہیں بلکہ، بضع وسبعون (ستّر کے کچھ اوپر) کا ذکر ہے۔ لہٰذا اب اس عدد

سے وہ معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، جسکا صرف لفظ ستّر سے مراد لینا کلام عرب میں معروف ومتعارف ہے
۔۔۔الختصر۔۔۔ صرف لفظ ستّر ہوتا بھی، تو توضیح مذکور، عرفِ عرب پر نظر رکھتے ہوئے بالکل مناسب تھی۔لیکن بضعون کے اضافہ نے اس امکان کو بھی ختم کر دیا کہ یہاں صرف کثرت وزیادتی مراد لی جائے، ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اگر بِضْعٌ و سبعون کے عدد کو عرف عرب کے پیش نظر کثرت کے معنی میں لیا جائے اور لفظ بِضْعٌ سے اس کثرت میں مبالغہ مقصود قرار دیا جائے، تو پھر مذکورہ بالا توضیح صرف اسی روایت کیلئے کسی نہ کسی حد تک مفید ثابت ہو جائیگی۔بعض علماء نے یہ کوشش کی ہے کہ ایمان کے تمام شعبوں کو عدد وشمار کے دائرے میں لے آئیں۔حضرتِ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ کوشش بیجا تکلف سے خالی نہیں۔اور خواہ مخواہ کیلئے اپنے کو زحمت میں ڈالنا ہے۔اسلئے کہ ایمان کی شاخوں کے بہت سے افراد وانواع ایسے ہیں جو ان کے حیطہء بیان اور دائرۂ تحریر سے باہر ہیں۔

۴۔۔۔ایمان کے تمام شعبے حد وشمار سے متجاوز ہونے کے باوجود، ایک اصل کی طرف راجع ہیں۔یہ اصل وہ اصل الاصول ہے، جس سے ایک طرف اگر نفس کی تکمیل ہوتی ہے تو دوسری طرف علمی و عملی کمال کی تحصیل کے ذریعہ دنیا وآخرت میں سعادت ونیک بختی کی دولت فراواں سے بہرہ وری ہوتی ہے۔وہ اصل عظیم یہ ہے:

'اعتقاد میں صحت اور عمل میں استقامت'

۔۔۔قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔۔۔الخ ﴿سورۂ حٰم السجدۃ:۳۰﴾

بیشک وہ لوگ جنھوں نے کہا اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر وہ اسی پر مستقیم رہے

۔۔۔حدیث شریف میں ہے:

'قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ'

کہو مان گیا میں اللہ کو اور پھر اسی پر قائم رہو

۔۔۔ان دونوں ارشادات میں اسی اصل عظیم کی وضاحت کی گئی ہے جسکا ذکر ابھی اوپر کیا جا چکا ہے۔

۵۔۔۔فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: لا الٰہ الا اللہ کہنا اور اس پر ایمان لانا ایمان کے جملہ شعبوں میں سب سے پہلا اور سب سے برتر شعبہ ہے۔یہاں لا الٰہ الا اللہ سے پورا کلمہء طیب مراد ہے۔

۶۔۔۔وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی: ایمان کے تمام شعبوں میں سب سے فروتر اور ادنیٰ شعبہ راستے سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا، یعنی راستے سے کانٹا، پتھر، پلیدی وغیرہ اذیت پہنچانے والی

اشیاءکودور کر دینا، یہ بھی ایمان کی ایک خصلت ہے۔ اگرچہ دوسری خصلتوں کے سامنے یہ فروتر اورادنیٰ ہی سہی۔ دور کرنے کے لفظ سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ راہ میں پہلے تکلیف دہ چیز پڑے، پھر اسکو اٹھایا جائے۔ تب جاکے یہ اٹھانا ایمان کا شعبہ قرار پائے۔ حالانکہ درحقیقت مقصود کلام یہ ہے کہ راستوں کوتکلیف دہ اشیاء سے پاک وصاف رکھنا ایمان کا شعبہ ہے۔ اس سے پاک وصاف رکھنے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ راہ میں پڑی ہوئی چیز کوراہ سے دور کر دیا جائے اور دوسری یہ کہ راہ کی صفائی وپاکیزگی کیلئے کچھ ایسا اہتمام کیا جائے، کہ راہ میں کوئی ایسی چیز پڑنے ہی نہ پائے جوراہ روکیلئے تکلیف دہ ہو، اور جس سے لوگوں کواذیت پہنچے۔ اس ارشاد مبارک میں اہل بصیرت کے نزدیک یہ راز بھی ہے کہ انسان اپنی اناکوترک کردے اوراپنی ہستی کے دعوے سے دستبردار ہوجائے۔ اسلئے کہ یہی انا اور دعویٰ ہستی تمام شروقبائح کا مبداء ونقطہء آغاز ہے۔

بَرْدَارْ خَارُوسَنگ زِرَہِ ایں چِہْ رَمْزْبُوْدَ
یَعْنِیْ وَجُوْدِ خُوْدُ ھَمَہ بَرْدَارْ (ازاں میاں)

۷۔۔۔ **اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ**: منہیات شرعیہ اور منکرات ونامناسبات کے ارتکاب سے شرم رکھنا اور غیرت کھانا، ایمان کا شعبہ عظمیٰ ہے اور کارِ دین میں عمدہ وبہتر ہے۔ اسی لئے شعبہ ہائے ایمان کے مبدا ومنتہی کوذکر کرنے کے بعد خصوصی طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا۔

۸۔۔۔ 'کسی چیز سے منقبض ہونا اور ملامت کے خوف سے چھوڑنا'۔۔۔ از روئے لغت: حیاء ہے اور از روئے شرع: حیاء اس اندرونی خوبی کو کہتے ہیں جو نافرمودات اور تقصیرات سے پرہیز کرنے پر برانگیختہ کرے۔ حیاء اگرچہ ایک طبعی اور جبلّی چیز ہے، لیکن حیاء شرعی کے وجود میں بندہ کی ریاضت اور اسکے اختیار کا بھی اچھا خاصہ دخل ہے۔ جس طرح کہ اخلاق وتہذیب کی تمام قدروں پر انسانی اختیار وریاضت دخیل ہے۔ سیدالطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد گرامی ہے:

اَلْحَیَاءُ حَالَۃٌ تَتَوَلَّدُ مِنْ رُؤْیَۃِ الْآلَاءِ وَرُؤْیَۃِ التَّقْصِیْرِ

۔۔۔ اس کلام بلاغت نظام کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اپنی ذات میں خدا کی بیشمار نعمتوں کو دیکھتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ان نعمتوں کے شکریئے کا حق ادانہیں کر پارہاہے، توایک طرف نعمتوں کا دیکھنا اور دوسری طرف حق شکر کی ادائیگی میں تقصیر کا مشاہدہ کرنا، ان دونوں سے اندرونی طور پر اسکی ذات میں ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے جس کی تعبیر شرم وحیاء سے کی جاتی ہے۔

ا۔۔۔عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ: آپ کا اسم شریف کیا ہے؟ اس بارے میں علماء میں بڑا اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے اسم اصلی سے متعلق ۳۵ اقوال ملتے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں آپ کا نام عبد شمس یا عبد عمرو تھا۔ لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد آپ کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ نام کے ساتھ ساتھ آپ کے نسب میں بھی اختلاف ہے۔ آپ شہر 'دوس' کے رہنے والے تھے۔ حضرت حاکم ابواحمد کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک تمام باتوں میں جو سب سے زیادہ صحیح بات ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا اسم شریف عبدالرحمٰن بن صخر تھا۔ لیکن انکی کنیت انکے علم پر ایسا غالب آگئی گویا انکا کوئی نام ہی نہ تھا۔ علامہ نووی کا بھی حضرت ابو ہریرہ کے اسم اصلی کے بارے میں وہی خیال ہے جو حاکم ابواحمد کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ آپ کی کنیت ابو ہریرہ کیوں ہوئی؟ اس میں مختلف اقوال ہیں، مختلف روایتیں ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔ابن عبدالبر نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک روز میں اپنی آستین میں بلی لئے ہوئے تھا، تو حضور ﷺ نے مجھے اس حال میں دیکھا اور دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا یہ هِرَّةٌ ہے (بلی ہے)۔ آپ نے ارشاد فرمایا: یاابا هریرة (اے بلی والے) اس وقت سے آپ کو ابو ہریرہ کہا جانے لگا۔

﴿۲﴾۔۔۔ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ میں نے ایک بلی پائی تو اسکو میں نے اپنی آستین میں رکھ لیا، تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا هرّة (بلی) تو پھر مجھ سے کہا گیا کہ تو 'ابو هريرة' (بلی والا) ہے اور پھر یہ کنیت چل پڑی۔ بعض علماء نے ان دو روایتوں میں پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ایک قول ہے کہ آپ کو ابو ہریرہ کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ آپ بچپنے میں بلی کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے۔

﴿۴﴾۔۔۔ایک قول یہ ہے کہ آپ کو بلی بہت پیاری تھی اسلئے آپ کو ابو ہریرہ کہہ دیا گیا۔

﴿۵﴾۔۔۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کے والد ہی نے آپ کی کنیت ابو ہریرہ رکھ دی تھی۔
ان پانچوں اقوال میں ترجیح، اول کو حاصل ہے۔ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے، کہ بلی سے پیار و محبت اور اسکی نگہداشت ہی آپ کی اس کنیت کا سبب ہے۔۔۔ یہ خیال رہے کہ هرّة کہتے ہیں بلی کو اور هريرة اسکی تصغیر ہے، جسکا معنی ہے چھوٹی بلی۔حضرت ابو ہریرہ کے پاس چھوٹی ہی بلی تھی جو انکی آستین میں بآسانی بیٹھ جاتی تھی۔آپ خیبر کے سال شرف اسلام سے مشرف ہوئے اور پھر سایہ کی طرح ہمیشہ حضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ساتھ رہنے کا مقصد بارگاہِ نبوی کے فیوض و برکات سے مالا مال ہونا تھا۔اور علم کی دولت سے اپنے کو بہرہ ور کرنا تھا۔آپ نے ہر طرف سے بے فکر ہو کر کھانے پینے کی اس مقدار پر قناعت فرمائی، جس سے آپ کے شکم کو آسودگی حاصل ہو جائے۔آپ کا حافظہ بڑے ہی غضب کا تھا۔
امام بخاری فرماتے ہیں کہ آپ سے آٹھ سو سے زیادہ لوگوں نے روایت حدیث کی ہے، جن میں صحابی بھی ہیں اور تابعی بھی۔حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت جابر اور حضرت انس بھی آپ سے روایت کرنے والوں میں سے ہیں۔آپ سے پانچ ہزار تین سو چونسٹھ (۵۳۶۴) حدیثیں مروی ہیں۔ ۵۹ھ میں مدینہ منورہ میں آپ کی وفات ہوئی۔اس وقت آپ کی عمر شریف ۷۸ سال کی تھی۔ جنت البقیع میں آرام فرما رہے ہیں۔ جو یہ کہا گیا ہے کہ آپ کی قبر شریف 'عسفان' کے قریب کہیں ہے تو اسکی کوئی اصل نہیں، جیسا کہ امام سخاوی وغیرہ نے فرمایا ہے۔حضرت ابو ہریرہ زبردست قوت حافظہ والے، حافظ متین، ثبت ذکی، متقن اور صاحب صیام و قیام و ذکر و تسبیح و تہلیل تھے (رضی اللہ عنہ)۔ثبت: معتبر انسان جو روایت میں ثقہ ہو۔ مُتقِنُ: مضبوطی سے کام کرنے والا۔ مَتِین: مضبوط، قوی، سنجیدہ رائے، ذکی، تیز خاطر ہونا۔
۲۔۔۔قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِيْمَانُ : یہاں ایمان سے مراد مجازاً ایمانِ کامل کے ثمرات اور اسکے فروع ہیں۔اسلئے کہ یہ ثمرات وفروع ایمان کامل کے لوازم سے ہیں اور لازم بول کر ملزوم مراد لینا، یا ملزوم بول کر لازم مراد لینا، فصحاء کے نزدیک معروف و متعارف ہے۔
۳۔۔۔ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ: ایک روایت میں بضعة ہے۔یہ قِطْعَةٌ (چیز کا حصہ) کے معنی میں وضع کیا گیا ہے۔۔۔ پھر۔۔۔ استعمال میں تین سے دس تک کے عدد پر اسکا اطلاق کیا جانے لگا۔ان لفظوں کا استعمال کہاں سے کہاں تک کے عدد پر کیا جاتا ہے اس بارے میں قاموس

میں مختلف باتیں ملتی ہیں۔

﴿۱﴾ تین سے نو تک ﴿۲﴾ تین سے پانچ تک ﴿۳﴾ ایک سے چار تک ﴿۴﴾ چار سے نو تک ﴿۵﴾ خاص کر کے سات عدد کے معنی میں مستعمل ہے۔اس پانچویں قول کی تائید اس روایت سے بھی حاصل کی گئی ہے، جس میں سبع وسبعون (ستہتر) کا لفظ ہے۔حالانکہ اس روایت کی روشنی میں صرف اتنا ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حدیث زیرِ شرح میں سرکار نے بضعٌ (چند) سے خاص طور پر سات مراد لیا ہے۔اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں اسلئے کہ اس لفظ سے ایک قول پر تین سے دس تک کوئی بھی عدد مراد لیا جا سکتا ہے۔پھر یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ بَضعٌ کے معنی سبعٌ (سات) ہے۔ تین سے دس تک اور تین سے نو تک، ان دونوں اقوال کی روشنی میں سبعٌ (سات) لفظ بضع (چند) کے جملہ مصادیق میں سے ایک مصداق ہوگا۔جن دو اقوال کی روشنی میں میرا یہ فیصلہ ہے بضع سے متعلق جملہ اقوال میں وہی مشہور ومقبول اور ترجیح یافتہ ہیں۔

۴۔۔۔۔مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں بضع و سبعون کا لفظ ہے اور بخاری کی روایت میں بضع وستون ہے۔علامہ عینی فرماتے ہیں کہ بضع وسبعون کا لفظ بطریق ابی ذر مروی ہے۔ قاضی عیاض قدس سرہٗ نے پہلی روایت کی تصویب فرمائی ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ایک جماعت نے جس میں امام نووی بھی ہیں اسی پہلی روایت ہی کو ترجیح دی ہے۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ان دونوں روایتوں کے مابین اس لفظی اختلاف کا سبب یہ ہو کہ ان دونوں روایتوں کا راوی تو ایک ہی ہو، لیکن یہ دونوں روایتیں دو قضیوں سے متعلق ہوں، جسکی تشریح جواہر پارے میں ہو چکی ہے۔

۵۔۔۔۔**شُعْبَةٌ**: شعبة دراصل درخت کی شاخ اور ہر اصل کی فرع کو کہتے ہیں لیکن حدیث زیرِ شرح میں اس سے مراد خصلت حمیدہ ہے۔حاصل یہ ہوا کہ 'اَلْاِیْمَانُ ذُوْخِصَالٍ مَّتَعَدِّدَةٍ' ایمان متعدد خصلتوں والا ہے۔

۶۔۔۔۔ایک صحیح روایت میں بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ بابًا (ستّر کے کچھ اوپر باب) ہے۔ایک دوسری روایت میں 'اَرْبَعٌ وَسِتُّوْنَ بَابًا (چونسٹھ باب) ہے۔ان دونوں روایتوں میں 'بابًا' سے مراد ہے 'نوعًا من خصال الکمال' (یعنی کمال وخوبی والی خصلتوں کی نوع وقسم) ہے۔ایک تیسری روایت میں ہے۔ 'ثَلَاثٌ وَّثَلٰثُوْنَ شَرِیْعَةً مَّنْ وَافَی اللّٰهُ بِشَرِیْعَةٍ مِّنْهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ' (تینتیس ۳۳ راستے ہیں، ان میں سے کسی راہ پر چل کر جس نے اللہ کے حقوق پورے کر دیئے وہ جنتی ہے)

۔۔۔۔ابن شاہین نے روایت کی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی مِائَۃَ خُلُقٍ مَنْ اَتٰی بِخُلُقٍ مِّنْھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ

بیشک اللہ کیلئے سَو خلق ہیں، جوکوئی ان میں سے کسی خلق کواپنالے، وہ جنتی ہے

'خلق الٰہی' میں حیاء، رحمت، سخا، اور تسامح (نرمی برتنا) وغیرہا شامل ہیں، جو اللہ کی 'صفات علیا' سے ہیں اور اسمائے حسنٰی میں جن کا ذکر ہے۔

۷۔۔۔۔**فَاَفْضَلُھَا قَوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ**: یعنی جب ایمان بہت شاخوں والا ہوگیا، تو اس میں سب سے زیادہ افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے۔یعنی لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کرنا ہے۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔ قول سے مراد ذکر ہے،جسکی تائیداس روایت سے ہوتی ہے:

اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

سب سے زیادہ فضیلت والا ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے

۔۔۔۔یہاں قول کے مفہوم سے تصدیق قلبی کے خارج ہونے پر اجماع ہے۔رہ گئی شہادت لسانی،تو جنکے نزدیک یہ اسلام کے مفہوم میں جزء ہوکر داخل ہے، انکے نزدیک قول سے یہ بھی مراد نہیں ہوسکتی، اسلئے کہ اس صورت میں شہادت لسانی اصل اسلام ہے، نہ کہ اسکی فرع۔اور یہاں فرع کا ذکر ہے، نہ کہ اصل کا۔اور جنکے نزدیک 'شہادتِ لسانی' 'نفس اسلام' کیلئے شرط ہے،ان کیلئے قول سے 'شہادت' مراد لینے میں کوئی چیز مانع نہیں۔اس صورت میں ارشادنبوی کا حاصل یہ ہوجائے گا کہ لا الٰہ الا اللہ کی 'شہادت لسانی' ایمان کے ثمرات وفروع میں سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہے۔اس لئے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اس توحید کی خبر دیتا ہے جسکا ماننا ہر مکلّف کیلئے لازمی ہے اور اسی توحید کی صحت پر اسکے غیر کی صحت موقوف ہے۔پس یہ توحید اصل ہے، جس پر ایمان کی تمام شاخیں مبنی ہیں۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسلئے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ شرعًا اس توحید کے معنی کو متضمن ہے جو عین تصدیق ہے اور ازروئے عرف جسکا التزام بربنائے تحقیق تمام عبادتوں میں ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ زیرشرح سے مراد یہ ہوکہ لا الٰہ الا اللہ کہنا من وجہٍ یعنی بعض حیثیتوں سے افضل ہے۔ایسا نہیں کہ یہ من کل الوجوہ افضل ہو۔اسکی افضلیت کی صورت صرف یہ ہے کہ یہ خون ومال کی عصمت وحفاظت کا موجب ہے۔اوراگر۔۔۔۔بالفرض۔۔۔۔اسکو من کل الوجوہ افضل قرار دیا جائے، تو لازم آئے گا کہ یہ نماز وروزہ سے بھی افضل ہو۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ زیرشرح میں افضلیت سے 'زیارت مطلقہ' مراد لے لی جائے، جس میں کسی غیر کی طرف اضافت

ونسبت کا لحاظ نہ ہو کہ فلاں سے افضل ہے۔ بلکہ فی نفسہٖ بلندی اور رفعت شان کا اظہار مقصود ہو۔

اس صورت میں حاصل کلام یہ ہوگا کہ ایمان کی تمام شاخوں میں جسکی فضیلت و برتری تمام ادیان میں معروف ومشہور ہے وہ قول لا الٰہ الا اللہ ہے۔ جب کلمہء طیب کا پڑھنا افضل ہے، تو اسکا ثواب بھی افضل ہوا۔ اس حدیث سے اشارہ ملتا ہے کہ 'تیجہ' وغیرہ میں مردے کو کلمۂ طیبہ کا ثواب پہنچانا بہتر ہے۔

۸۔۔۔۔**وَاَدْنَاهَا**: اگر یہ 'دنو بمعنی قرب' سے ماخوذ ہے، تو اسکا معنی یہ ہے کہ 'ایمان کی ان تمام شاخوں میں منزل کے اعتبار سے بہت قریب اور مقدار و مرتبہ کے اعتبار سے بہت معمولی و گھٹیا ۔۔۔۔یعنی۔۔۔۔ جو ہاتھ آنے کے بہت قریب ہے اور جس سے تعلق پیدا کرنا بہت آسان ہے۔ اس صورت میں یہ 'رفیع المنزلت' کی ضد ہو جائے گی۔

ابن ماجہ کی روایت میں فَاَفْضَلُهَا کی جگہ 'فَارْفَعُهَا' (ان میں سب سے بلند مرتبہ) ہی ہے جو واضح طور پر ادناها کی ضد ہے۔ ایک روایت میں فافضلها کی جگہ فاقصاها (ان میں انتہائی بلند مرتبہ) ہے۔ اور اگر یہ 'دناءۃ' سے ماخوذ ہے تو حاصل کلام یہ ہوگا کہ ان تمام شاخوں میں سب سے کم فائدہ دینے والی چیز راہ سے اذیت دینے والی چیز کو ہٹا دینا ہے۔ چونکہ اس عمل سے ایک معمولی سی تکلیف دور ہوتی ہے۔ لہٰذا اسی حساب سے اسکا فائدہ بھی ہے۔

۹۔۔۔۔**اَمَاطَةُ الْاَذٰی**: اماطة مصدر ہے، جسکا معنی ہے 'زائل' کرنا۔ اذیٰ، موذی کے معنی میں یا یہ کہ اذیٰ کے معنی اذیت ہے، اور موذی کو اذیت مبالغۃً کہا گیا ہے۔ جیسا کہ عادل کو مبالغۃً عدل کہنا اہل زبان کے نزدیک معروف ومتعارف ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔ یہ کہ اذیٰ نام ہے اسکا جسکے ذریعہ کسی کو اذیت دیجائے، جیسے کانٹا، پتھر، غلاظت وغیرہ۔

۔۔۔۔حضرت حسن بصری کا ارشاد ہے:

اَلْاَبْرَارُهُمُ الَّذِیْنَ لَایُؤْذُوْنَ الذَّرَّوَلَا یَرْضُوْنَ الضَّرَ

یعنی ابرار و نیکو کار وہ ہیں، جو ایک چھوٹی چیونٹی کو بھی تکلیف نہیں دیتے

اور نہ کسی کو نقصان دینا پسند کرتے ہیں۔

ایک روایت میں اِمَاطَةُ الْعَظْمِ (ہڈی کا ہٹا دینا) ہے۔ خاص طور پر ہڈی کا ذکر صرف مثال کیلئے ہے، ورنہ مقصود کلام یہ ہے کہ اذیت دینے والی اور بری لگنے والی ہر چھوٹی بڑی چیز کو راہ سے ہٹا دیا جائے، خواہ وہ ہڈی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔ مخلوق کو فائدہ پہنچانا بڑا ثواب ہے۔ خواہ پانی ہی پلا کر انکی تشنگی دور کی جائے۔ اسلئے بعض لوگ سبیلیں لگا کر داخل حسنات ہوتے ہیں اور اس کارِ ثواب کو

انجام دے کر اسکے ثواب کو حضرات شہدائے کربلا اور انکے متعلقین کی ارواح طیبات کو نذر کر کے اپنی سعادت و نیک بختی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

۱۰۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں جن دو شعبوں کا صراحۃً ذکر ہے، ان میں پہلا 'عبادات قولیہ' سے ہے اور دوسرا 'طاعت فعلیہ' سے۔۔۔نیز۔۔۔پہلا فعلیہ ہے اور دوسرا ترکیہ۔۔۔اسی طرح۔۔۔پہلا حق کے ساتھ معاملہ ہے اور دوسرا مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک۔۔۔یونہی۔۔۔پہلا امر خداوندی کی تعظیم ہے اور دوسرا مخلوق الٰہی پر شفقت و مہربانی۔۔۔ایسے ہی۔۔۔پہلا اللہ کے حق کا قیام ہے اور دوسرا مخلوق کے حق کا۔ پس جو ان دونوں کو صدق دل سے قائم کر دے، تو اسکے صالحین سے ہونے میں شبہ نہیں۔

۱۱۔۔۔۔**وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ** : ایمان کے جملہ شعبوں میں حیاء ایک عظیم شعبہ ہے۔ یہاں حیاء سے مراد 'حیاء ایمانی' ہے۔'حیاء ایمانی' انسان کی اس خوبی کو کہتے ہیں جو اسکو بہ سبب ایمان فعل قبیح (برے کام) سے روکے۔۔۔۔مثلاً: کشف عورت اور جماع بین الناس وغیرہ۔ یہاں حیاء سے مراد وہ نفسیاتی حیاء نہیں، جسکو اللہ تعالیٰ نے نفوس میں پیدا کر دیا ہے۔ حیاءِ لغوی ہی حیاءِ نفسانی ہے۔ یعنی کسی چیز سے منقبض ہونا اور ملامت وعتاب کے خوف سے چھوڑنا۔

۱۲۔۔۔۔خصوصیت کے ساتھ حیاء کا ذکر کیوں فرمایا گیا؟ اسکا ایک جواب تو وہ ہے جو اہر پارے میں جسکی طرف اشارہ گزر چکا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایمان کے تمام شعبوں میں حیاء ہی ایک ایسا شعبہ ہے، جو تمام شعبوں کی طرف داعی ہے۔ اسلئے کہ جو شخص ایک طرف دنیا کی فضیحت اور دوسری طرف عقبیٰ کی قباحت بڑھ جانے سے خوفزدہ ہے، تو وہ یقیناً منہیات ومنکرات سے رک جائے گا۔ اور کھیل کود۔۔۔۔نیز۔۔۔۔فضولیات سے باز آجائے گا۔

۔۔۔۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

حَقِيْقَةُ الْحَيَاءِ اِنَّ مَوْلَاكَ لَا يَرَاكَ حَيْثُ نَهَاكَ

حیاء کی حقیقت یہ ہے کہ تمہارا آقا، تم کو وہاں نہ دیکھے، جہاں سے اس نے تم کو روکا ہے

یہی مقام احسان ہے، وہ احسان جو مراقبہ ومحاسبہ کے حال سے پیدا ہونے والے مشاہدہ سے موسوم ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔یہ حدیث جلیل، حدیث جبرئیل کا خلاصہ ہے جس میں فافضلها ایمان کی طرف اشارہ کرتا ہے، ادناها اسلام کی طرف راہ دکھاتا ہے اور کلمه والحياء احسان کا پتہ دیتا ہے۔ اسی لئے حضور نے فرمایا ہے کہ:

اِسْتَحْيُوا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ قَالُوْا اِنَّا لَنَسْتَحِىْ مِنَ اللّٰهِ

حَقَّ الْحَيَاءِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ قَالَ لَيْسَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ الْاِسْتِحْيَاءِ مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ اَنْ يَّحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَاحَوٰى وَالْبَطْنَ وَمَاوَعٰى وَيَذْكُرَ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى وَمَنْ اَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ زِيْنَةَ الدُّنْيَا وَآثَرَ الْآخِرَةَ عَلٰى الْاُوْلٰى فَمَنْ يَّعْمَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ اِسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِىْ وَصَحَّ الْحَيَاءِ خَيْرٌ كُلِّهٖ ﴿مرقات﴾

اللہ سے شرم کرو جیسا کہ شرم وحیاء کا حق ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول: الحمد اللہ ! ہم اللہ سے شرم کرتے ہیں جیسا کہ شرم کرنے کا حق ہے۔ حضور نے صحابہ کی ان باتوں کو سن کر ارشاد فرمایا، کہ اللہ سے حیاء کرنے کا وہی مطلب نہیں جو تم نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ اللہ سے کما حقہ حیاء کرنا یہ ہے کہ انسان اپنے سر اور اس میں جمع کردہ خیالات ونظریات اور اپنے پیٹ اور اس میں جمع کردہ غذاؤں پر نظر رکھے (نہ سر میں غلط خیال کا گزر ہو نہ شکم میں حرام مال کا)۔۔۔ نیز۔۔۔ موت وآزمائش کو یاد رکھے اور اس سے غافل نہ ہو۔ جس نے آخرت کو چاہا، دنیا کی زینت ترک کی، اور آنے والی گھڑی کو اس پہلی ساعت پر عملاً فضیلت دی، پس جس نے یہ سب کچھ کیا، تو بیشک اس نے اللہ سے کما حقہ شرم کی۔ اس حدیث کی روایت ترمذی نے کی ہے۔ جس سے اس بات کی تصحیح ہوگئی کہ حیاء ہی 'خیرِ کل' ہے۔

۱۳۔۔۔ ابن حبان فرماتے ہیں، کہ مجھے اس بات کی تلاش ہوئی کہ آخر وہ کون کون سے امور ہیں جو ایمان کی شاخیں ہیں۔ پھر میں نے تمام طاعتوں کو شمار کیا، تو وہ بضع وسبعون (ستّر و چند) سے کہیں زیادہ نکلیں۔ پھر میں سنت کی طرف رجوع ہوا اور احادیث نبوی میں جن جن طاعتوں کو ایمان کہا گیا ہے، ان کو جمع کرنے لگا، تو جو کچھ میں نے جمع کیا وہ بضع وسبعون (ستّر وچند) سے کم ٹھہرا۔ پھر میں نے کتاب وسنت دونوں کو ملا دیا اور جن جن امور کو کتاب وسنت میں ایمان قرار دیا گیا ہے، ان کو یکجا کیا تو ان کی کل تعداد سبع وسبعون (ستہتّر ۷۷) نکلیں۔ اس سے میں نے سمجھ لیا کہ حدیث زیر شرح میں سبع و سبعون (ستہتّر ۷۷) ہی مراد ہے۔

۱۴۔۔۔ علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ محققین کی ایک جماعت (جن میں علامہ بیضاوی اور علامہ کرمانی بھی ہیں) ایمان کی شاخوں کو بطریق اجتہاد شمار کرنے کے تکلف میں پڑی۔ ان میں سب سے زیادہ قرین قیاس اور مفہوم حدیث زیر شرح کے قریب، علامہ ابن حبان کا شمار ہے جنھوں نے ہر اُس خصلت کو یکجا کر لیا، کتاب وسنت میں جس کو ایمان فرمایا گیا۔ علامہ ابن حبان ہی کی

پیروی شیخ الاسلام ابوالفضل ابن حجر نے اپنی شرح بخاری میں کی ہے۔علامہ سیوطی نے علامہ ابن حبان اور شیخ الاسلام کی پیروی کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خصلتوں کوایمان کی شاخ قرار دیا ہے:

﴿۱﴾اللہ کی ذات پر ایمان ﴿۲﴾اللہ کی صفات پر ایمان

﴿۳﴾ اللہ کی ذات وصفات کے سواہر شیء کے حادث ہونے پر ایمان

﴿۴﴾فرشتوں پر ایمان ﴿۵﴾اللہ کی کتابوں پر ایمان ﴿۶﴾اللہ کے رسولوں پر ایمان

﴿۷﴾تقدیر کے خیر وشر کے اللہ کی جانب سے ہونے پر ایمان ﴿۸﴾قیامت کے دن پر ایمان

﴿۹﴾اللہ کی محبت ﴿۱۰﴾اللہ کیلئے محبت ﴿۱۱﴾اللہ کیلئے عداوت ﴿۱۲﴾نبی ﷺ کی محبت

﴿۱۳﴾حضور آیہء رحمت کی تعظیم کا اعتقاد اور آپ پر نذرانہء درود وسلام عرض کرنا اسی میں شامل ہے

﴿۱۴﴾سنت نبوی کی اتباع ﴿۱۵﴾اخلاص،نفاق وریاء کا چھوڑنا اسی میں شامل ہے

﴿۱۶﴾توبہ ﴿۱۷﴾خوفِ الٰہی ﴿۱۸﴾اللہ کی رحمت سے امید ﴿۱۹﴾شکر ﴿۲۰﴾وفاداری

﴿۲۱﴾صبر ﴿۲۲﴾رضا بالقضاء ﴿۲۳﴾حیاء ﴿۲۴﴾توکل ﴿۲۵﴾رحمت ومہربانی

﴿۲۶﴾تواضع،بزرگوں کی توقیر اسی میں شامل ہے ﴿۲۷﴾چھوٹوں پر شفقت

﴿۲۸﴾فخر وغرور وخود بینی کا ترک ﴿۲۹﴾حسد وکینہ پن سے کنارہ کشی ﴿۳۰﴾غصہ وغضب کا ترک

﴿۳۱﴾توحید کا اقرار ﴿۳۲﴾قرآن کی تلاوت ﴿۳۳﴾علم سیکھنا ﴿۳۴﴾علم سکھانا ﴿۳۵﴾دعاء

﴿۳۶﴾ذکر،استغفار کا شمار ذکر ہی میں ہے ﴿۳۷﴾لغویات سے اجتناب

﴿۳۸﴾حسی اور حکمی دونوں طرح کی طہارت حاصل کرنی،نجاستوں سے پرہیز اسی میں شامل ہے

﴿۳۹﴾ستر عورت ﴿۴۰﴾نماز خواہ فرض ہو یا نفل

﴿۴۱﴾سخاوت،کھانا کھلانا اور ضیافت کرنا اسی میں شامل ہے

﴿۴۲﴾زکوٰۃ،خواہ واجبہ ہو یا نافلہ ﴿۴۳﴾ مملوک غلاموں کے گلوں سے غلامی کا پٹہ اُتارنا

﴿۴۴﴾روزہ،فرض ہو یا نفل ﴿۴۵﴾اعتکاف ﴿۴۶﴾شب قدر کی طلب اور اس کی تلاش ﴿۴۷﴾حج

﴿۴۸﴾عمرہ ﴿۴۹﴾طواف ﴿۵۰﴾دینی فرار،ہجرت اسی میں شامل ہے ﴿۵۱﴾نذر پوری کرنا

﴿۵۲﴾ایمان کا قصد کرنا اور اسکو فضیلت دینا،ہر معاملہ میں ایمان والے پہلو کو اولیٰ اور افضل قرار دینا

﴿۵۳﴾کفّارات کی ادائیگی ﴿۵۴﴾نکاح میں پاکدامنی ﴿۵۵﴾عیال کے حقوق کا قائم رکھنا

﴿۵۶﴾والدین کے ساتھ حسن سلوک ﴿۵۷﴾اولاد کی تربیت ﴿۵۸﴾صلہ رحمی

﴿۵۹﴾خدا کی نافرمانی کے سوا جملہ امور میں اپنے سرداروں کی اطاعت

﴿۶۰﴾ غلاموں کے ساتھ نرمی وملائمت ﴿۶۱﴾ تمام معاملات میں انصاف کو قائم رکھنا

﴿۶۲﴾ جماعت کی اتباع کرنی ﴿۶۳﴾ اولی الامر کی اطاعت

﴿۶۴﴾ لوگوں کے مابین اصلاح ودرستگی کی فضا ہموار کرنی،

خوارج اور باغیوں سے قتال اسی زمرے میں ہے

﴿۶۵﴾ نیکیوں میں مدد کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں اسی خانے میں ہیں

﴿۶۶﴾ شرعی حدود کا قائم رکھنا

﴿۶۷﴾ جہاد مرابطہ یعنی لشکر کا دشمن کی سرحد کے پاس ہمیشہ قائم رکھنا اسی زمرے میں ہے

﴿۶۸﴾ امانت کی ادائیگی، اس زمرے میں خمس (پانچواں حصہ نکالنا بھی ہے)

﴿۶۹﴾ قرض دینا اور لئے ہوئے قرض کو وعدہ کے مطابق واپس کردینا

﴿۷۰﴾ ہمسائے کی عزت اور اس کی تعظیم کرنا

﴿۷۱﴾ حسن معاملہ، حلال طور پر مال جمع کرنا اسی زمرے میں ہے ﴿۷۲﴾ سلام کا جواب دینا

﴿۷۳﴾ چھینکنے پر یر حمك الله کہہ کر دعاء کرنا ﴿۷۴﴾ لوگوں سے تنگی، بدحالی دور کرنا

﴿۷۵﴾ لہوولعب سے پرہیز ﴿۷۶﴾ تکلیف دہ چیزوں کو راہ سے ہٹادینا

﴿۷۷﴾ مناسب طور پر انفاق مال، فضول خرچی اور اسراف سے بچنا اسی زمرے میں ہے

جس کی اعتقادی اور عملی زندگی مذکورہ بالا جملہ شاخوں کے انوار سے مزین اور آراستہ ہے یقیناً وہ مومن کامل ہے اور جو باوجود مکلّف ہونے کے، ان میں سے کسی ایک پر عمل پیرا نہ ہوسکا، اس کا ایمان ناقص ہے۔ اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ ایمان کی شاخوں کو شمار کرتے ہوئے شاخ نمبر ا سے شاخ نمبر ۸ تک میں جو لفظ ایمان مذکور ہے اس سے مراد تصدیق نہیں، بلکہ صرف اس تصدیق کا زبانی اعتراف مراد ہے۔ اسلئے کہ تصدیق تو اصل ایمان ہے، نہ کہ ایمان کی شاخ۔ اور حدیث زیر شرح میں ایمان کی شاخوں کا ذکر مقصود ہے، نہ کہ اصل ایمان کا۔

اس وضاحت کے بعد یہ ظاہر ہوگیا کہ حدیث زیر شرح میں عمل پر ایمان کا اطلاق دیکھ کر یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ عمل بھی ایمان کا جزء ہے۔ اور نہ یہ ہی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ایمان، اقرار وتصدیق اور عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ دونوں استدلال اسلئے نہیں کئے جاسکتے کہ حدیث میں الایمان (ایمان کی شاخیں ہیں) اور یہ ظاہر ہے کہ شاخیں اپنی اصل سے جدا ہوتی ہیں۔ حدیث میں ایمان کی تشبیہ ایک درخت سے دی ہے، جو شاخوں اور ٹہنیوں والا ہے۔ جس طرح کہ قرآن نے

اس کلمہ کی، جو حقیقت ایمان پر دال ہے ایک درخت سے تشبیہ دی ہے، جسکی جڑ قلب میں ہے اور شاخیں آسمان تک جا پہنچی ہیں۔

۱۵۔۔۔۔**مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ**: اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ بخاری، مسلم کی روایتوں کی جو اصل ہے وہ ایک ہی ہے۔ دونوں نے حضرت ابو ہریرہ ہی سے روایت کی ہے اور وہ اصل روایت یہ ہے: الایمان بضع وسبعون شعبۃ۔ رہ گیا فافضلها اور اسکے بعد عن الطريق تک اسکی روایت مسلم نے تو کی ہے، لیکن بخاری نے نہیں کی ہے۔ علامہ سیوطی نے فرمایا ہے کہ بخاری نے بضع و سبعون کا ذکر تو کیا ہے، مگر شک کے ساتھ یوں کیا ہے بضع و ستّون اوبضع وسبعون شعبة اور اصحاب سنن ثلاثہ نے بضع وسبعون کو بلا شک ذکر کیا ہے اور ابو اعونہ کی صحیح میں ستّ وسبعون اوسبع وسبعون (۷۶ یا ۷۷) کا ذکر ہے۔۔۔نیز۔۔۔ترمذی میں اربع وستّون کا لفظ ہے۔ علامہ میرک فرماتے ہیں کہ ترمذی کی روایت میں 'اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ' کا فقرہ ساقط کر دیا گیا ہے۔
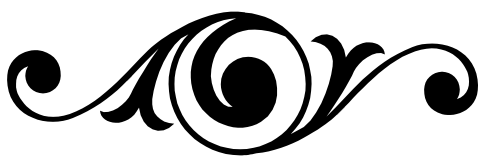
عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَانَھَی اللّٰہُ عَنْہُ ھٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیْ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرٌ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ.

حضرت عبداللہ ابن عمرو سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور جسکے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس سے خدا نے روکا ہو۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرو فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سے کون سا مسلمان بہتر ہے۔ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔

جواہر پارے

۱۔۔۔**اَلْمُسْلِمُ**: اس حدیث میں مسلمان سے کامل مسلمان مراد ہے۔

۲۔۔۔**مِنْ لِّسَانِہٖ**: کسی کو گالی دینا، کسی کی غیبت کرنا، اور کسی کو نا سزا و نالائق قرار دینا وغیرہ، یہ سب زبان سے اذیت پہنچانا ہے۔ اور کامل مسلمان وہ ہے جو کسی مسلمان کو اس طرح کی اذیت نہ پہنچائے۔ اور ہر مسلمان اس کی زبان کی اذیتوں سے محفوظ رہے۔

۳۔۔۔**وَيَدِہٖ**: کسی کو مارنا، کسی کا مال غصب کرنا اور ظلم وستم سے کسی کو رنج پہنچانا وغیرہ۔ یہ سب ہاتھ سے اذیت پہنچانا ہے اور کامل مسلمان وہ ہے جو کسی مسلمان کو اس طرح کی کوئی بھی اذیت نہ پہنچائے۔ اور ہر مسلمان اس کے ہاتھ کی اذیتوں سے محفوظ رہے۔

۴۔۔۔ **مِن لِّسَانِہٖ وَيَدِہٖ**: حدیث پاک میں زبان اور ہاتھ کی تخصیص صرف اس وجہ سے ہے کہ ایذا پہنچانے کی جتنی قسمیں ہیں ان میں سے اکثر انھیں دو سے صادر ہوتی ہیں۔

۵۔۔۔ لسان (زبان) کو، ید (ہاتھ) پر، مقدم فرمایا گیا ہے اسلئے کہ زبان کی ایذا زیادہ سخت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ اذیت پہنچانی عام ہے اور نسبتاً آسان ہے۔۔۔۔ نیز۔۔۔ ہاتھ کے ذریعہ صرف حاضرین کو اذیت دی جاسکتی ہے، مگر زبان کے ذریعہ اہل زمانہ کے سوا گزرے ہوئے اور آنے والے لوگوں کو بھی ایذا دی جاسکتی ہے۔ تحریر، زبان کے حکم میں ہے۔ بلکہ تحریر میں تو زبان اور ہاتھ دونوں کی شرکت ہو جاتی ہے۔

۶۔۔۔**سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ**: اس خاص امر میں 'ذمی' اور 'مطیع الاسلام' کافروں کو مسلمانوں کا تابع قرار دیا ہے۔ یعنی کامل مسلمان وہ ہے جو نہ کسی مسلمان کو اذیت پہنچائے اور نہ کسی ذمی کافر کو۔۔۔ الغرض۔۔۔ حدیث پاک میں مسلمانوں کی تخصیص باعتبار غالب واقع ہوئی ہے۔ ابن حبان کی روایت میں من سلم الناس کا فقرہ ہے جو بہت عام ہے۔ ﴿کذا ذکر السیوطی﴾ ہر صورت میں حدیث شریف کا منشاء یہ ہے کہ کسی کو ناحق ایذا نہ پہنچائی جائے لیکن اگر شریعت حکم فرمائے، تو زجر و توبیخ اور ضرب و شتم سبھی جائز ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو واجب ہے ۔۔۔ الحاصل۔۔۔

مسلمانوں کا یہ کردار نہیں کہ لوگوں کو اذیت دیں۔مسلمانوں کا کردار تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائیں اور جس مسلمان میں یہ خوبی نہیں، گویا وہ مسلمان نہیں ہے۔اس کلام سے یہ مقصود نہیں ہے کہ جس میں صرف یہی ایک خوبی ہو وہ مسلمان کامل ہے۔خواہ اس میں دوسری اسلامی خوبیاں ہوں یا نہ ہوں، جیسا کہ ملحدین کا خیال ہے کہ:

مباش درپئے آزاروھر چه خواهی کن
که در شریعت ماغیر ازیں گناهی نیست
کسی کو تکلیف نہ دو اسکے سوا جو چاہو کرو۔اسلئے کہ ہمارے
مذہب میں کسی کو ایذا اور آزار پہنچانے کے سوا اور کوئی گناہ نہیں

۔۔۔المختصر۔۔۔حدیث زیر شرح کا حاصل مراد یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ بندوں کے بھی حقوق بجالائے وہ مسلمان کامل ہے۔

۷۔۔۔**اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ**: دارکفر سے نکل کر دار اسلام میں آنا، ازروئے شرع، ہجرت ہے۔معلوم ہوا کہ فتنے سے بھاگنا بھی، ازقسم دین ہے۔اس ہجرت کو ہجرت ظاہری کہتے ہیں۔ہجرت باطنی 'موطن طبیعت' سے نکل کر 'مدینہ شریعت' میں آباد ہونے کا نام ہے۔ہجرت باطنی والا ان تمام امور کا تارک ہوتا ہے اور ان تمام اشیاء سے بھاگتا ہے، نفس شیطان جنکی طرف دعوت دیتا ہے۔ہجرت سے درحقیقت شریعت مطہرہ کی غرض یہی ہے کہ انسان 'موطن طبیعت' سے نکل کر 'مدینہ شریعت' میں آجائے۔تو جس انسان سے یہ غرض حاصل ہو، وہ حقیقتاً اور معنیً مہاجر ہے، خواہ وہ اپنے وطن ہی میں کیوں نہ ہو۔لیکن جس پر ہجرت ظاہری بھی واجب ہو، وہ بغیر ظاہری ہجرت کے مہاجر حقیقی نہ ہوگا۔جیسا کہ عہد رسالت میں مسلمانوں پر مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانا واجب تھا۔

اس حدیث سے مقصود یا تو یہ ہے کہ ترک مناہی پر مہاجرین کو کامل رغبت حاصل ہو جائے اور وہ صرف ہجرت کی ظاہری صورت ہی کو کافی نہ سمجھ لیں۔۔۔یا۔۔۔اس سے ان لوگوں کو تسلی دینی مقصود ہے جنھیں ہجرت ظاہری نہ مل سکی، لیکن وہ تارکین منہیات سے ہیں۔اس ارشاد کو سن کر ان کو اطمینان حاصل ہو گیا، کہ گو ظاہری ہجرت کی صورت ان کیلئے نہ نکل سکی، لیکن شریعت کی پابندی کے سبب وہ بھی اس کے ثواب سے محروم نہ رہے۔

۸۔۔۔**وَلِمُسْلِمٍ**۔۔الخ: مسلم شریف میں 'وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ' کا فقرہ نہیں ہے۔لیکن صاحب مشکوٰۃ کے طرز کلام سے اس بات کا ایہام ہوتا ہے کہ مسلم شریف میں یہ مذکورہ فقرہ بھی ہے۔

ا۔۔۔عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو :عمرو میں 'واؤ' زائد ہے، جو صرف لکھنے میں آتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔'واؤ' کو زائد کرنے کی وجہ یہ ہے تا کہ 'عمر' کو کوئی عمرو نہ سمجھ لے۔عمرو منصرف ہے، عمر غیر منصرف۔اعراب کے نقطۂ نظر سے دونوں کے فرق کو مندرجہ ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

ا۔ جَآءَ عَمْرٌو (عمرو آیا) جَآءَ عُمَرُ (عمر آیا)

۲۔ رَاَیْتُ عَمْرًا (میں نے عمرو کو دیکھا) رَاَیْتُ عُمَرَ (میں نے عمر کو دیکھا)

۳۔ مَرَرْتُ بِعَمْرٍو (میں عمرو کے پاس سے گزرا) مَرَرْتُ بِعُمَرَ (میں عمر کے پاس سے گزرا)

ان تمام مثالوں میں اعراب میں نے لگا دیا ہے مگر اس طرح زیر وزبر وغیرہ لگانا کچھ ضروری تو نہیں۔جبھی تو عربی کی تحریروں میں اعراب لگانے کا اہتمام اہل زبان۔۔۔یا۔۔۔زبان داں حضرات کیلئے غیر ضروری ہے۔اب اگر آپ مذکورہ بالا مثالوں سے اعراب (زبر زیر وغیرہ) ہٹا دیجئے تو پھر آپ خود محسوس کریں گے کہ پہلی اور تیسری مثال میں صرف واؤ کا حرف ہے جو عمرو اور عمر میں امتیاز پیدا کئے ہوئے ہے۔اگر اس واؤ کو ہٹا دیا جائے تو صرف عمر بچتا ہے۔اب یہ فیصلہ کرنا یہ عَمر ہے کہ عُمر، یہ ایک دشوار چیز ہے۔ہاں مثال ۲۔ میں چونکہ عمرو کے بعد الف لگتا ہے اور عُمر کے بعد نہیں لگتا اسلئے اس صورت میں بغیر واؤ کے بھی ان دونوں کے مابین امتیاز ہو جاتا ہے۔اسی لئے اس مخصوص حالت (حالت نصب) میں عمرو کے بعد واؤ لانے کی ضرورت نہیں، اس لئے نہیں لایا جاتا۔اتنی تفصیل اسلئے اختیار کی گئی تا کہ اصولی اور اصطلاحی الفاظ استعمال کم سے کم رہے۔

۲۔۔۔حضرت عمرو رضی اللہ عنہ عاص ابن وائل سہمی قرشی کے فرزند تھے۔انھیں حضرت عمرو کے صاحب زادے حضرت عبداللہ ابن عمرو ہیں۔جو حدیث زیر شرح کے راوی ہیں۔حضرت عبداللہ کا نام ابتداءً آپ کے دادا کے نام پر رکھا گیا۔جس کو خاص طور پر آنحضرت ﷺ نے عبداللہ کے نام سے بدل دیا۔۔۔الغرض۔۔۔آپ کا یہ اسم شریف حضور نبیء کریم کا خاص عطیہ ہے۔آپ اعلیٰ درجہ کے عابد، عالم، صائم، قائم اور متقی و پرہیز گار تھے۔اپنے والد سے پہلے شرف اسلام سے مشرف ہوئے۔۶۵ھ

۔۔۔یا۔۔۔۳۷ھ میں مکہ میں ۔۔۔یا۔۔۔طائف میں ۔۔۔یا۔۔۔مصر میں آپ کی وفات ہوئی۔آپ کے اور آپ کے والد کے درمیان عمر میں صرف گیارہ سال کا فرق تھا۔بعض علماء نے اسکو یقین واعتماد کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسکو آپ کی خصوصیتوں میں شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ علامہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے والد آپ سے ۱۳ سال بڑے تھے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۱۲ سال بڑے تھے۔آپ نے نبی ٔکریم سے کتابت حدیث کی اجازت طلب کی، تو آپ کو اجازت مل گئی اور پھر آپ احادیث نبوی کی کتابت فرماتے رہے۔آپ کے پاس حضرت ابوہریرہ سے بھی زیادہ حدیثوں کا ذخیرہ تھا۔مگر آپ سے صرف سات سو حدیثیں مروی ہیں۔حضرت ابوہریرہ کا ارشاد ہے کہ میرے اور اُن کے درمیان صرف اتنا ہی فرق ہے کہ وہ حدیثوں کو لکھتے ہیں، میں لکھتا نہیں۔حضرت عبداللہ اپنی عمر شریف کے اخیر میں نابینا ہوگئے تھے۔آپ محبِّ اہل بیت تھے، اگرچہ اپنے والد بزرگوار کی رضا کیلئے جس کی وصیت بارگاہ رسالت سے آپ کو مل چکی تھی، آپ حضرت امیر معاویہ اور اپنے والد محترم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ رہے۔

۳۔۔۔**قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمُ:** بعض احادیث ماسبق سے اسلام کے معنیٰ کی وضاحت ہوگئی ہے، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ یہاں لفظ المسلم کی ضمن میں جس اسلام کی خوبی دکھانی مقصود ہے وہ اسلام کامل ہے۔لہٰذا اب یہاں 'مسلم' سے 'مسلم کامل' مراد ہوا۔۔۔یا۔۔۔یہ کہ 'مسلم' سے مراد 'مسلم حقیقی' ہے، جو اسلام کے معنی لغوی (استسلام) سے متصف ہو۔استسلام کہتے ہیں فرمانبردار ہونے کو۔اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ خدا اور رسول کا حقیقی فرمانبردار واطاعت شعار وہ ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق کی بھی حفاظت کرے۔

۴۔۔۔**مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ** : یہاں مسلمون (مسلمان مردلوگ) میں تغلیباً یا تبعًا مسلمات (مسلمان عورتیں) بھی داخل ہیں۔رہ گئے اہل ذمہ (ذمی کفار)، وہ حکماً انھیں کے ساتھ ملحق ہیں۔

۵۔۔۔**اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ**۔۔۔الخ: مسلم وہ ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے مسلم محفوظ رہیں۔اس مقام پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس ارشاد میں مسلم کی تعریف میں مسلم کو جزء قرار دیا ہے، تو اب مسلم کو سمجھنے کیلئے مسلم کا سمجھنا ضروری ہوا۔یعنی مسلم کا عرفان مسلم کے عرفان پر موقوف رہا۔اس کو اصطلاحی زبان میں 'توقف الشئی علیٰ نفسہٖ' کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شئی کا اپنے ہی اوپر

موقوف ہونا باطل ہے۔اس کی تعبیر 'دور' سے کی جاتی ہے اور 'دور' کا باطل ہونا اپنے مقام پر ثابت ہے۔میرے خیال ناقص میں اس 'دور' کو اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ اسلام کا لغوی معنی 'انقیاد' ہے۔ اور 'انقیاد' کی ایک صورت استسلام (فرمانبردار و تابعدار ہونا) ہے۔ اور دوسری صورت 'تذلل' (خاکساری وفروتنی کرنا) ہے،تو المسلم کا معنی یہ کیا جائے کہ خدااوررسول کا سچا فرمانبردار یا کامل اطاعت شعاراور المسلمون کا یہ معنی کیا جائے کہ 'خاکساری وفروتنی کرنے والے لوگ'،تواب اس میں تمام مسلمان مردوعورت سبھی داخل ہونگے۔اسلئے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں خاکساری وفروتنی کرنے والے ہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔'ذمی کفار' بھی اس میں شامل ہوجائیں گےاسلئے کہ وہ اسلام کی سیاسی ماتحتی قبول کرکے مسلمانوں کے روبروخاکساروفروتر ہوگئے۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔یہاں المسلم جس معنی میں مستعمل ہے، المسلمون اُس معنی میں نہیں۔لہٰذااب 'دور' نہ رہا۔

۶۔۔۔۔مِنْ لِّسَانِہٖ :کسی پرلعن کرنا،کسی پر بہتان تراشنا،کسی کی چغل خوری کرنی،کسی کی شکایت سلطان وقت یاحکام تک پہنچانی وغیرہا،امور بھی زبان کی ایذارسانی میں شامل ہیں۔ان کے علاوہ بعض امور کی طرف جواہر پارے میں اشارہ گزرچکا ہے۔ایک قول کے مطابق:

'اَوَّلُ بِدْعَةٍ ظَهَرَتْ قَوْلُ النَّاسِ الطَّرِيْقَ الطَّرِيْقَ'

سب سے پہلے بدعت جوظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ لوگ گلی گلی،

کوچہ کوچہ،ہر ہر راہ پرلوگوں کی غیبت وغیرہ کرنے لگے۔

۔۔۔۔زبان کے ذریعہ اذیت دینی کس قدر سخت ہوتی ہے اسکااندازہ اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَاالتِيَامُ وَلَايَلْتَامُ مَاجَرَحَ اللِّسَانُ

نیزے کے زخم بھرجاتے ہیں لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا

۷۔۔۔۔زبان بھی عجیب چیز ہے جو مسرت بخش بھی ہوتی ہے اور اذیت رساں بھی۔ ۔۔۔بولی کا کام اگرلوگوں کو ملانا ہے تو دوسری طرف کاٹنا بھی ہے۔۔۔۔ملانے والی بھی بولی ہوتی ہے اور کاٹنے والی بھی۔۔۔۔اسکااثر دیکھنا ہوتو آیئے اور دیکھئے۔۔۔۔یہ دو اجنبی ہیں:ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔بڑی دوری ہے۔دونوں کے مابین دبیز حجابات ہیں۔فرقت کی گہری اور طویل وعریض خلیجیں ہیں۔مگر بایں ہمہ ایک محفل عقد سجائی گئی۔قاضی صاحب نے نوشہ میاں کو مخاطب کرکے کہا کہ میں نے اپنی وکالت میں فلاں بنت فلاں کواس مہر کے عوض تمہاری زوجیت میں دیا،تم نے قبول کیا،نوشہ میاں نے کہا کہ 'میں نے قبول کیا'۔دیکھا آپ نے نوشہ میاں کی زبان سے جو

کچھ نکلا وہ ایک بولی ہی تو ہے۔لیکن اس بولی نے کام یہ کیا کہ دو اجنبیوں کے درمیان جو دوری تھی دفعۃً ختم ہوگئی۔دبیز حجابات جل کر خاکستر ہوگئے۔فرقت و ہجر کی ساری خلیجیں ہوا ہوگئیں۔۔۔۔دیکھا یہ ہے ملانے والی بولی جس نے ملایا تو کیسا ملایا۔۔۔

اب آیئے دوسرے رخ پر نظر رکھئے۔یہی دو ملنے والے، محرم راز اور ہمدم و دمساز، جو ایسے ملے کہ ملاپ کی انتہا تک پہنچ گئے۔مگر اسکے باوجود جب ایک دن کسی بات پر یا یونہی شوہر نامدار کو طیش آیا اور انھوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا،'میں نے تم کو تین طلاق دیا'، تو پھر دفعۃً وہی دوری ہوگئی، وہی حجابات انکے درمیان حائل ہوگئے اور وہی دریا کے دو کناروں کا بُعد انکے مابین پیدا ہوگیا۔

دیکھا آپ نے یہ بھی تو بولی ہی ہے، جس نے دو ملے ہوؤں کی رداء وصال پر کس سرعت اور تیزی کے ساتھ قینچی چلادی۔اب اگر طلاق دینے والا، مفتی شہر کی بارگاہ میں حاضر ہو اور کہے مفتی صاحب یقین جانئے میرے دل میں اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے، بڑا عشق ہے، نہایت ہمدردی ہے، میں نے اسکو دل سے طلاق نہیں دیا ہے، یہ تو کمبخت زبان ہے جو بہک گئی۔مفتی صاحب میرے دل کو دیکھئے، زبان کو نہ پکڑیئے۔لفظوں میں نہ الجھئے۔اس صورت میں مفتی صاحب مسکرا کر جواب دیں گے کہ نادان تیرے دل میں کچھ بھی بھرا ہو لیکن بولی کا جو کام تھا وہ ہوگیا۔دل چیر کر دیکھنا مفتی کا کام نہیں ہے۔اے نادان یہ سن لے تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے۔اگر تیرے دل میں اپنی منکوحہ کی محبت و اُنسیت ہوتی تو زبان سے عداوت کی بولی کیوں نکلتی ؟۔۔۔۔تیری بولی بتا رہی ہے کہ تیرے دل میں کیا ہے۔۔۔ زبان و تحریر سے کاٹنے والی اور عداوت والی بولیاں نکالنا، اور پھر محبت کا ادعاء کرنا پاگل کی بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

۔۔۔الغرض۔۔۔۔ ہر بولنے والے پر لازمی ہے کہ وہ بولنے سے پہلے اچھی طرح یہ سمجھ لے کہ کاٹنے والی کون سی ہے، اور ملانے والی کون سی ؟۔۔۔کفر کی بولی کیا ہے، ایمان کی بولی کیا ؟۔۔۔ شرک کی بولی کسے کہیں گے اور توحید کی بولی کسے؟۔۔۔توہین کے کلمات کیا ہیں اور تعظیم کے کلمات کیا؟ ۔۔۔مسرت بخش الفاظ کون سے ہیں اور اذیت رساں کون سے؟۔۔۔آج کا دَور بہت پر آشوب دَور ہے۔زبان و تحریر سے اذیت دینے والے شقاوتِ قلبی کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں، کہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کی شانِ اقدس میں طرح طرح کی گستاخیاں کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کی بارگاہ قدس میں بھی اپنی موشگافیوں سے باز نہیں آتے۔اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے گستاخانہ کلام کی اشاعت اور اس کی تشہیر کرتے رہتے ہیں۔اور اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ

انھیں ایک دن خدائے عز وجل کی بارگاہِ عدالت میں حاضری دینی ہے۔

۸۔۔۔۔ **وَیَدِہٖ**: کسی کو قتل کر دینا۔ کسی کے مکان وغیرہ کو گرا دینا۔ کسی کو کہیں سے بالجبر ہٹا دینا۔ جھوٹی اور غلط باتیں لکھنا وغیرہا، ہاتھ سے اذیت دینا ہے۔ ہاتھ سے اذیت دینے والی بعض چیزوں کا ذکر جواہر پارے میں کیا جا چکا ہے۔

۹۔۔۔۔ 'زبان' کی جگہ 'قول' کا لفظ نہیں رکھا۔ تاکہ وہ اذیتیں بھی اس زمرے میں آجائیں جو بطور استہزاء، قول کے بجائے اشاروں یا کسی اور طرح سے دی جاتی ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حدیث زیرِ شرح میں **یَد** (ہاتھ) سے کنایۃً تمام جوارح مراد ہیں۔ اسلئے کہ 'جوارح' کے بہت سارے بنیادی افعال کا صدور ہاتھ ہی سے ہوتا ہے۔۔۔۔ مثلاً: پکڑنا، ملانا، روکنا، لینا، وغیرہا، ہاتھ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

۱۰۔۔۔۔ ہاتھ کی اسی مرکزی حیثیت کے پیشِ نظر محاورۃً ہر عمل کیلئے خواہ اسکا وقوع بذریعہ ہاتھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، کہا جاتا ہے:

'ھٰذَا مِمَّا عَمِلَتْهُ اَيْدِيُهِمْ'

یہ ان کاموں میں سے ہے جنھیں اُنکے ہاتھوں نے کیا

۔۔۔۔ اس قول پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایدی اور یدین کو انفس اور نفس کی جگہ ضرور رکھا جاتا ہے۔ اسلئے کہ اکثر افعال کا صدور انکے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن لفظ ید (جو مفرد ہے) اسکا استعمال اس معنیٔ مذکور میں معروف و متعارف نہیں۔ ید:- ایک ہاتھ، یدین:- دو ہاتھ۔ ایدی: - بہت سے ہاتھ، نفس ذات، اسکی جمع انفس۔

۱۱۔۔۔۔ 'حد و تعزیر': بچوں کی تادیب اور دو حملہ آوروں کے مابین بیچ بچاؤ کرنا وغیرہ وغیرہ، اذیت رسانی نہیں۔ اسلئے کہ انکا مقصد صلاح و سلامتی ہے۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ اسلئے کہ یہ شرعاً مستثنیٰ ہیں ۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ اسلئے کہ عرفِ عام میں ان پر اذیٰ (اذیت رساں چیز) کا اطلاق نہیں ہوتا۔

۱۲۔۔۔۔ **وَالْمُهَاجِرُ**: یعنی کامل مہاجر یا حقیقی مہاجر۔ اسلئے کہ یہ مخصوص ہجرت، ہجرت کی تمام انواع کو شامل ہے۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ اسکے فضل کو دوام و ہمیشگی ہے۔

۱۳۔۔۔۔ **مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ**: هَجَرَ۔ تَرَكَ۔ (چھوڑ دیا) کے معنی میں ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مہاجر حقیقی وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیا، جن سے کتاب و سنت میں اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے۔ ایک روایت میں ہے 'ماحرّم اللّٰہ علیه' اللہ نے جسکو حرام کر دیا۔

۱۴۔۔۔مهاجرة باب مفاعلة سے ہے جو مشارکۃ چاہتا ہے۔ مشارکۃ، مغالبۃ (ایک دوسرے پر غلبہ کی کوشش کرنا) کی صورت چاہتی ہے، جو اس مقام پر صحیح نہیں۔لہٰذا اب اس مقام پر مهاجرة سے صرف هجروترك میں مبالغہ مقصود ہے۔۔۔الغرض۔۔۔یہاں هاجر بمعنی هجر ہے۔یعنی 'مفاعلة' موافقت مجرد کیلئے ہے۔

۱۵۔۔۔**هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیُ:** ابوداؤداورنسائی نے بھی اسکی روایت کی ہے۔

۱۶۔۔۔ **وَلِمُسْلِمٍ:** یعنی صحیح مسلم میں مذکور بالا روایت کا بعض حصہ ہے کیونکہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں مذکورہ روایت کے جزءاوّل یعنی اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ کی تخریج بلفظ حضرت جابر سے مرفوعًا کی ہے۔اوراسی کے معنی میں حضرت عبداللہ ابن عمرو سے روایت کی ہے۔اور میری روایت جو حضرت عبداللہ ابن عمرو سے مسلم نے کی ہے۔اور جو بخاری کی روایت سے معنوی تعلق رکھتی ہے۔ وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا سَالَ النَّبِیَّ۔۔الخ سے بیان کی جارہی ہے۔

۱۷۔۔۔**سَالَ النَّبِیَّ:** ایک نسخہ میں لفظ نبی کی جگہ رسول اللہ کا لفظ ہے۔

۱۸۔۔۔**اَیُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ:** یعنی جنس مسلمان میں سے کون سا فرد۔۔یا۔۔انواع مسلمین میں سے کون سی قسم افضل واکمل ہے۔بخاری کی روایت میں 'ایّ الاسلام افضل قال من سلم' ۔۔۔الخ کے الفاظ ہیں۔ من سلم ۔۔۔الخ سے مراد اسلام من سلم ۔۔۔الخ ہے۔یعنی جب سوال یہ کیا گیا کہ کون سا اسلام افضل ہے؟ تو جواب یہ عطا کیا گیا کہ اسکا اسلام جس کی زبان و ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ لفظ 'ایّ' زبان عرب میں متعدد ہی پر داخل ہوتا ہے، خواہ وہ متعدد محذوف ہی کیوں نہ ہو۔لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں سوال میں کچھ محذوف ہو۔ جس کی تقدیر عبارت یہ ہو 'ایُّ اصحاب الاسلام' اسلام والے لوگوں میں سے کون سے لوگ افضل ہیں۔یا یہ ہو 'ایّ خصال الاسلام' اسلام کی خصلتوں میں سے کون سی خصلت افضل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے 'ایّ الاسلام' میں اسلام بمعنی 'مسلم' ہیں۔جیسے عدل بمعنی عادل ہے۔اور عادل کو مبالغۃً عدل کہنا۔۔۔نیز۔۔۔مسلم کو مبالغۃً اسلام کہنا زبان وادب میں روا ہے۔

۱۹۔۔۔لفظ خير اور لفظ افضل اگرچہ دونوں اسم تفضیل ہی سے ہیں، مگر ان دونوں کے مابین ایک نازک سا فرق بھی ہے۔اسلئے کہ 'خیریت' دراصل اس منفعت کا نام ہے جو 'شر' اور 'مضرت' کے مقابل ہے تو یہ کیفیت سے ہوگئی۔اور 'فضیلت' درحقیقت کثرت ثواب کا نام ہے جو 'قلت' کے مقابل ہے، تو اس کا تعلق 'کمیت' سے ہوگیا۔

۲۰۔۔۔ اَیُّ الْمُسْلِمِیْنَ ۔۔۔الخ **اور** "ای الاسلام"۔۔۔الخ **یہ دونوں روایتیں اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ روایت سابقہ یعنی** "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ"۔۔۔الخ **میں** المسلم **سے مراد** "المسلم الکامل" **(کامل مسلمان) ہے۔اسی بنیاد پر خطابی نے کہا ہے کہ اس کلام** (المسلم من سلم ۔۔۔الخ) **کا انداز ایسا ہی ہے جیسا کہ اہل عرب کے اس قول کا:**

۔۔۔۔وہ کہا کرتے تھے "النّاسُ العَرَبُ"

عرب والے ہی آدمی ہیں

۔۔۔۔تو اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انکے سوا کوئی انسان ہی نہیں ہے۔یا وہ اپنے سوا کسی کو انسان نہیں سمجھتے تھے۔بلکہ اس کلام کی منشاء یہ ہے کہ 'ھم افضل النّاس' **یعنی عرب کو اور لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔حدیث پاک کی روشنی میں مسلمانوں میں سب سے افضل وہ ہے، جو اللہ کے حقوق بھی ادا کرے اور بندوں کے حقوق بھی۔اب رہ گیا یہ سوال کہ پھر حدیث زیر شرح میں صرف بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے ذکر پر کیوں اکتفاء کیا گیا۔تو اس میں مختلف حکمتیں ہو سکتی ہیں۔جن میں سے چند یہ ہیں:**

﴿۱﴾۔۔۔حقوق العباد کی ادائیگی کو لازمی قرار دینے سے حقوق اللہ کی ادائیگی کا لازم ہونا بطریق اولیٰ سمجھ لیا گیا۔اسلئے اسکے ذکر کی ضرورت نہ رہی۔

﴿۲﴾۔۔۔حقوق اللہ کا ترک عفو و مغفرت کے زیادہ قریب ہے، بخلاف حقوق العباد کے۔اسی لئے حقوق العباد کی ادائیگی کا ذکر خاص طور پر کیا گیا تا کہ اسکی اہمیت محسوس کی جا سکے۔

﴿۳﴾۔۔۔حقوق اللہ کی ادائیگی تو صرف حقوق اللہ کی ادائیگی ہے۔لیکن حقوق العباد کی ادائیگی اگر ایک طرف حقوق العباد کی ادائیگی ہے تو دوسری طرف حقوق اللہ کی بھی ادائیگی ہے۔اسلئے حق العباد ہی کا ذکر کیا، اسلئے کہ حق اللہ بھی اسکے ساتھ شامل ہے پھر الگ سے اسکے ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ہاں اس بات کی خاص ضرورت ہے کہ حقوق العباد کا ذکر پورے اہتمام اور کامل توجہ کے ساتھ ہو، جس کی ادائیگی سے دنیا و آخرت دونوں کی سلامتی حاصل ہوتی ہے۔

﴿۴﴾۔۔۔ممکن ہے کہ حدیث پاک میں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ جس طرح کذب، خیانت اور وعدہ خلافی منافق کی علامت و پہچان ہے، اسی طرح مخلوق الٰہی کو اذیت نہ دینا، یہ اسلام کی نشانی اور مسلمان کی پہچان ہے۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ وَجَدَ بِھِنَّ حَلاوَۃَ الْاِیْمَانِ مَنْ کَانَ للّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْدًا لَّا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ وَمَنْ یَکْرَہُ اَنْ یَّعُوْدَ فِی الْکُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَہُ اللّٰہُ مِنْہُ کَمَا یَکْرَہُ اَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں یہ ہوں وہ ان خصلتوں کے سبب ایمان کی لذّت پالیتا ہے۔ اوّل وہ کہ جسکے نزدیک اللہ ورسول اپنے تمام ماسوا سے زیادہ محبوب و عزیز ہوں۔ دوم وہ کہ جو کسی بندے کو صرف خدا کی رضا کیلئے دوست رکھے۔ سوم وہ کہ جو اسکے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کفر سے نجات دے دی ہے، کفر میں لوٹ جانا ایسا ہی برا جانے جیسے کہ آگ میں ڈالا جانا۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔۔ **وَجَدَ بِهِنَّ** :میں لفظ وَجَدَ کا ترجمہ اشعۃ اللّمعات میں 'می یابد' کیا گیا ہے۔ اسی کی روشنی میں میں نے یہاں اسکا ترجمہ 'پالیتا ہے' کیا ہے۔ بعض مترجمین نے اسکا ترجمہ 'پالے گا' کیا ہے۔ حالانکہ حدیث زیرِ عنوان کا منشاء یہی ہے کہ جن میں یہ تینوں مذکورہ خصلتیں جمع ہو جاتی ہیں اسکو ایمان کی حلاوت مل جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ منشاء 'پالیتا ہے' سے جس قدر صاف طور پر حاصل ہوتا ہے اتنا واضح 'پالے گا' سے نہیں حاصل ہوتا۔ اسلئے کہ 'پالے گا' میں یہ بھی احتمال رہتا ہے کہ کسی میں مذکور خصلتیں موجود ہوں پھر بھی وہ فوری طور پر ایمان کی حلاوت سے محروم ہو اور مستقبل میں جا کر اس سے بہرہ اندوز ہو اور ظاہر ہے کہ مذکورہ ارشادِ نبوی کا یہ منشاء نہیں۔۔۔۔ مذکورہ تحریر فوائد کے تحت آنی چاہئے تھی مگر میں نے اس کو جواہر پارے میں اسلئے رکھا ہے تا کہ ظاہر ہو جائے کہ میں جس ترجمہ کو راجح قرار دے رہا ہوں وہ 'اشعۃ اللّمعات' سے ماخوذ ہے۔

۲۔۔۔ **ثَلٰثٌ**۔۔۔الخ: یعنی 'خصال ثلاث'۔ تین خصلتیں یہ مبتداء ہے اور اسکے بعد آنے والا جملہ شرطیہ اسکی خبر۔۔۔۔ اور من کان۔۔۔الخ، من احب۔۔۔الخ، اور من یکرہ۔۔۔الخ اپنے اپنے مبتداء کے محذوف کی خبریں ہیں۔ یہی زیادہ ظاہر ہے۔ ﴿لمعات﴾

۳۔۔۔۔ **مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا** : مسلم میں حضرت عدی بن حاتم سے ایک روایت ہے کہ ایک خطیب نے حضور ﷺ کے سامنے یہ بات کہی کہ

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى

جس نے اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کی وہ یقیناً ہدایت پا گیا اور

جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا۔

۔۔۔۔ خطیب کی یہ بات سن کر سرکار مدینہ نے یہ ارشاد فرمایا:

بِئْسَ الْخَطِيْبُ قُلْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

(مَنْ يَّعْصِهِمَا کہہ کر) خطیب نے برا کہا (اسکے بجائے، وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهِ وَرَسُوْلَهٗ کہا کرو)

خطیب کے مذکورہ کلام پر حضور آیۂ رحمت ﷺ کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کی وجہ اکثر شارحین کے نزدیک یہ ہے۔ چونکہ خطیب نے اپنے کلام میں اللہ اور اسکے رسول کیلئے ایک ہی ضمیر تثنیہ استعمال کی ہے اور اللہ اور رسول کی طرف راجع ضمیروں کو جمع کر دیا اور یہ جمع اس بات کا مقتضی ومستدعی ہے کہ اللہ ورسول برابر ہوں۔ اسلئے رسول کریم نے اسے حکم دیا کہ اوّلاً: وہ اللہ کے اسم کو مقدم رکھے اور اسکے بعد رسول کا ذکر کرے۔ یعنی لفظ 'اللہ' کو معطوف علیہ اور 'رسولہ' کو معطوف قرار دے تاکہ مؤخر الذکر کی تبعیت وفرعیت کا احساس ہو اور مساوات کا واہمہ نہ ہو۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ شارحین نے کہا ہے اگر واقعی حضور ﷺ کی ناراضگی کی وجہ یہی ہے، تو پھر حدیث زیر عنوان میں خود حضور نے 'ممّا سوا هما' فرما کر کیوں اللہ ورسول کیلئے ایک ہی ضمیر تثنیہ استعمال فرمائی؟

اسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہم کو یہ تسلیم نہیں کہ خطیب کے کلام پر حضور کی ناپسندیدگی کی وجہ 'جمع بين الضميرين' ہے، اسلئے کہ یہ بات خود محتاج بحث ہے کہ 'جمع بين الضميرين' تسویہ کی مقتضی ہے۔ اسلئے کہ اس طرح کی جمع وتشریک تو خود حضور ﷺ کے اس خطبہ مبارکہ میں واقعہ ہو چکی ہے، جسے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کے حوالے سے صاحب سفر السعادۃ نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے۔۔ بلکہ۔۔ اس طرح کی تشریک تو خود اس ارشادِ ربانی میں موجود ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴿سورۃ الاحزاب:۵۶﴾

بیشک اللہ اور اسکے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں

مذکورہ ارشاد میں **يُصَلُّوْنَ** کی ایک ہی ضمیر جمع اللہ کی طرف بھی راجع ہے اور ملائکہ کی طرف بھی۔ یعنی **يُصَلُّوْنَ** کی 'ضمیر جمع' میں اس ارشاد پاک نے اللہ اور اس کے فرشتوں کی ضمیروں کو جمع کر دیا ہے۔ اس گفتگو کے بعد پھر یہ سوال اپنی جگہ پر آ گیا کہ آخر پھر کیا وجہ ہے کہ سرکارِ رسالت نے خطیب کی مذمت فرمائی؟ اسکا یہ جواب دیا گیا ہے کہ خطیب جس مقصد رفیع کو بیان کر رہا تھا، اس بیان کرنے کیلئے دو ہی کلمے پر اقتصار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بلکہ قدرے بسط وتفصیل اور تشریح وتطویل سے کام لینا چاہئے تھا۔ خطیب کے کلام میں اجمال واختصار سے زیادہ بہتر ومناسب بسط وتفصیل ہوا کرتا ہے۔ اسلئے سرکار مدینہ نے خطیب کے کلام کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا، تاکہ واضح ہو جائے کہ خطیب نے جو کہا وہ شانِ خطیب کے لائق نہ تھا۔۔۔ ﴿لمعات﴾

۴۔۔۔ طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث زیر عنوان میں 'مما سواهما' میں ضمیر تثنیہ کا استعمال اسلئے فرمایا گیا ہے تاکہ یہ اشارہ ہو جائے کہ معتبر وہ مجموعہ ہے، جو اللہ کی محبت اور رسول کی محبت سے

مرکب ہو۔ان دومحبتوں میں سے صرف ایک محبت نہ کافی ہے اور نہ معتبر۔اور حدیث عدی ابن حاتم میں رسول کریم نے قُلْ وَمَن یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فرما کراللہ کےاوراپنے ذکرکوجوالگ الگ کردیا ہےاس سے یہ واضح کرنامقصود ہے کہ نافرمانی کا معاملہ محبت کے معاملے سے جداگانہ ہے۔اسلئے کہ اللہ ورسول کی محبتوں میں سے ایک محبت نہ کافی ہے نہ معتبر۔لیکن اللہ ورسول کی نافرمانی میں سے ہر ایک نافرمانی کی مستقل حیثیت ہے۔یعنی گمراہ ہونے کیلئے دونوں کی نافرمانیوں کے مجموعہءمرکب کی ضرورت نہیں، بلکہ ان میں سے ایک کی نافرمانی بھی گمراہ کرنے کیلئے کافی بھی ہےاور معتبر بھی۔اسلئے کہ یہ چیز اپنی جگہ اصولی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ عطف کی اصل یہ ہے، کہ معطوف اور معطوف علیہ میں سے ہر ایک حکم میں مستقل ہو۔ ﴿ماخوذ از لمعات﴾

۱۔۔۔ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ : یہاں حلاوۃ سے مرادلذت ورغبت ہے۔نسائی میں 'وطعمہ' (ایمان کا ذائقہ) کا بھی لفظ ہے۔حسی لذتوں کاادراک لفظ حلاوۃ سے بخوبی ہوجاتا ہے اسلئے اس لفظ کواختیار کیا گیاہے۔اس حدیث زیرعنوان میں جن خوبیوں کا ذکر ہے وہ جس ذات میں جمع ہوجائیں اس ذات کیلئے حلاوۃ ایمان کے وجدان کی خوش خبری میں اسکےحسن خاتمہ کی بشارت بھی ہے۔۔۔اسلئے کہ ارشادِنبوی ہے:

اِنَّ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ اِذَا دَخَلَتْ قَلْبًالَاتَخْرُجُ مِنْہُ اَبَدًا۔ ﴿مرقات﴾

بے شک ایمان کی حلاوت جس قلب میں جاگزیں ہوجاتی ہے، اس قلب سے کبھی بھی نہیں نکلتی۔

۲۔۔۔ یہ بھی کہا گیاہے کہ حدیث زیرعنوان میں حلاوۃ ایمان سے مراد 'طاعات الٰہی' میں ایسی لذت پاناہے، جو ہر حال میں تمام مرغوب و پسندیدہ چیزوں کے اپنانے پر خدا اور رسول کی فرمانبرداری کی ترجیح کا سبب ہو۔اور اللہ اور اسکے رسول کی رضا کیلئے مشقتوں کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔۔۔نیز۔۔۔مصیبتوں کے تلخ گھونٹ کی جرعہ کشی کی عادت ڈال دے۔۔۔ الغرض۔۔۔جس سے انسان ہرحال میں قضاء الٰہی پر راضی نظر آئے۔

۳۔۔۔انسانوں میں کچھ ایسے ہیں جو صحتمند ہیں اور جن کی قوت ذائقہ کھانوں کی اصلی لذت کا ادراک کرتی ہے اور کچھ ایسے ہیں جو صفراوی مریض ہیں جنکی قوت ذائقہ اپنے صحیح احساسات کھو چکی ہے، ایسوں کو شہد میں بھی کوئی لذت نہیں ملتی۔ بلکہ شہد میں جو اصلی لذت ہے بالکل اسکے خلاف ذائقہ کا انھیں احساس ہوتا ہے۔ اب اگر مریضوں کو شہد تلخ معلوم ہو، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ شہد میں فی نفسہ شیرینی نہیں۔ شہد کی شیرینی سے لطف اندوز ہونا ہو تو اس کیلئے ضروری یہ ہے کہ تمام خارجی عوارض وموانعات سے اپنی قوت ذائقہ کی تطہیر کر لی جائے، تاکہ قوت ذائقہ کا وہ فطری احساس بیدار ہو جائے جسکا فقدان شہد کو بھی تلخ بنائے ہوئے ہے۔ بس کچھ اسی سے ملتا جلتا حال ایمان کا ہے۔ ایمان میں شیرینی ہی شیرینی ہے، لذت ہی لذت ہے، مگر اس حقیقی شیرینی کے فطری احساس کیلئے ضروری ہے کہ انسانی قلب غفلتوں کی آلائشوں سے دور اور خواہشات شیطانیہ سے پاک وصاف ہو۔ اسکے بغیر لذت ایمانیہ سے بہرہ وری ناممکن ہے۔ قلب انسانی کی تطہیر کی صورت یہی ہے کہ انسان مکمل طور پر ان خوبیوں کا جامع ہو جائے جنکا ذکر حدیث زیر عنوان میں ہے۔

۴۔۔۔**مِمَّا سِوَا هُمَا** :یعنی اللہ ورسول ﷺ کے سوا خواہ وہ ذوی العقول ہوں۔۔۔ یا۔۔۔ غیر ذوی العقول، مال ودولت ہو یا جاہ وحشمت، خواہشات کا عالم ہو یا مرادات کی دنیا۔

۵۔۔۔ایک اصولی بات ہے کہ رسول کریم ﷺ کی شانِ مبارک اس قدر عالی ہے کہ:

قَدْ يَجُوْزُ لَهٗ مَالَا يَجُوْزُ لِغَيْرِهٖ ﴿مرقات﴾

۔۔۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل رسول کیلئے جائز ہوتا ہے، مگر وہی عمل آپ کے سوا کیلئے ناجائز ہوتا ہے۔ اسکی نظیریں بے شمار ہیں۔ تو اب اگر رسول ﷺ نے مما سوا هما فرما کر اللہ کیلئے اور اپنے لئے ایک ہی ضمیر تثنیہ استعمال فرما دیا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے بھی ایسا ہی کرنے لگیں۔ رسول کریم ﷺ کا خود یہ عمل کرنا اور پھر اسی عمل سے خطیب کو روکنا اشارہ کر رہا ہے، کہ یہ ان اعمال میں سے ہے جو رسول کریم ﷺ کے مخصوصات میں سے ہے، کسی اور کو اسکی اجازت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کی ذات کریم سے اس عمل کی تخصیص کی وجہ یہ ہو سکتی ہے، کہ نبی معصوم ہوتا ہے، لہٰذا کلام رسول ﷺ میں نبی کریم ﷺ کی جانب سے خدا اور رسول ﷺ میں تسویہ کے ایہام کا گزر نہیں، بخلاف ان لوگوں کے جو آپ کے سواء ہیں، اسلئے کہ غیر معصوم کی طرف سے عقیدۂ تسویہ کا ایہام عقلاً غیر مستبعد نہیں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ مما سواهما فرما کر ضمیر تثنیہ میں خدا کی اور اپنی ضمیروں کو جمع کرنا، یہ ہے رسول کریم ﷺ کا فعل اور خطیب کو اس طرح کے جمع سے منع کرنا، یہ ہے آپ کا قول۔ اور

یہ اصولی بات ہے کہ اگر نبی کے قول وفعل میں تعارض ہو، تو امت کو نبی کے قول پر عمل کرنا چاہیئے، اسلئے کہ فعل کا شمار تو خصوصیات نبویہ میں بھی ہوسکتا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ہم اس بات کے مکلّف نہیں کہ نبی کریم جو کریں، وہی ہم کریں، بلکہ ہمیں اس بات کی تکلیف دی گئی ہے کہ نبی کریم جو ہم کو دیں، اسے لیں، جس سے روکیں، اس سے رکیں۔ اسی لئے بعض علماء فرماتے ہیں:

اَلْعَمَلُ بِخَبَرِ الْمَنعَ اَوْلٰی لِاَنَّ الْخَبَرَالْاٰخِرَیَحْتَمِلُ
الْخُصُوْصَ وَلِاَنَّہٗ قَوْلٌ وَالثَّانِیُ فِعْلٌ ﴿مرقات﴾

روکنے والی خبر پر عمل بہتر ہے، اسلئے کہ دوسری خبر میں خصوصیت کا امکان ہے
اور اسلئے بھی کہ اول (خبر منع) قول ہے اور ثانی فعل۔

۶۔۔۔۔فائدہ ۵ تک میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ 'مرقات' کی روشنی میں ہے۔ ان سب کو سامنے رکھ کر میرے معروضات پر توجہ فرمائیں۔ میرے ناقص خیال میں یہ دعویٰ کہ دو یا چند کی ضمیروں کو جمع کر دینا ان دو یا ان چند کے تسویہ کا مقتضی ہے، خود محل نظر ہے۔ اسلئے کہ قرآن کریم میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جس میں معصوم وغیر معصوم، بلکہ خالق ومخلوق کی ضمیروں کو جمع کر دیا گیا ہے۔۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴿سورۃ الاحزاب:۵۶﴾
اللہ اور اسکے تمام فرشتے حضور پر درود بھیجتے ہیں

۔۔۔اس آیت میں **يُصَلُّوْنَ** کی ضمیر جمع اللہ اور اسکے فرشتوں کی طرف راجع ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔۔۔ ﴿سورۃ التوبۃ:۴۰﴾
حزن نہ کر، بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے

۔۔۔اس آیت میں معنا کی ضمیر متکلم میں رسول کریم ﷺ اور صدیق اکبر دونوں شامل ہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ ۔۔۔ ﴿سورۃ التوبۃ:۴۰﴾
دو کا دوسرا جب وہ دونوں غار میں تھے

۔۔۔اس آیت میں بھی **هُمَا** کی ضمیر تثنیہ رسول کریم ﷺ اور صدیق اکبر کی طرف راجع ہے۔

﴿۴﴾۔۔۔ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ ۔۔الآیۃ ﴿سورۃ الانبیآء:۱۹﴾
آسمانوں اور زمین میں جس قدر مخلوقات ہیں وہ سب اسی کی ہیں
اور جو اسکے پاس حاضر ہیں ملائکہ وہ اسکی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے۔۔۔الخ

۔۔۔۔اس آیت میں لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ کی ضمیر جمع تمام ملائکہ کی طرف راجع ہے خواہ وہ افضل ہوں یا مفضول، رسول ہوں یا غیر رسول۔

﴿۵﴾۔۔۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۔۔۔ ﴿سورۃ الفرقان:۱۷،۱۸﴾

اور جس دن اکٹھا کرے گا انھیں اور جن کو اللہ کے سوا پوجتے تھے، پھر ان معبودوں سے فرمائے گا کیا تم نے گمراہ کردیئے میرے بندے یا یہ خود ہی راہ بھولے، وہ عرض کرینگے پاکی ہے تجھ کو ہمیں سزاوار نہ تھا کہ تیرے سوا کسی اور کو مولیٰ بنائیں۔

۔۔۔۔اس آیت میں ایک تفسیر کی رو سے مَا يَعْبُدُوْنَ کو معبودین کے معنی میں لے کر اس سے ایک عام معنی مراد لیا گیا ہے، جو عقلاً اور غیر عقلاً سبھی کو شامل ہے،﴿مدارک﴾۔لہٰذا یہاں معبودین سے مراد انبیاء، اولیاء اور ملائکہ کے سوا وہ سارے غیر عقلاً بھی ہیں جن کی عبادت کی گئی ہے۔ایسی صورت میں يَعْبُدُوْنَ کی ضمیر جمع اَنْتُمْ اور اَضْلَلْتُمْ کی ضمیر خطاب قَالُوْا کی ضمیر غائب نیز لَنَآ اور نَتَّخِذَ کی ضمیر متکلم انبیاء واولیاء کے ساتھ ساتھ غیر عقلاً کیلئے بھی ہے۔مذکورہ حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے، کہ جمع بین الضمیرین تسویہ ومساوات کی مقتضی ومستدعی نہیں اور اگر جمع کی صورت میں تسویہ کے اقتضاء کو تسلیم کرلیا جائے، تو پھر وہ اقتضاء فی نفسہ اس طرح کے ہر کلام میں موجود رہنا ضروری ہے، خواہ وہ خالق کا کلام ہو یا مخلوق کا، معصوم کا ہو یا غیر معصوم کا۔اور ظاہر ہے کہ اس اقتضاء کے موجود رہنے کی صورت میں جو خرابی ایک کلام میں آتی ہے۔۔۔۔بعینہٖ۔۔۔۔وہی خرابی اس طرح کے دوسرے کلام میں تسلیم کرنی پڑے گی، اور وہاں یہ تفریق کام نہ دے گی، کہ یہ فلاں کا کلام ہے اور یہ فلاں کا۔۔۔۔لفظوں کے استعمال سے جو خرابی آتی ہے وہ ہر جگہ آئے گی۔

اب تک میں نے جو معروضہ پیش کیا ہے یہ دراصل اس جواب کی تشریحی صورت ہے، جسے حدیث زیرعنوان ہی کے تحت جواہر پارہ۳ میں 'لمعات' سے اخذ کرتے ہوئے میں تحریر کرچکا ہوں۔ اب رہی ایہام والی بات کہ اگرچہ اس طرح کا کلام تسویہ کا مقتضی نہیں، لیکن ایہام تسویہ ضرور ہے۔میں عرض کروں گا کہ اس طرح کے ایہام سے وہ ساری مثالیں خالی نہیں جو ابھی میں دے چکا ہوں۔تو اگر فی نفسہ ایہام بُری چیز ہے، تو اسے ہر جگہ برا ہونا چاہئے۔یہاں بھی معصوم وغیر معصوم کے کلاموں کے مابین تفریق غیر معقول ہے۔نبی کریم ﷺ کے کلام کی توجیہ کرتے ہوئے یہ کہنا کہ آپ نبی ہیں،

معصوم ہیں، اسلئے آپ کے ارشاد میں تسویہ کا ایہام نہیں، بالکل ٹھیک ہے۔لیکن مومنین کیلئے بھی تو یہ یقین واذعان کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مومن کا عقیدہ وایمان ہمارے لئے قرینہ واضح اور دلیل شافی ہے کہ اسکا کلام بھی ایہام تسویہ سے پاک وصاف ہے۔

غور کیجئے اگر کوئی دہریہ کہے (اَنْبَتَ الرَّبِیْعُ البَقْلَ) موسم بہار نے سبزیاں اگائیں، تو اسکے اس قول کو کفریہ قرار دیا جائے گا، اسلئے کہ اسکا عقیدہ بھی یہی ہے، وہ موسم بہار ہی کو موثر حقیقی سمجھ کر ایسا کہہ رہا ہے۔لیکن یہی فقرہ اگر کوئی مومن اپنی زبان سے ادا کرے، تو نہ یہ قول کفریہ ہوتا ہے اور نہ کہنے والا کافر۔اسلئے کہ مومن کے عقیدہ میں موثر حقیقی خدائے تعالیٰ ہے۔اسکے نزدیک موسم بہار کی حیثیت عالم اسباب کے ایک سبب سے زیادہ نہیں۔لہٰذا اسکے کلام میں موسم بہار کی طرف اگانے کے اسناد کو اسناد مجازی قرار دیا جائے گا۔کیا نماز میں ثناء پڑھتے ہوئے وَتَعَالٰی جَدُّكَ نہیں پڑھا جاتا ہے۔غور فرمائیے جد کے دو معنی ہیں اور دونوں معروف ومشہور اور زبان پر رواں دواں۔ایک ہے مجد وشرف جو وَتَعَالٰی جَدُّكَ میں مراد ہے اور دوسرا معنی ہے'دادا' جسے یہاں مراد نہیں لیا جاسکتا ہے۔مگر مذکورہ فقرہ میں اس بات کا ایہام تو ہے کہ جد سے مراد 'دادا' ہی ہو، مگر اس طرح کے ایہام سے اس ایمان والے کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، جو اس فقرہ کو ادا کرنے سے پہلے خدائے تعالیٰ قدوس کو وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ اور لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ مان چکا ہو۔اسکا ایمان ہی آواز دے گا کہ اسکی زبان سے نکلے ہوئے فقرہ وَتَعَالٰی جَدُّكَ کا معنی وہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو عقیدۂ توحیدہ کو مجروح کرے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔جواہر پارہ۳ کے ضمن میں 'لمعات' سے اخذ کرتے ہوئے خطیب کے کلام کی ناپسندیدگی کی جو آخری وجہ بتائی گئی ہے، وہ میرے خیال میں نہایت مناسب ہے۔اس توجیہہ کے بعد نہ تو یہ ضرورت رہ جاتی ہے کہ اس طرح کے کلام کو بلا دلیل خصوصیات نبویہ میں شمار کرایا جائے اور نبی کے قول وفعل میں تعارض دکھایا جائے، اور نہ یہی حاجت رہتی ہے کہ اس خاص بنیاد پر کسی کے کلام کو معیوب سمجھا جائے۔خود نبی کریم ﷺ کا ضمیر تثنیہ استعمال کرنا اور خطیب کو اس سے منع کرنا اس میں وہ حکمت بھی ہوسکتی ہے جسکا ذکر جواہر پارہ۴ میں کیا جاچکا ہے۔

﴿۶﴾۔۔۔ جواہر پارہ۴ میں طیبی سے نقل کرتے ہوئے جو حکمت بیان کی گئی ہے اسکا منشاء صرف معصیت ونافرمانی کی قباحت واضح کرنی ہے، کہ معصیت ایک ایسی بری اور قبیح شئے ہے، تنہا رسول کریم ﷺ ہی کی ذات اقدس کی نافرمانی، گمراہی وہلاکت کیلئے کافی ہے۔یعنی اگر بالفرض رسول کریم ﷺ کی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی نہ قرار دیا جائے، جب بھی یہ معصیت، ہلاکت وگمراہی سے بچا

نہیں سکتی۔تو جب صرف رسول ﷺ کی نافرمانی کا یہ حال ہے تو پھر اس نافرمانی کی قباحت کا کیا عالم ہوگا جو خدا کی بھی نافرمانی ہو اور رسول کی بھی۔ اب طیبّی کی تشریح پر یہ اعتراض نہیں پڑتا کہ خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانیاں الگ الگ نہیں۔ بلکہ جو خدا کی معصیت ہے، وہی رسول کی بھی معصیت ہے۔ یونہی جو رسول ﷺ کی نافرمانی ہے، وہی بعینہٖ خدا کی بھی نافرمانی ہے، نصوص جس پر شاہد عدل ہیں۔ اسلئے کہ طیبّی کی تحریر کا منشاء خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانیوں کو دو خانوں میں تقسیم کرنا نہیں ہے، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نافرمانی اتنی بُری شئے ہے کہ اگر بالفرض رسول ﷺ کی نافرمانی کو صرف رسول ﷺ ہی کی نافرمانی تسلیم کرلی جائے، جب بھی یہ مستقل گمراہی وضلالت ہے، بخلاف محبت کے، کہ اگر بالفرض خدا اور رسول ﷺ کی محبتوں کو دو خانوں میں تقسیم کردیا جائے، جب بھی ان میں سے صرف ایک کی محبت ہدایت وایمان کیلئے کافی نہیں ۔۔۔۔الغرض ۔۔۔۔محبت ’علیٰ وجہ الکمال‘ ایسا مادۂ اجتماع ہے جو اپنی مغایرت کا متحمل نہیں اور مخالفت موجب افتراق ہے۔

۷۔۔۔۔ مَنْ کَانَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ ۔۔۔الخ: کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ سرکار رسالت کے اس ارشاد میں جس میں فرمایا گیا ہے:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ۔۔الخ

۔۔۔۔صرف رسول کریم ﷺ ہی کی احبیت کا ذکر ہے اور حدیث زیرعنوان میں خدا کی احبیّت بھی مذکور ہے۔اب یا تو خدا اور رسول ﷺ کی احبیت بعینہٖ ایک ہی ہے، یا خدا کی احبیت اور ہے اور رسول ﷺ کی احبیت اور۔پہلی صورت میں حدیث زیرعنوان میں خدا اور رسول ﷺ میں سے ایک کا ذکر زائد ہوجاتا ہے اور دوسری صورت میں حدیث لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ ۔۔الخ میں خدا کی احبیت غیر مذکور رہتی ہے، جس سے اسکے غیر ضروری ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔مذکورہ خیال کا جواب سماعت فرمانے سے پہلے یہ ذہن نشین کرلیجئے کہ خدا اور رسول ﷺ کی محبت واحبیت اس معنی میں تو بالکل ایک ہے، کہ ان میں سے کسی ایک کا وجود دوسرے کے بغیر حقیقتاً ناممکن ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ کوئی خدا سے محبت کرے اور رسول ﷺ سے محبت نہ کرے۔۔۔یا۔۔۔ رسول سے محبت کرے اور خدا سے محبت نہ کرے۔ یونہی یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی رسول ﷺ کو احب قرار دے اور خدا کو احب نہ بنائے۔۔۔یا۔۔۔خدا کو احب بنالے اور رسول ﷺ کی احبیت سے تہی دامن ہو۔۔۔ہاں۔۔۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک شخص خدا کی محبت یا احبیت کا مدعی ہو، لیکن رسول ﷺ کی محبت یا احبیت کا مدعی نہ ہو۔ لیکن دعوئ محبت اور ہے اور حقیقی محبت اور۔ یہ کیا ضروری ہے کہ محبت

کا ادعاء کرنے والا واقعی محبت کرنے والا ہو؟

یہ رتبہ ءبلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہاں یہ ضرور ہے کے خدا کی محبت کا ادعاء کرنے والوں میں سے ایسے لوگ بہت ہیں جنھیں رسول ﷺ کی محبت کا ادعاء نہیں۔ مگر ایک بھی ایسا نہ ملے گا جو رسول ﷺ سے محبت یا صرف ادعاء محبت کرے، لیکن خدا سے محبت یا ادعاء محبت نہ کرے۔ جبھی تو خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام میں اپنے سچے چاہنے والوں کی یہی پہچان بتائی ہے، کہ میرا سچا محب وہی ہے جو میرے محبوب کی اتباع کرے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اطاعت و اتباع بغیر محبت کے نہ اتباع ہے نہ اطاعت، بلکہ منافقت ہے۔ تو اب حاصل ارشاد یہ ہوا کے میرا چاہنے والا وہی ہے، جو میرے محبوب کا چاہنے والا ہو۔ اس ارشاد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی مقصود و مطلوب تو خدا ہی کی محبت ہے، مگر 'من وجہِ اوّلیت' رسول ﷺ ہی کی محبت کو حاصل ہے۔ رسول ﷺ کی محبت کا نام ہے ایمان، جیسا کے حدیث "لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ" سے بداہتہً ظاہر ہے۔ اور خدا کی محبت ہے نتیجہ ءایمان۔ اسلئے ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ﴿سورۃ البقرہ:۱۶۵﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لا چکے اللہ کی محبت میں شدید ہیں

۔۔۔۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (جو مومن ہو چکے) کے فقرے نے یہ واضح کر دیا کہ خدا کی محبت ایمان ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔۔۔۔ یونہی۔۔۔۔ رسول ﷺ کی احبیت ہے کمال ایمان۔ اور خدا کی احبیت ہے اسی کمال ایمان کا نتیجہ۔ یہ 'ایمان و نتیجہ ءایمان' دونوں آپس میں ایسا تعلق رکھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔ بلا تمثیل۔۔۔۔ جیسے چاند اور اس کی چاندنی، سورج اور اس کی روشنی، دو دو ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ اس تمہید کے بعد اب جواب کی طرف توجہ فرمایئے کہ حدیث لَایُؤْمِنُ۔۔۔الخ میں صرف ایمان مقصود تھا، اسلئے صرف رسول ﷺ کی محبت کا ذکر کیا گیا اور حدیث زیرِ عنوان میں ایمان اور اسکے لازمی ثمرہ ایمان کا ذکر بھی مقصودِ کلام تھا، جو مقصود حقیقی ہے۔ اسلئے خدا کی محبت کا تذکرہ بھی ضروری ہو گیا۔

آخر میں پھر ذہن نشین کر لیجئے کہ خدائے عزوجل کا وجود، اسکی ذات، اس کی تمام صفات اور حقیقی مقصود و مطلوب ہونے کی حیثیت سے اسکی محبت، اس پر ایمان، اسکا عرفان، تمام مخلوقات کے وجود ذات وصفات اور تمام مخلوقات کی محبت، ان پر ایمان اور انکے عرفان پر کتنے درجہ مقدم ہے، اسکا فہم و

ادراک ناممکن ہے۔مگر خدا کی حقیقی محبت،اس پر حقیقی ایمان اور اسکا حتی المقدور صحیح عرفان، رسول ﷺ کی محبت، رسول ﷺ پر ایمان اور رسول ﷺ کے عرفان کے بغیر نہیں ہوسکتا۔بس اسی حیثیت سے رسول ﷺ کی محبت اور آپ کے ایمان وعرفان کو تقدم حاصل ہے۔جیسے فی الحقیقت باعتبار وجود چاند مقدم ہے اور چاندنی مؤخر ہے۔لیکن ہم نے پہلے چاندنی کو جانا پھر چاند کا علم ہوا۔ پتہ چلا کہ چاند کی معرفت میں ہم چاندنی کی معرفت کے محتاج ہیں۔اوپر سے آؤ تو چاند پہلے چاندنی بعد میں۔ادھر سے چلو تو چاندنی پہلے چاند بعد میں۔اور چونکے ہم ادھر ہی سے چل رہے ہیں اسلئے ہمارے علم وعرفان کا پہلا رابطہ چاندنی ہی سے ہوگا۔

۸۔۔۔۔خدا کی احبیت حقیقی ہے اور رسول کریم ﷺ کی احبیت اضافی ہے۔لہٰذا خدا کو تمام ماسواء اللہ سے زیادہ محبوب بنانا کمالِ ایمان کا ثمرہ مقصود ہے اور رسول ﷺ کو تمام مخلوقات سے زیادہ محبوب قرار دینا کمالِ ایمان ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔خدا کی احبیت 'بالنسبۃ الیٰ جمیع الموجودات' ہے اور رسول ﷺ کی احبیت 'بالنسبۃ الیٰ جمیع المخلوقات' ہے۔

۹۔۔۔۔وہ محبتیں جو خدا اور رسول ﷺ ہی کی محبتوں کی فرع ہیں، خدا اور رسول ﷺ کی محبت میں داخل ہیں۔مثلاً: قرآن کریم، کعبہ شریف، مدینہ منورہ وغیرہ کی محبتیں۔لہٰذا ان محبتوں کو خدا اور رسول ﷺ کی محبت سے الگ کرکے نہیں دیکھنا چاہیئے۔

۱۰۔۔۔۔مَنْ اَحَبَّ عَبْدًا ۔۔۔الخ: یہاں عبد سے مراد 'موسوم بالعبودیۃ للہ' ہے۔ یعنی خدا کا بندہ یا بندی ہو، خواہ وہ آزاد ہو، خواہ وہ مرد ہو، یا عورت، آزاد ہو یا غلام۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ عبد سے مراد انسان ہے۔ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور کرنے والی تینوں چیزوں میں سے دوسری چیز یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے کسی غرض، کسی عوض یا کسی دنیوی فائدے یا کسی بشری تقاضے کی بنیاد پر محبت نہ کرے، بلکہ اس کی محبت خالصۃً 'لوجہ اللہ' ہو اور وہ 'حب فی اللہ' سے متصف ہو اور اللہ کے محبّ میں اسکا شمار ہو۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے 'حب فی اللہ' کی یہ حقیقت بیان فرمائی ہے:

لَا تَزِيْدُ بِالْعَطَاءِ وَلَاتَنْقُصُ بِالْجَفَاءِ ﴿مرقات﴾

جو نہ عطاء سے زائد اور نہ جفا سے کم ہو

۔۔۔ہم جسے خدا کی رضاوخوشنودی کیلئے چاہیں گے، وہ اگر ہمارے ساتھ بے پایاں حسن سلوک کرے جب بھی ہماری محبت کی جو حد ہے وہ اس سے آگے نہ بڑھے گی، اور اگر وہ محبوب ہم پر ستم ڈھائے، جب

بھی اس محبت میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ یہی محبت بے غرض محبت ہے اور اسی کا نام ’حب فی اللہ‘ ہے۔

۱۱۔۔۔ وَمَنْ يَّكْرَهُ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ ۔۔۔الخ: یعنی اللہ ورسول ﷺ کو ان دونوں کے سوا سے زیادہ محبوب رکھنے والے کی محبت اور کسی انسان کو خالصا ’لوجہ اللہ‘ چاہنے والے کی محبت کے سوا اس شخص کی ناپسندیدگی وکراہت بھی حصول حلاوت ایمان کا ذریعہ ہے۔ جو مومن ہوتے ہوئے کفر کو اختیار کرنا، ایسا ہی ناپسند کرے جیسے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جانا ناپسند کرے۔

۱۲۔۔۔ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ ۔۔۔الخ: ’نَقَاذُ مِنَ الْكُفْرِ‘ کا معنی ہے کفر سے بچانا اور محفوظ رکھنا۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ کفر سرزد ہی نہ ہونے دیا جائے اور فطرت اسلامیہ میں پیدا کر کے اس پر قائم رکھا جائے۔ دوّم یہ کہ ظلمت کفر سے نکال کر نور ایمان سے منور کر دیا جائے۔

پہلی صورت میں ’اَن يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ‘ کا معنی ’اَن يَّصِيْرَ فِي الْكُفْرِ‘ (کفر میں پہنچنا) ہوگا۔ اور دوسری صورت میں ’اَن يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ‘ کا معنی ’اَن يَّرجِعُ فِي الْكُفْرِ‘ یعنی (کفر کی طرف پلٹنا) ہوگا۔ اس دوسری صورت میں ’اَنْقَاذُمِنَ الْكُفْرِ‘ کی دوسری شکل (یعنی اِخْرَاجُ مِنَ ظُلْمَةِ الْكُفْرِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ) متعین ہو جاتی ہے۔ اور اس سے بدرجہ اولیٰ یہ بات سمجھ لی جاتی ہے کہ جب اس کیلئے بھی کفر کی طرف پلٹنا معیوب ترین ہے، جو کبھی کفر میں رہ چکا ہو، اور خدائے تعالیٰ نے اُسے اپنے فضل سے کفر سے نجات دی ہو، تو پھر اسکا کفر کی طرف چلا جانا کس قدر سنگین جرم ہے جسے کفر کی آلودگیوں سے کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا، اور جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص فضل وکرم سے شروع ہی سے کفر سے محفوظ کر رکھا تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ، کفر کی طرف پلٹنا سنگین ترین جرم صرف اسلئے ہے کہ خود کفر سنگین ترین جرم ہے۔ تو اب چاہے کفر سے ایمان کی طرف آ کر کوئی کفر کی طرف پلٹے، یا ابتداء ہی سے مسلمان رہنے کے بعد کفر اختیار کر لے، دونوں صورتوں میں کفر، کفر ہے اور جرم، جرم ہے۔ حدیث زیر عنوان کے فقرۂ زیر بحث کا منشاء صرف اتنا ہے، کہ کفر اختیار کرنے کی کراہت وناپسندیدگی کو حلاوت ایمان کا سبب قرار دے کر کفر کے سنگین ترین جرم ہونے کو ظاہر کر دیا جائے۔

۱۳۔۔۔ حدیث زیر بحث میں ’اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ‘ فرمایا گیا ہے۔ ’اَنْ يَّعُوْدَ اِلَى الْكُفْرِ‘ نہیں۔ ’اَنْ يَّعُوْدَ اِلَى الْكُفْرِ وَيَسْتَقِرُّ فِيْهِ‘ کفر کی طرف لوٹنا اور اس پر قائم رہنا۔

۱۴۔۔۔ حدیث زیر عنوان میں ذکر کردہ تینوں امور کو کمال ایمان کا عنوان قرار دیا گیا ہے اسلئے کہ جب انسان غور وفکر کر کے یقین واذعان کی اس منزل پر پہنچتا ہے کہ منعم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ کسی کو کچھ دینا چاہے، تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اگر کسی کو اپنی نعمتوں سے محروم کرنا

چاہے تو کوئی نہیں جو اس کو اس محرومی سے بچا سکے۔۔۔۔اسکے سوا در حقیقت نہ کوئی مانع معطی ہے اور نہ مانع۔۔۔۔ذات الہٰی کے سوا جو کچھ ہے اسکی حیثیت صرف واسطہ و وسیلہ کی ہے۔ساتھ ہی ساتھ غور وفکر کرنے والا یہ بھی سمجھ لیتا ہے، کہ اپنے رب تعالی کی مراد ومنشاء کو واضح طور پر بیان فرمانے والی ذات، صرف رسول ﷺ کی ذات ہے۔جب یہ حال ہے، تو پھر غور وفکر کرنے والے انسان کی عقل سلیم کا یہی فیصلہ ہوگا کہ ہر انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اسی چیز کو پسند کرے جو اسکے رب تعالی کی محبوب و پسندیدہ ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔یہ بھی ضروری ہے کہ انسان جسے بھی اپنی چاہت کا مرکز بنائے اسے اپنے رب تعالی کی رضا وخوشنودی ہی کیلئے بنائے اور یہ یقین کرلے کہ اللہ تعالی کے جملہ وعدے اور اسکی تمام وعیدیں حق ہیں اور موعود کو صرف موعود ہی تصور نہ کرے، بلکہ اسکو واقع کی منزل میں سمجھے اور یقین جان لے کہ ذکر الہٰی کی مجلسیں جنت کی کیاریاں ہیں اور کفر کو اختیار کرلینا ہی، اپنے کو آگ میں ڈال دینا ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔حدیث زیر عنوان کے ابتدائی دو فقرے ہر انسان کو دعوت دے رہے ہیں، کہ وہ اپنے کو فضائل وکمالات سے آراستہ ومزین کرلے اور آخری فقرہ رذائل ومنکرات سے اپنے کو دور اور پاک وصاف رکھنے کی تلقین کر رہا ہے۔خیال رہے کہ حدیث زیر عنوان میں ذکر کردہ صفات اس میں غیر مذکورہ اوصاف کے اصول واجبات سے ہیں۔

۱۵۔۔۔۔اللہ کی محبت کی دو قسمیں ہیں: ﴿۱﴾۔۔۔محبت فرض ﴿۲﴾۔۔۔محبت مستحب

۔۔۔محبت فرض، وہ محبت ہے، جو اللہ تعالی کے اوامر کی بجا آوری اور اسکے نواہی سے اجتناب۔۔۔۔نیز۔۔۔قضاء الہٰی پر راضی رہنے پر برانگیختہ کرے۔تو جس سے معصیت، ارتکاب فعلِ حرام سے ہوئی یا اس نے کسی واجب کو ترک کر دیا تو یہ اللہ کی محبت کی کمی کی وجہ سے ہے، جبھی تو اس نے اپنی نفسانی خواہش کو مقدم کر دیا۔

۔۔۔محبت مستحب، وہ محبت ہے، جو نوافل پر مواظبت وہمیشگی اور مشتبہ امور سے اجتناب کا سبب ہو۔ اوپر ہی کی تشریح کے مطابق رسول کریم ﷺ کی محبت کی بھی دو قسمیں ہیں: اول فرض۔۔۔دوم مستحب۔

۔۔۔۔جب یہ ظاہر ہے کہ مامورات ومنہیات سے جو کچھ ہمیں ملا، وہ سب مشکوٰۃ رسالت ہی کا فیضان ہے، تو ہم پر لازم ہے کہ ہم آپ کے اسیر محبت ہو کر آپ ہی کی سنت کو اپنائیں، اور جو آپ کی شریعت ہے اس سے کما حقہ راضی رہیں۔اور آپ کے ہر ہر فیصلے پر ایسا آمنّا وصدّقنا کہیں، کہ اس فیصلے کے خلاف دل میں ادنیٰ کھٹک بھی نہ رہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔آپ کی اخلاقی قدروں سے اپنے کو آراستہ کرلیں۔ مثلاً: جود وایثار، علم وتواضع وغیرہا میں آپ کے نقش قدم پر چلیں۔تو جو بھی اپنے کو ان خوبیوں سے

آراستہ کر لے، یقیناً وہ ایمان کی لذت حاصل کر لے گا۔ جسکی محبت کا جو درجہ ہوگا، اسے اسی درجے کی حلاوت ایمان بھی نصیب ہوگی۔

شیخ محی الدین ابن عربی کا ارشاد ہے کہ یہ حدیث پاک، دین کے اصولوں میں سے ایک اصل عظیم ہے۔

۱۶۔۔۔۔احمد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءُ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهُ اَنْ يَّعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُّلْقَى فِي النَّارِ كذافى الجامع الصغير للسيوطى

﴿مرقات﴾

تین خصلتیں جس میں ہونگی وہ ایمان کی حلاوت پالے گا۔ اول یہ کہ اللہ و رسول ﷺ اپنے ماسوا سے اسے زیادہ محبوب ہوں۔ دوم یہ کہ جب وہ کسی مرد کو چاہے تو صرف خدا کیلئے چاہے۔ سوم یہ کہ کفر سے نجات کے بعد کفر اختیار کرنا، اسے ایسا ہی ناگوار ہو، جیسا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث ٦
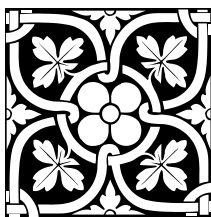
عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طُعْمَ الْاِیْمَانِ مِنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا ﴿رواہ مسلم﴾

حضرت عباس ابن عبد المطلب سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ کے اپنا رب ہونے، اسلام کے اپنا دین ہونے اور محمد ﷺ کے اپنے نبی ہونے سے راضی ہوگیا۔

﴿مسلم شریف﴾

جواہر پارے

حضرت عباس ابن عبدالمطلب، حضور آیہ رحمت ﷺ کے چچا تھے۔ آپ کی کنیت ابوالفضل تھی۔ آپ حضور ﷺ سے تین سال اور بعض کے نزدیک دوسال عمر میں زیادہ تھے۔ آپ کی ولادت سنہ واقعہء فیل سے پہلے ہوئی۔ عہد جاہلیت میں آپ رؤسائے قوم میں سے تھے۔ مسجد حرام کی عمارت وسقایت آپ کے حوالے تھی۔ آپ قدیم الاسلام تھے، مگر اپنے اسلام کو اہل مکہ سے چھپائے رکھا۔ مشرکین کے ساتھ غزوۂ بدر میں آپ کی شرکت بہ جبر واکراہ تھی۔ اٹھاسی سال کی عمر شریف پائی۔ وصال سے پہلے اسّی غلام آزاد فرمائے۔ آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ ﴿اشعۃ اللمعات﴾

ا۔۔۔شیخ ابن عطا اللہ اسکندری شاذلی 'کِتَابُ التَّنْوِیْرِ فِیْ اِسْقَاطِ التَّدْبِیْرُ' میں فرماتے ہیں کہ حدیث ذَاقَ طُعَمَ الْاِیْمَانُ ۔۔۔الخ اس بات پر دلیل ہے کہ جو ایسا نہیں ہے، اسے حلاوۃ ایمان کا وجدان وادراک نہیں ہوسکتا اور اس کا ایمان اس صورت کے مانند ہوگا جس میں کوئی روح نہیں ۔۔۔یا۔۔۔اس ظاہر کی طرح ہوگا جو باطن سے خالی ہو۔۔۔یا۔۔۔اس فرمان جیسا ہے جسکے تحت کوئی حقیقت نہ ہو۔

۲۔۔۔اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ وہ قلوب جو غفلت وخواہشات نفسانیہ کے امراض سے پاک وصاف ہیں، حقائق ومعانی کے ملذذات سے وہی خوشی ومسرت حاصل کرتے ہیں جو نفوس کو لذیذ ماکولات ومشروبات سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے راضی ہونے والے کو ایمان کی چاشنی اسلئے مل جاتی ہے، کہ جب کوئی رب تعالیٰ کی ربوبیت سے راضی ہوجاتا ہے تو لازمی طور پر وہ رب تعالیٰ کے حضور اور اسکے حکم کے آگے سر تسلیم ونیاز جھکا دیتا ہے۔ اور اپنے ظاہری وباطنی جملہ معاملات کو اپنے اختیار وتدبیر سے خارج کرکے، خدائے تعالیٰ کے اختیار وحسن تدبیر کے حوالے کردیتا ہے۔ ایسی صورت میں فطری طور پر لذت حیات اور راحت تفویض سے وہ آشنا ہوجاتا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔جب کوئی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے راضی ہوجاتا ہے، تو خود رب تعالیٰ اس سے راضی ہوجاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔۔۔ ﴿سورۃ التوبۃ:۱۰۰﴾

اللہ ان سے راضی وہ اللہ سے راضی

۔۔۔۔اور جب کسی سے خدا راضی ہوجاتا ہے، تواپنے فضل وکرم سے، اپنی رضا کی حلاوت سے، اُسے ضرور لذت آشنا فرماتا ہے، تاکہ اسے اس خصوصی فضل واحسان کا علم وعرفان ہوجائے، جواللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کیا گیا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا، فہم وادراک کے بغیر ناممکن ہے اوراس فہم مستقیم کا وجود نور بصیرت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اور یہ نور قرب خداوندی کے بعد ہی میسر آتا ہے اور یہ قرب خاص عنایت ربانی کا مرہون منت ہے۔

لہٰذا خدا کی ربوبیت سے وہی راضی ہوگا، جسکے اوپر خداوندی فضل وعنایت کا شامیانہ جلوہ گستر ہو۔اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت جسکے شامل حال ہوجائے، اس کیلئے رب تبارک وتعالیٰ کے فضل و احسان کے خزانے کھلے رہتے ہیں اور وہ عطیات ربانیہ سے مالا مال ہوتا رہتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدداوراسکے انواراس بندے تک پہنچ جاتے ہیں، تواس کا قلب لازمی طور پر تمام امراض نفسانیہ اور انسانی کمزوریوں سے عافیت پاجاتا ہے اور پھر وہ صاحب فہم مستقیم اور سلیم الادراک ہوجاتا ہے اور یہی ادراک کی صحت اور ذوق کی سلامتی اسے ایمان کی لذت وحلاوت سے آشنا کردیتی ہے۔اور اگراسکا قلب غفلت کے عارضے کا شکار ہوکر اللہ سے غافل ہوجائے، تووہ ہرگز ایمان کی لذت کا ادراک نہ کرسکے گا۔ اسلئے کہ بخارزدہ انسان بسااوقات شکر کوکڑوی محسوس کرتا ہے، حالانکہ نفس الامر میں ایسا نہیں ہے۔

نفس الامر میں شکر کی لذت کیا ہے؟ اسکا پتہ اس مخصوص بیمار کواس وقت چلے گا، جب وہ صحت یاب ہوجائے گا۔ یونہی جب قلوب کی بیماریاں زائل ہوجاتی ہیں، توانھیں اشیاء کا ادراک اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح کہ وہ نفس الامر میں ہیں۔ایسی صورت میں ایمان وطاعت کی لذت وحلاوت اور اللہ سے مخالفت اوراس سے قطع تعلقات کی تلخی کا انھیں کامل ادراک ہوجاتا ہے۔اس مقام پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قلوب کا حلاوت ایمان کا ادراک کرلینا، اس بات کا موجب ہے کہ وہ دولت ایمان اور فضل خداوندی کے اس حضور وشہود سے شاداں وفرحاں رہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ان اسباب کو حاصل کرلیں جواس حلاوت ایمان کے محافظ ہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔طاعت الٰہی کی دائمی لذت اور فضل الٰہی کے دائمی حضور وشہود کے موجب ہیں۔

۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔خدا کے کفران ومخالفت کی کڑواہٹ کا ادراک اس بات کا موجب ہے کہ ان سے باز رہا جائے اوران سے کامل نفرت کی جائے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔انکی طرف ذرہ برابر بھی میلان

طبیعت نہ ہونے پائے۔ان باتوں کا اثر یہ ہوگا کہ ترک گناہ کامل طور پر ہوگا۔۔۔۔نیز۔۔۔مکمل طور پر منکرات ومنہیات پر نگاہ رکھنے کا جذبہ معدوم ہوجائے گا۔ یہ اسلئے ہوگا کہ خود صاحب بصیرت کا نور بصیرت اسکی یہ رہنمائی کرے گا، کہ اللہ تعالی کی مخالفت اوراس سے غفلت قلوب کیلئے زہر قاتل ہے۔ اس ہدایت کے بعد فطری طور پر مومنین کے قلوب اللہ تعالی کی مخالفت سے نفرت کریں گے جیسا کہ زہر آلود کھانوں سے نفرت کی جاتی ہے۔

۳۔۔۔۔وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا: جوشخص دین اسلام کواپنا دین بنانے پر راضی ہوگیا، وہ یقیناً اس چیز سے راضی ہوگیا جس سے اسکا آقا ومولیٰ راضی ہے اور جو اس آقا ومولی کا پسندیدہ ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اپنے آقا ومولیٰ کی پسندیدہ چیز کو پسند کر لینے کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر اس نے اوامر الٰہیہ وماموراتِ شرعیہ کی بجا آوری اور محرمات ومنہیات سے باز رہنے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے اپنے کو پابند کرلیا۔

۴۔۔۔۔وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا: جوحضور آیہ رحمت ﷺ کی رسالت ونبوت سے راضی ہو گیا اس پر لازم ہے کہ وہ دین کی اشاعت میں آپ کا معین ومددگار رہو۔ آپ کے اخلاق وآداب سے اپنے کو حتی المقدور آراستہ کرے اور دنیا سے بے رغبتی، برائیوں سے بچنے اور عفوودرگزر سے کام لینے میں آپ کی اتباع کرتا رہے اور قولاً، فعلاً، اخذاً، ترکاً، حبًّا، بغضاً، اور ظاہراً و باطناً صرف رسول کریم ﷺ کی سنت طیّبہ پر عمل کرتا رہے ۔۔۔المختصر۔۔۔ جو اللہ تعالی کی ربوبیت سے راضی ہوجائے گا، وہ خدائے تعالیٰ کے حضور سر عبادت وطاعت کو خم کردے گا اور جو اسلام کو اپنا دین بنانے سے راضی ہوجائے گا وہ جملہ اسلامی فرامین وقوانین پر عمل کرتا رہے گا اور جو نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت سے راضی ہوجائے گا، وہ آپ کی اتباع کرتا رہے گا۔اس بات کا اچھی طرح خیال رہے کہ حدیث زیر عنوان میں ذکر کردہ تینوں امور میں سے کوئی ایک الگ نہیں پایا جاسکتا، جہاں ہونگے اور جس میں ہونگے، یہ تینوں ایک ساتھ ہونگے۔مثلاً: ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی اللہ کی ربوبیت سے تو راضی ہو، مگر اسلام کے دین ہونے اور نبی کریم ﷺ کی نبوت ورسالت سے راضی نہ ہو۔ان تینوں امور کے درمیان تلازم بالکل ظاہر ہے جس میں کوئی پوشیدگی نہیں۔

ا۔۔۔حدیث زیرعنوان کے راوی سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے ایک بار کسی نے سوال کیا:

اَنْتَ اَکْبَرُاَمِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمُ؟

آپ بڑے ہیں یا نبی ﷺ

۔۔۔آپ نے اپنی متانت علم اور لطافت فہم کے سبب اس کا جواب عطا فرمایا کہ:

قَالَ ھُوَاَکْبَرُ وَاَنَا اَسَنُّ ﴿مرقات﴾

نبی ﷺ ہی بڑے ہیں، اور میں سن رسیدہ ہوں۔

۔۔۔یعنی بڑائی نبی کریم ﷺ ہی کیلئے ہے۔ 'رہ گیا میں، تو آپ سے صرف کچھ پہلے پیدا ہونے والوں میں سے ہوں'۔ ایک مرتبہ بچپن میں حضرت عباس کہیں کھو گئے تھے، اس پر آپ کی والدہ محترمہ نے منت مانی کہ جب میرا بچہ مجھے مل جائے گا، تو میں خانہء کعبہ کی غلاف پوشی کروں گی، چنانچہ جب حضرت عباس مل گئے تو مادر مہربان نے اپنی نذر پوری فرمائی اور خانہء کعبہ کو حریر و دیباج اور دوسرے قسم کے کپڑوں پر مشتمل غلاف سے ملبوس کیا۔ خانہء کعبہ پر یہ سب سے پہلی غلاف پوشی تھی۔ آپ کی وفات شریف ۱۲ رجب المرجب ۳۲ھ بروز جمعہ ہوئی۔ آپ کی آخری آرامگاہ جنت البقیع میں ہے۔ بقول امام مجاہد آپ نے ستر غلام آزاد فرمائے۔ غزوۂ بدر میں مشرکین کے ساتھ بہ جبر واکراہ شامل ہوئے، جسکا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سرکار مدینہ نے فرمایا:

مَنْ لَقِیَ الْعَبَّاسَ فَلَا یَقْتُلُہُ فَاِنَّہٗ خَرَجَ مُکْرِھًا

عباس سے جو ملے وہ انھیں قتل نہ کرے، اسلئے کہ وہ بہ جبر واکراہ مکہ سے نکلے ہیں

۔۔۔غزوۂ بدر کے موقع پر آپ کو حضرت ابوالیسر کعب بن عمر نے قید کیا تھا۔ آپ نے اپنا فدیہ دے کر اپنے کو آزاد کرا لیا اور مکہ واپس ہو گئے۔ اس کے بعد پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرما گئے۔ ایک بڑی جماعت نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ مسجد حرام کی عمارت وسقایت کا آپکے حوالے ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ حجاج کرام کو پانی پلانے اور قریشیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے اور مہمان نوازی

وغیرہ کرنے کی خدمات آپ ہی کے سپرد تھیں۔

۲۔۔۔۔حدیث زیر شرح، حدیث 'حلاوۃ الایمان' کے معارض ومخالف نہیں۔اسلئے جس شخص میں وہ صفات موجود ہوں گے جو حدیث زیر عنوان میں مذکور ہیں، لازمی طور پر اس شخص میں وہ ساری خوبیاں موجود ہونگی جو حدیث، 'حلاوۃ الایمان' میں مذکور ہیں۔

۳۔۔۔۔**ذَاقَ طُعْمَ الْاِیْمَان**: منہ میں کسی نہ کسی قدر طعام کا وجود ہی ذوق کی بنیاد ہے، خواہ وہ طعام کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔لہٰذا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک چیز منہ میں تھوڑی تعداد میں بھی نہ ہو اور اسکا ذائقہ مل جائے۔اب جسکا ایمان جس درجہ کا ہوگا اسے اسی درجہ کا ذوق نصیب ہوگا۔لیکن ایمانِ کامل سے تو لذت آشنا وہی ہوسکتا ہے جو ان صفات کا جامع ہو جنکا ذکر حدیث زیر عنوان میں ہے۔ حدیث میں ذوق سے مراد 'ذوق معنوی' ہے۔امام ابن حجر نے 'ذوق حسی' کا بھی احتمال نکالا ہے۔

۴۔۔۔۔**مَنْ رَضِیَ**۔۔۔الخ: یعنی صرف اللہ تعالیٰ کے حقیقی مالک ومولیٰ اور سید ومتصرف ہونے پر نفس قانع ہو، دل خوش ہو اور سینہ کشادہ ہو، جس میں ذرہ برابر تنگدلی کا گزر نہ ہو۔

۵۔۔۔۔**وَّبِالْاِسْلَامِ**: یہاں اسلام سے مراد وہ ہے جو ایمان کو بھی شامل ہو۔

۶۔۔۔۔حدیث زیر عنوان میں 'رضا' سے مقصود ظاہری وباطنی فروتنی ہے، جسکا کمال یہ ہے کہ بندہ اپنے رب تعالیٰ کی آزمائشوں پر صبر کرے، اسکی نعمتوں پر شکر بجالائے، اسکی قضاوقدر اور منع وعطاء پر راضی رہے اور شریعت اسلامی کے جملہ اوامر کی بجاآوری اور نواہی سے اجتناب کرتا رہے اور خدائے عز وجل کے حبیب حضور آیہء رحمت ﷺ کی سنت طیبہ، آپ کے آداب واخلاق اور آپ کی طرز زندگی۔۔۔۔ نیز۔۔۔آپ کے 'زہد فی الدنیا' اور عقبیٰ کی طرف 'توجہ کلی' وغیرہ وغیرہ کی کما حقہ اتباع کرتا رہے۔

۷۔۔۔۔امام احمد اور امام ترمذی نے بھی اس راویت کو یوں ہی بیان کیا ہے اور اسکی تحسین و تصحیح کی ہے۔

۸۔۔۔۔مرآۃ، شرح مشکوٰۃ، مؤلفہ حکیم الامت حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی اشرفی علیہ الرحمۃ میں حدیث زیر شرح کے راوی حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی عمر شریف ۸۲ سال ظاہر کی گئی ہے۔میرے خیال میں سہواً ایسا ہوگیا ہے۔مرقات میں آپ کی عمر شریف کے بارے میں 'ابن ثمان وثمانین' اور 'اشعۃ اللمعات' میں 'هشتاد وهشت' کے الفاظ موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب آپ نے وصال فرمایا اس وقت آپ کی عمر شریف ۸۸ سال کی تھی۔ممکن ہے کہ صاحب مرآت کی نظر میں کوئی اور روایت رہی ہو، جو میری نظر سے ابھی تک نہیں گزری۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث ۷

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَایَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌمِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ.

﴿رواہ مسلم﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں ذات محمد کی بقاء ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ اصحاب نار سے ہونے والے کے سوا اس امت دعوت میں سے کسی، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، میری رسالت پر ایمان لائے بغیر مر جائے۔ ﴿مسلم شریف﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ :ان لفظوں کے ساتھ کلام نبوی میں حلف بہ کثرت واقع ہے۔اسلئے حلف کے مذکورہ کلمات اس بات پر دلیل ہیں کہ رسول کریم کا ارادہ اور آپ کا تصرف اللہ عزوجل کے ارادہ وتصرف سے ہے۔صاحب 'سفر السعادۃ' کا ارشاد ہے کہ حضور ﷺ نے 'خدا کی قسم' بکثرت ارشاد فرمائی ہے۔اسی۸۰ جگہیں ایسی ہیں جہاں حضور نبی کریم کا 'خدا کی قسم' ارشاد فرمانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔خود رب تعالیٰ نے تین مقامات پر آپ کو قسم ارشاد فرمانے کا حکم دیا ہے۔چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿۱﴾۔۔۔ وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ﴿سورۃ یونس:۵۳﴾

اورتم سے پوچھتے ہیں کیا وہ حق ہے،تم فرماؤ ہاں: میرے رب کی قسم بیشک وہ ضرور حق ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ ﴿سورۃ سباء:۳﴾

کافر بولے ہم پر قیامت نہ آئیگی۔تم فرماؤ کیوں نہیں،میرے رب کی قسم بیشک ضرور تم پر آئیگی۔

﴿۳﴾۔۔۔ زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ۔۔۔ ﴿سورۃ تغابن:۷﴾

کافروں نے بکا کہ وہ ہرگز نہ اٹھائے جائینگے۔تم فرماؤ کیوں نہیں،میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

۲۔۔۔لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ :کہا جاتا ہے "سمع بفلان" (فلاں کو سنا) یعنی "بلغ خبر فلان اليه" (فلاں کی خبر اس تک پہنچی) اور کہا جاتا ہے "سمع الناس بفلان" (لوگوں نے فلاں کو سنا) یعنی تسامعوا (اسکے متعلق لوگوں نے ایک دوسرے سے سنا)۔ لفظ بی میں باء زاید ہے۔لہٰذا "لایسمع بی" کا معنی ہوا لایسمع ۔۔۔یا۔۔۔یہ کہ "سمع" اخبر کے معنی کو متضمن ہو۔اب "سمع بی" کا معنی ہوگا "اخبر برسالتی"۔ اس صورت میں "لایسمع بی احد" کا معنی یہ ہوگا "لا یسمع مخبراً ببعثی احد" (یعنی میری بعثت ورسالت کا علم وخبر رکھتے ہوئے نہ سنے گا کوئی)۔

۳۔۔۔اَحَدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ : لفظ احد کثیر وقلیل اور مذکر ومؤنث سبھی کو شامل ہے

اور من ھذہ الامۃ، احدٌ کی صفت ہے اور یہودی احدٌ سے بدل ہے۔ بدل البعض من الکل اور من تبعیض کیلئے ہے۔ لم یومن بی (مجھ پر ایمان نہ لایا) کا فقرہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہاں امت سے مراد 'امت دعوت' ہے۔ امت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کی ہدایت کیلئے رسول کو مبعوث کیا گیا ہو۔ بخلاف "جیل" (گروہ) کے، اسلئے کہ گروہ کا اطلاق ہر جماعت پر ہوتا ہے خواہ اسکی طرف رسول مبعوث کیا گیا یا نہ کیا گیا ہو۔

۴۔۔۔ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ : لفظ ثم استبعاد کیلئے ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ میری نبوت کے ظاہر ہوجانے اور میرے معجزات کا اچھی طرح مشاہدہ کر لینے کے بعد مجھ پر ایمان لائے بغیر مر جانا، عقل وفراست رکھنے والوں سے بعید ہے۔ جیسے کہ اس ارشاد میں لفظ ثمّ استبعاد کیلئے ہے۔ ثم اعرض عنھا پھر اس سے اعراض کیا۔

۵۔۔۔حدیث زیر عنوان کا حاصل مقصود یہ ہے:

سَمِعَ بِیْ وَتَبَیَّنَ لَہٗ مُعْجِزَتِیْ ثُمَّ لَمْ یُؤْمِنْ کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ وَاِنْ کَانَ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ ﴿لمعات﴾

جس نے مجھے سنا اور میرا معجزہ اس پر واضح ہو گیا، پھر بھی مجھ پر ایمان نہ لایا
وہ جہنمی ہونے والوں میں سے ہے، خواہ وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہو۔

فوائد

۱۔۔۔وَالَّذِیْ یعنی وَاللّٰہُ الَّذِیْ۔ نَفْسُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:
یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی روح، ذات، صفات، حالات، ارادت اور حرکات وسکنات، جس کی نعمت کا فیضان، جس کی قدرت سے حاصل اور جس کے ارادہ سے ثابت ہیں۔ چونکہ ہاتھ اکثر وبیشتر اظہار قدرت کا مرکزی ذریعہ بنتا ہے اسلئے قدرت کیلئے بطور استعارہ لفظ ید کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔۔۔بِیَدِہٖ: یہ متشابہات میں سے ہے۔ اسی سلسلے میں سلف صالحین کا مذہب یہ ہے کہ اس طرح کے کلمات کے معانی مراد کی تعیین کے بجائے اسکے علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردینا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ لفظ کے ظاہری مفہوم سے ذاتِ الٰہی کو منزہ سمجھنا چاہئے۔ یہی اسلم طریقہ ہے۔ اسلئے کہ تاویل کرنے والے کیلئے بہر حال یہ اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے کلام کی ایسی مراد ظاہر کرے جو فی الواقع

خدا کی مراد نہ ہو۔ ارشاد ربانی **وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ** پر جمہور کا وقف کرنا اور پھر اس کو وقف لازم قرار دینا سلف ہی کے مذہب کا مؤید ہے۔

سیدنا امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ "ید" کی تاویل قدرت سے اس "تعطیل" کی طرف موَدّی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ثابت نہیں فرمایا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ اس پر تو ایمان لے آئیں، جو اللہ نے فرمایا ہے اور اس پر ایمان لے آئیں، جو اس نے اپنے اس ارشاد سے مراد لیا ہے، لیکن ان الفاظ کی تاویل اور اسکی مراد کی تعیین کی جسارت سے اپنے کو بچاتے رہیں۔ بس ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم کہیں کہ اللہ کیلئے ید ہے۔ مگر اس ید سے مراد کیا ہے یہ خدا ہی جانے۔ یہ ید مخلوقین کے ہاتھ کی طرح نہیں۔

یہ تو رہی متقدمین کی روش متشابہات کے باب میں۔ رہ گئے، علماء متاخرین، تو ان کا کہنا یہ ہے کہ متشابہات کی بھی ایسی تاویل جائز ہے، جو اللہ تعالیٰ کی شانِ جلالت کے لائق و مناسب ہو۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ جس میں جسم و جہت اور اس کے لوازم سے ذات الٰہی کی تنزیہہ بھی ہو۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد کہ:

اَنَا اَعۡلَمُ تَاوِیۡلَہٗ وَاَنَا مِنَ الرَّاسِخِیۡنَ فِی الۡعِلۡمِ

میں اس کی تاویل جانتا ہوں اور میں راسخین فی العلم سے ہوں

۔۔۔۔ کی روشنی میں متاخرین، ارشاد ربانی۔۔۔ **وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ** ۔۔۔ پر وقف نہیں کرتے بلکہ **وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ** پر وقف فرماتے ہیں ۔۔۔ الحاصل۔۔۔ دونوں مذہب رب تعالیٰ کی تنزیہہ پر متفق ہیں۔ بس اختلاف اس بات میں ہے کہ بہتر کیا ہے؟

تفویض: (متشابہات کی مراد کو علم الٰہی کے سپرد کرنا) ۔۔۔ یا۔۔۔ تاویل: (متشابہات کی ایسی توجیہہ بیان کرنی جو شان الٰہی کے لائق ہو)۔ ممکن ہے کہ اس اختلاف کی بنیاد زمانے کا اختلاف ہو۔ کسی زمانے میں تفویض بہتر تھی، لیکن اب تاویل بہتر ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ صالحین کے زمانے میں چونکہ بدعتوں کا ظہور کالعدم تھا، لہٰذا ان کے ذہن و دماغ کو اہل بدعت کی شورشوں کا اتنا شدید مقابلہ نہیں کرنا پڑا جس کیلئے بعد والوں کو مجبور ہونا پڑا۔۔۔ الغرض۔۔۔۔ انکا زمانہ نسبتاً ذہن و فکر کی سلامتی کا زمانہ تھا، لہٰذا اس دور میں تاویل کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ اسلئے خواہ مخواہ اس میں پڑنا مناسب نہ سمجھا گیا اور مسلک تفویض کو اپنا کر گوشۂ عافیت ڈھونڈھ لیا گیا۔ لیکن متاخرین کا حال اور انکا زمانہ اس کے بالکل برعکس رہا۔۔۔۔ عوام کی کثرت، دینی شعور کی کمی، ہر لفظ سے جو ظاہر ہو

وہی مراد لے لینے کا ذوق، دینی فہم وفراست کے فقدان۔۔۔۔نیز۔۔۔علوم اسلامیہ سے نابلد ہونے کے باوجود امور دینیہ میں مداخلت کا جذبۂ بیکراں، اور نادان وناسمجھ عوام میں اہل بدعت کی بے پناہ شورشیں اور انکا بے پایاں غلو، زمانے کے یہ وہ حالات تھے جنھوں نے متاخرین کو تاویل کی طرف متوجہ ہونا ضروری قرار دیا۔ اور متاخرین نے اپنے دور کیلئے تاویل کو تفویض سے بہتر خیال کیا۔۔۔ بایں ہمہ ۔۔۔زمانے کے لحاظ سے جو روش بھی بہتر ہو۔ مگر نفس الامر میں مسلک تاویل اگر 'طریقہء سالم' ہے، تو مسلک تفویض 'طریقہء اسلم'۔

۳۔۔۔۔لَا یَسْمَعُ بِیْ :باء کو من کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور یہ بھی گوشہ نکالا گیا ہے کہ باء تعدیہ کی تاکید کیلئے ہو، جیسا کہ اس ارشاد ربانی میں ہے مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا (ہم نے اسے نہیں سنا)

۴۔۔۔۔اَحَدٌ: یعنی ان میں سے جو موجود ہوں یا موجود ہونے والے ہوں۔

۵۔۔۔۔مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ: من کو بیانیہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

۶۔۔۔۔ یَهُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ : ان دونوں کو احد کی صفت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب یہودیوں اور نصرانیوں کا یہ حال ہے، کہ بغیر رسول پر ایمان لائے ان کی نجات نہیں، حالانکہ وہ اہل کتاب سے ہیں، تو پھر دوسرے مشرکین و کفار کی نجات بغیر رسول کریم پر ایمان لائے کیسے ہوسکتی ہے، جبکہ وہ تو صاحب کتاب بھی نہیں ۔۔۔المختصر۔۔۔ اس حدیث سے یہودیوں اور نصرانیوں کا حال معلوم کرلینے کے بعد دوسرے غیر کتابی کفار و مشرکین کا حال بطریق اولیٰ معلوم ہوجاتا ہے۔۔۔۔ لا نصرانی میں لا زائد ہے، تاکید حکم کیلئے ہے۔

۷۔۔۔۔ثُمَّ یَمُوْتُ: اس سے اشارہ ملتا ہے کہ حالت موت طاری ہونے سے پہلے اگر کوئی ایمان والا ہوگیا، تو وہ نجات پائے گا۔

۸۔۔۔۔ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ: یعنی خدا کا پسندیدہ دین، اسلام پورا جملہ حال۔۔۔۔یا۔۔۔۔عطف۔

۹۔۔۔۔اِلَّا کَانَ: یعنی علم الہٰی میں۔۔۔۔یا۔۔۔۔کان معنی میں یکون کے ہے اور مستقبل کی تعبیر لفظ ماضی سے اسکے وقوع کے یقینی ہونے کی نشاندہی کیلئے ہے۔ یہ استثنائے مفرغ ہے، جسکا مستثنیٰ منہ، 'الاحوال العامۃ' ہے۔

۱۰۔۔۔۔ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ :یعنی لازمی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہنے والے۔ لیکن وہ جس نے سنا اور ایمان لایا اسکا حکم اس کے برعکس ہے۔ رہ گیا وہ جس نے نہ سنا اور نہ

مانا، وہ اس وعید سے خارج ہے۔

۱۱۔۔۔لَا یَسۡمَعُ بِیۡ : میں لا بمعنی لیس ہے،اور ثم یموت مثبت یسمع پر عطف ہے اور لم یومن عطف ہے یموت پر یا اسکے فاعل سے حال ہے اور لیس اس مجموع کی نفی کیلئے ہے۔

۔۔۔اس تفصیل کی روشنی میں تقدیر عبارت یہ ہوگی:

لَیۡسَ اَحَدٌ یَسۡمَعُ بِیۡ ثُمَّ یَمُوۡتُ وَلَمۡ یُؤۡمِنۡ اَوۡ غَیۡرَ مُؤۡمِنٍ کَائِنًا مِنۡ اَصۡحَابِ شَیۡءٍ اِلَّا مِنۡ اَصۡحَابِ النَّارِ وَاِنۡ کَانَ مِنۡ اَصۡحَابِ الۡکِتَابِ ؕ

کوئی مجھے سنے، پھر مر جائے اور ایمان نہ لائے۔۔یا۔۔اس حال میں مرے کہ
وہ غیر مومن ہو، تو وہ کسی چیز والا نہیں ہوسکتا، سوائے جہنم والا ہونے کے،
اگر چہ وہ اہل کتاب ہی سے کیوں نہ ہو۔

۔۔۔میں نے حدیث پاک کے ساتھ ساتھ شروع ہی میں تحریر کر دیا ہے۔اس کی قسم اس امت میں سے کوئی یہودی وعیسائی میرا نام سن لے، پھر ایمان لائے بغیر مر جائے، اس پر جو مجھے دے کر بھیجا گیا مگر وہ دوزخی ہوگا۔

۱۲۔۔۔حدیث زیر شرح کا ایک تو مطلب خیز ترجمہ وہ تھا جو میں نے اوپر بیان کیا۔اس کے ترجمہ کے الفاظ یہ بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔روایت ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جسکے قبضہ میں میری جان ہے کہ اس امت میں سے جو شخص بھی خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی میری (رسالت کی) خبر کو سنے اور خدا کا جو پیغام میں لایا ہوں اس پر ایمان نہ لائے اور مر جائے وہ یقیناً دوزخی ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس امت سے جسے میری رسالت کی خبر ملے خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، پھر وہ اس پر ایمان لائے بغیر مر جائے، تو نہیں ہے وہ شخص لیکن دوزخیوں سے (یعنی وہ یقینی طور پر جہنم میں جانے والا ہے)۔

۔۔۔ان تمام ترجموں میں صرف عبارتوں کا فرق ہے، حاصل مراد سب کا ایک ہی ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثَۃٌ لَّھُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِیِّہٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَّالْعَبْدُ الْمَمْلُوْکُ اِذَااَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ وَحَقَّ مَوَالِیْہِ وَرَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَہٗ اَمَۃٌ یَطَاُھَا فَاَدَّبَھَافَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَھَا وَ عَلَّمَھَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَھَا ثُمَّ اَعْتَقَھَا فَتَزَوَّجَھَا فَلَہٗ اَجْرَانِ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کیلئے دوگنا ثواب ہے۔ پہلا وہ کتابی مرد: جو اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور محمد ﷺ پر بھی ایمان لے آیا۔ دوسرا وہ غلام: جس نے اللہ کے حق کو بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کے حقوق بھی پورے کئے۔ تیسرا وہ مرد: جس کے پاس ایک لونڈی تھی جس سے وہ صحبت کرتا تھا، تو اس نے اس لونڈی کو بہ حسن وخوبی اچھے آداب اور اچھی تعلیم سے آراستہ کیا، پھر اسے آزاد کر کے اس سے اپنا نکاح کرلیا، تو اس کیلئے دوگنا ثواب ہے۔ ﴿بخاری شریف﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ: آپ ایک جلیل القدر صحابئ رسول کریم ہیں۔ آپ کا اسم شریف عبداللہ بن قیس ہے۔آپ کے اجداد میں سے کسی ایک کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو اشعری کہا جاتا ہے۔اولاً: آپ یمن سے مکہ آئے اور شرف اسلام سے مشرف ہوئے اور حبشہ کو ہجرت فرما گئے۔اسکے بعد فتح خیبر کے موقع پر آنحضرت ﷺ کا شرف ملازمت حاصل کیا اور بارگاہِ رسالت کے شاہانہ انعام واکرام سے مالا مال ہوئے۔آپ کے مناقب کثیر ہیں۔﴿رضی اللہ عنہ﴾

۲۔۔۔رَجُلٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ۔۔۔الخ: اس ارشاد سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اگر کوئی کتابی ظہور نبوت محمدیہ کے بعد نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان نہیں لایا، تو اسکا اپنے نبی پر اور اس نبی کے دین پر ایمان وعمل دونوں کو ضائع کر دیا جائے گا اور اسکو ایمان وعمل پر کوئی ثواب نہ ملے گا، اسلئے کہ اسکا دین منسوخ ہو چکا ہے۔۔۔ہاں۔۔۔اگر وہ دین محمدی پر ایمان لے آئے، تو اپنے دین سابق پر ایمان وعمل کا اجر بھی عطا کیا جائے گا۔یہ اجر رب کریم اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائے گا۔۔۔نیز۔۔۔ اسلئے عطا فرمائے گا تاکہ سبھوں پر رسول عربی کے دین عظیم کی وہ بزرگی وکرامت ظاہر ہو جائے جو مولیٰ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔۔۔الحاصل۔۔۔اللہ تعالیٰ صرف اپنے فضل وکرم سے۔۔۔نیز۔۔۔دین محمدی کی عظمت وکرامت کے اظہار کیلئے دین اسلام پر ایمان لانے والے کتابی کو اسکے دین منسوخ پر ایمان لانے پر بھی اجر عطا فرماتا ہے، درآنحالیکہ اس دین پر ایمان لائق اجر نہیں، جو منسوخ کر دیا گیا ہو۔

۳۔۔۔فَاَدَّبَھَا فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبَھَا۔۔۔الخ: تادیب وآداب کا تعلق احوال واخلاق سے ہے اور تعلیم کا تعلق احکام ومسائل سے۔تادیب وتعلیم میں احسان کی صورت یہ ہے کہ امور بحسن وخوبی انجام دیئے جائیں مناسب طریقے پر بقدر کفایت، یعنی نہ کم نہ زیادہ، مہربانی ونرمی کے ساتھ، سختی ودرشتی سے اجتناب کرتے ہوئے۔

۴۔۔۔کتابی اور عبد مذکور کیلئے دو اجر کا ثبوت ظاہر ہے۔اسلئے کہ انھوں نے دو عمل کیا جسکا دو اجر ملا۔رہ گیا وہ مرد جس نے اپنی لونڈی کو تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا پھر اسے آزاد کر کے اس سے

نکاح کرلیا تو اس مرد کو کن دو باتوں کا دو اجر ملے گا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ جہاں تک تعلیم وتربیت کا سوال ہے، یہ کچھ لونڈی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ آل واولاد وغیرہ سبھی کیلئے عام ہے، لہٰذا ان دو باتوں میں سے جنھیں باعث اجر قرار دینا یہاں مقصود ہے، ایک ہے اعتاق (آزاد کردینا) اور دوسرا ہے تزوّج (نکاح کرلینا)۔ رہ گئی تعلیم وتربیت تو اسے اس لونڈی میں اسی 'اعتاق' اور 'تزوج' کی اہلیت واستحقاق پیدا کرنے کی تمہید قرار دیا جاسکتا ہے۔

۵۔۔۔۔**یَطَاُھَا**: یہ قید اتفاقی ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ مرد صرف وطی مذکور سے کسی اجر کا مستحق نہ تھا، لیکن اس نے 'اعتاق وتزوج' کے اعمال کو اپنا کر اپنے کو مستحق اجر بنالیا۔

۶۔۔۔۔بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس حدیث زیر شرح کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ صرف اپنے ان دو دو اعمال کے سبب دو دو اجر پائیں گے جو اعمال حدیث میں مذکور ہیں، اسلئے کہ یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو دو عمل کرے گا وہ دو اجر کا مستحق ہوگا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کا منشاء یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر حدیث شریف میں ہے انکو اللہ کے فضل وکرم سے یہ خصوصیت دی گئی ہے کہ وہ اپنے ہر ہر کار خیر میں اوروں کے مقابل میں دوگنا اجر کے مستحق ہونگے، خواہ وہ کار خیر از قسم نماز ہو یا از قسم روزہ وغیرہ۔۔۔۔مثلاً۔۔۔۔اگر کسی دوسرے کو کسی عمل پر دس نیکی ملی تو انکو اسی عمل پر بیس نیکی عطا کی جائے گی۔ یوں ہی جس عمل پر اوروں کو کوئی ثواب ملے گا اسی عمل پر انکو اس ثواب کا دوگنا حاصل ہوگا: **ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ**۔۔۔ ﴿واللہ اعلم﴾

۷۔۔۔۔**فَلَهٗ اَجْرَانِ**: یہ تکرار تاکید ومبالغہ کی جہت سے ہے جس سے حدیث میں ذکر کئے ہوئے مردِ اخیر کے چند اجر کے مستحق ہونے پر تاکید ہوجاتی ہے۔

فوائد

۱۔۔۔۔**عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ**: ۲۰ھ میں حضرت فاروق اعظم نے آپ کو بصرہ کا والی وحاکم مقرر فرمایا۔ حضرت عثمان غنی کی خلافت کے ابتدائی عہد میں آپ کو وہاں سے ہٹا کر کوفہ روانہ کردیا گیا اور وہاں کا حاکم بنادیا گیا۔ شہادت حضرت عثمان تک کوفہ کی ولایت آپ ہی کے ہاتھ

میں رہی۔ جب حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے تو آپ تحکیم کے بعد مکہ واپس آ گئے اور پھر تا حیات وہیں رہے۔ ۵۲ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

۲۔۔۔۔ثَلَاثَةٌ: یعنی اشخاص ثلاثة (تین لوگ) یہ مبتداء ہے۔لھم اجران، اسکی خبر ہے۔

۳۔۔۔۔لَّهُمْ اَجْرَانِ: یعنی ان میں سے ہر ایک کیلئے دو اجر عظیم ہیں، جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی اس میں ان کا شریک نہیں۔

۴۔۔۔۔کتابیہ، کتابی کے حکم میں ہے اور امتہ مملوکہ عبد مملوک کے ۔۔۔۔نیز۔۔۔کسی غلام کی مالکہ کسی لونڈی کے مالک کے حکم میں ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں صرف مردوں کا ذکر ہے اور عورتوں کو حکم میں مردوں کا تابع قرار دیدیا گیا ہے۔

۵۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں اہل کتاب سے کیا مراد ہے، اس میں شارحین کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہاں اہل کتاب سے مراد صرف نصرانی ہیں اور بعض کے نزدیک صرف یہودی ہیں اور بعض کے نزدیک ایک مفہوم عام ہے، جو نصرانیت اور یہودیت دونوں کو شامل ہے۔ان میں ہر ایک اپنے موقف کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔تمام دلائل کی تشریح پھر اس کے مالہ وماعلیہ پر بحث طول کلام کا باعث ہے۔حدیث زیر بحث میں اہل کتاب سے مراد جنکے نزدیک صرف نصرانی ہیں انکا اختلاف اس بات پر مبنی ہے کہ نصرانیت یہودیت کی ناسخ ہو یا نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں جو نصرانیت کی تکذیب کرے اور اپنی یہودیت پر قائم رہے، وہ اپنے نبی پر ایمان والا نہ ہوگا۔

۔۔۔المختصر۔۔۔حضرت موسیٰ پر صحیح الایمان اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے، جو حضرت عیسیٰ کی دعوت کو سننے کے بعد اس پر لبیک کہے اور نصرانیت قبول کر لے۔اور ظاہر ہے کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت موسیٰ پر کسی ایمان لانے والے تک رسول عربی ﷺ کی بعثت تک حضرت عیسیٰ کی دعوت نہ پہنچے۔ اور جب دعوت پہنچ گئی، تو اب حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ خود حضرت موسیٰ پر صحیح الایمان نہیں ہے۔شاید اسی حکمت کو ظاہر کرنے کیلئے بخاری شریف کی ایک روایت میں واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا گیا ہے: فَاِذَا آمَنَ بِعِيْسٰى ثُمَّ آمَنَ بِىْ پس جب وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے فله اجران پھر مجھ پر ایمان لائے، تو اسکے لئے دوگنا اجر ہے۔

روایت مذکورہ سے صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے، کہ کوئی ایسا بنی اسرائیل نہ ہوگا جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے اور نبی آخر الزماں کی بعثت تک حضرت عیسیٰ کی دعوت اسے نہ پہنچے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔دعوت پہنچ جانے کی صورت میں حضرت عیسیٰ کو مانے بغیر حضرت موسیٰ کا صحیح ماننے والا اسے قرار دیا جائے

۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔حضرت موسیٰ پر صحیح الایمان بنی اسرائیل یہودی لازمی طور پر حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے والا ہوگا۔اسی لئے روایت مذکورہ میں صرف حضرت عیسیٰ پر ایمان کا ذکر کر دیا گیا۔۔۔۔غور وفکر کے بعد ایک ایسی صورت نکلتی ہے، کہ ایک غیر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئے اور یہودیت اختیار کر لے اور کسی نبی کی تکذیب نہ کرے، تو وہ یقینی طور پر یہودی اور حضرت موسیٰ کا صحیح ماننے والا کہا جائیگا۔کیونکہ حضرت عیسیٰ کی دعوت کا اس تک پہنچنا غیر ضروری ہے۔اسلئے کہ حضرت عیسیٰ کی رسالت بالاتفاق بنی اسرائیل کیلئے مخصوص ہے اور غیر بنی اسرائیل آپ کے دائرۂ دعوت وتبلیغ کے باہر ہیں۔

مذکورہ بالا ایسے شخص پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کا صحیح ماننے والا ہے اور کسی نبی کی تکذیب کرنے والا نہیں۔اب اگر یہ شخص اسی حال میں رہے اور رسول عربی کی بعثت کا زمانہ آجائے اور وہ آپ پر ایمان لے آئے، تو یقینی طور پر وہ بھی حدیث زیر شرح میں مذکور اجر کا مستحق ہوگا۔اسی طرح کے لوگوں کی مثال میں جانب یمن کے ان عربی لوگوں کو پیش کیا جاسکتا ہے، جنھوں نے یہودیت اختیار کر لی تھی اور حضرت عیسیٰ کی دعوت ان تک نہ پہنچی، اسلئے کہ آپ کی رسالت بنی اسرائیل کیلئے مخصوص تھی۔

اس تحقیق کے بعد حدیث زیر شرح میں اہل کتاب سے متعلق یہ بات زیادہ مناسب، قرین قیاس اور معقول ہے، کہ اہل کتاب سے مراد اہل تورات بھی ہیں اور اہل انجیل بھی۔کتاب وسنت کے ارشادات کے عموم سے ذہنی طور پر یہی متبادر بھی ہے۔حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اشباہ کیلئے ارشاد ربانی ہے:

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ﴿سورۃ القصص:۵۲﴾

جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ۔۔۔ ﴿سورۃ القصص:۵۴﴾

انکو انکا اجر دوبار دیا جائے گا۔۔۔

۶۔۔۔۔یہ خیال کرنا کہ مدینے کے یہودی حضرت عیسیٰ پر ایمان نہیں لائے تھے، اسلئے وہ دوگنے اجر کے مستحق نہیں ہوتے، غیر مناسب ہے، اسلئے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان جیسے وسیع العلم اور کمال عقل رکھنے والوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان نہیں لائے تھے، صحیح نہیں

﴿کذا حققہٗ ابن حجر﴾

۷۔۔۔۔اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ: یہاں جس ایمان کا ذکر ہے وہ ایمان صحیح ہے۔ایمان صحیح کی صورت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت انجیل کے ناسخ ہونے کی صورت میں انجیل سے، ورنہ شریعت محمدیہ سے

منسوخ ہونے کے علم سے پہلے، ایک یہودی حضرت موسیٰ پر ایمان لائے۔۔۔۔یا۔۔۔۔کوئی یہودی یا نصرانی (جسے حضرت عیسیٰ کا اپنا رسول ہونے کا علم ہو چکا ہے) حضرت عیسیٰ کی شریعت کے (شریعت محمدیہ سے) نسخ کے علم سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے۔ 'قبل نسخ' کی قید اسلئے لگائی گئی ہے تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جب ایک شریعت دوسری شریعت سے منسوخ ہو جاتی ہے، تو اس نسخ کا علم وخبر رکھتے ہوئے پہلی شریعت پر ایمان کسی اجر وثواب کا مستحق نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا شریعت ناسخہ کی موجودگی میں شریعت منسوخہ پر ایمان لانے والا، اپنے نبی پر صحیح ایمان لانے والا نہیں کہا جائے گا۔

۸۔۔۔۔ایک احتمال کی روشنی میں 'قبل نسخ' کی قید کی ضرورت نہیں رہ جاتی، وہ یہ کہ یہ بعید از قیاس نہیں کہ رسول کریم ﷺ پر ایمان لانا ہی ایمان لانے والے کے ایمان سابق پر اجر وثواب کا باعث ہو۔ تو اگرچہ شریعت منسوخہ کے نسخ کے علم کے بعد اس پر ایمان فی نفسہٖ کارِ خیر ہونے کے باوجود کسی اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے شریعت محمدیہ پر ایمان لانے والے کو اسکے ایمان سابق پر بھی اجر عطا فرمائیگا۔ جس طرح کہ ایک کافر جب مسلمان ہو جاتا ہے تو اسے ان اچھائیوں کا بھی اجر بفضلہٖ تعالیٰ عطا کیا جاتا ہے، جو اچھائیاں اور نیکیاں اس سے عالم کفر میں ہوئی تھیں۔ اس خیال کی تائید اس ارشاد ربانی کے عموم سے بھی ہوتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ

﴿سورۃ الحدید:۲۸﴾

اے (اپنے نبیوں پر) ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اسکے رسول (محمد ﷺ)
پر ایمان لاؤ، وہ اپنی رحمت کے دو حصے تمہیں عطا فرمائے گا۔

۔۔۔۔حضور ﷺ نے ہرقل کے نام جو مکتوب گرامی روانہ فرمایا تھا اس میں ارشاد تھا:

اَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ

اسلام قبول کر لو اللہ تعالیٰ تمہیں دو چند اجر عطا فرمائے گا

۔۔۔۔شیخ الاسلام بلقینی نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ ہرقل کی قوم بنی اسرائیل سے نہ تھی، بلکہ اپنے مذہب کو تبدیل کر کے انھوں نے نصرانیت اختیار کر لی تھی۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔مذکورہ ارشادِ رسالت سے بھی مذکورہ بالا خیال کی تائید ہوتی ہے۔

۹۔۔۔۔یہ بھی احتمال ہے کہ اہل کتاب کا مسلمان ہونا دو جہت سے دو چند اجر کا سبب ہو۔ پہلی جہت خود انکا اسلام لانا ہے اور دوسری جہت یہ کہ انکا اسلام انکے اتباع واذناب کے اسلام کا سبب ہے۔

۱۰۔۔۔۔مرآۃ، شرح مشکوٰۃ، مؤلفہ حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب علیہ الرحمۃ میں فقرہ زیر شرح سے متعلق یہ تشریح کی گئی ہے۔

'اہل کتاب اگر حضور پر ایمان لے آویں، تو انھیں اوّلاً' اہل کتاب ہونے پر بھی ثواب ملے گا، اگرچہ اس حالت میں وہ اپنے نبیوں پر غلط طریقے سے ایمان لائے تھے کہ عیسائی حضرت مسیح کو، یہود حضرت عزیر کو، خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ مگر چونکہ ان نبیوں کو سچا انکی کتابوں کو برحق تو مانتے تھے۔ اسکا ثواب اب پالینگے، جیسے عبداللہ ابن سلام و کعب احبار وغیرہ۔ یہ حکم تا قیامت ہے۔

۔۔۔الختصر۔۔۔رسول کریم پر ایمان لانا حسنات سابقہ کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور اسلام قبول کرنے والا عالم کفر کی اچھائیوں کا بھی اجر و ثواب پالیتا ہے۔

۱۱۔۔۔**وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ**: یہاں بھی ایمان سے مراد ایمانِ صحیح ہے۔ اس مقام پر یہ خیال رہے کہ آپ ﷺ پر ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سارے انبیاء پر ایمان لایا جائے۔۔۔الغرض۔۔۔آپ پر ایمان سارے انبیاء پر ایمان کو متضمن ہے۔ اب مقصود کلام یہ ہو گیا کہ کتابی کا ایمانِ سابق مستحق اجر و ثواب ہے، اسلئے کہ جس نبی پر وہ ایمان لایا ہے وہ نبی برحق اور انکا دین، دین حق تھا۔

۱۲۔۔۔اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَبِمُحَمَّدٍ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر اس اختصار کو اختیار نہیں کیا گیا اور ارشاد فرمایا گیا: اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر نبی پر ایمان ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی نبی پر ایمان کسی دوسرے نبی پر ایمان کا تابع ہو۔

۱۳۔۔۔**وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ**: لفظ مملوک کی قید سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہاں عبد سے مطلق عبد مراد نہیں، اسلئے کہ جہاں تک عبد ہونے کا سوال ہے سارے انسان عباد اللہ (اللہ کے بندے) ہیں۔

۱۴۔۔۔**اِذَا اَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ**: یعنی روزہ، نماز اور ان جیسی دوسری عبادتیں جو حقوق العباد سے متعلق نہ ہوں۔

۱۵۔۔۔ **وَحَقَّ مَوَالِيْهِ**: موالی، مولیٰ کی جمع ہے۔ مولیٰ کے معنی سردار و مالک اور متولی امر کے ہیں۔ اپنے آقاؤں کے حقوق کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ انکی جائز خدمت کیلئے اپنی طاقت و کوشش کو برابر مصروفِ کار رکھا جائے۔

۱۶۔۔۔مولیٰ کی جگہ اسکی جمع موالی استعمال کیا گیا، اسلئے کہ العبد میں الف لام جنس کا

ہے۔تو عندالتوزیع (تقسیم کے وقت) ہر عبد کیلئے ایک مولیٰ ہوا۔۔۔یا۔۔۔اس سے یہ اشارہ مقصود ہو کہ اگر کوئی عبد ایک جماعت کے درمیان مشترک ہو، یعنی اسکے آقاؤں کی ایک جماعت ہو، تو اس عبد کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام کے حقوق کی ادائیگی کرے۔تو پھر اگر ایک ہی آقا ہو، تو اسکے حقوق کی ادائیگی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوئی۔۔۔یا۔۔۔یہ اشارہ ہے کہ اگر حسب عادت مروجہ باری باری متعدد آقاؤں کی خدمت کرنی پڑے، تو وہ ان میں سے ہر ایک کی خدمت کر کے باری باری ہر ایک کے حقوق کی ادائیگی کو بحسن وخوبی قائم رکھے۔

۱۷۔۔۔حدیث شریف کے فقرہ زیر شرح سے غیر خدا کی ملکیت وتصرف وولایت اور غیر خدا کیلئے انکی آقائی ثابت ہوگئی۔ظاہر ہوگیا کہ غیر خدا کی عبدیت کا انتساب غیر خدا کی طرف عقیدۂ توحید کو مجروح نہیں کرتا۔عبدیت کی نسبت غیر خدا کی طرف نصوص (قرآن وحدیث) میں بکثرت ہے، جسکی تفصیل طول کلام کا باعث ہے۔جسے تفصیل مطلوب ہو وہ میری تالیف 'اسلام کا نظریہ عبادت اور مودودی صاحب' کو ضرور ملاحظہ کرے، اس میں کسی قدر تفصیل موجود ہے۔اس مقام پر صرف ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہے۔مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ہرگز تم میں سے کوئی اپنے مملوک کو یوں نہ کہے کہ 'میرا بندہ' تم سب خدا کے بندے ہو، ہاں یوں کہے، میرا غلام۔۔۔۔﴿ہذا مختصر﴾۔۔۔۔

اس حدیث کے حکم سے خود سرکار رسالت ﷺ کی ذات مستثنیٰ ہے، جیسا کہ "قل یاعبادی" کی اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے، جسکو مولانا روم نے ان دو مصروں میں واضح کر دیا ہے۔ ؎

بندئہ خود خواندا احمد دررشاد

جملہ عالم رابخواں قل یا عباد

۔۔۔امیر گروہِ شاتمینِ بارگاہِ رسالت ﷺ، مولوی اشرف علی تھانوی نے بھی اسی معنی کی تائید وتوثیق کی ہے۔مذکورہ آیت کی مزید تشریح کیلئے 'اسلام کا نظریہ عبادت' کا مطالعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔یہ مقام ان تفصیلات کا متحمل نہیں۔مذکورہ حکم سے ذات رسالت کا استثناء اس طرح بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ حدیث مذکورہ بالا خود رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے جسکے مخاطب آپ پر ایمان لانے والے ہیں، تو پھر آپ کو مخاطبین کی منزل میں رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا کس قدر مضحکہ خیز اور عقل وفراست کا دیوالیہ ہے۔

۔۔۔الختصر۔۔۔اس حدیث میں کسی آقا سے اسکی آقائیت اور کسی عبد سے اسکی عبدیت نہیں چھین لی گئی ہے۔بلکہ اس میں ہر آقا کو ہدایت ہے، کہ وہ اپنے عبد کو اپنا عبد نہ کہے، مگر بندوں کو یہ حکم نہیں

دیا گیا ہے کہ وہ خود کو اپنے آقا کا عبد نہ کہیں ۔۔۔۔یا۔۔۔۔کوئی انھیں انکے آقا کا بندہ نہ کہے، جبھی تو فاروقِ اعظم نے اپنے کو رسول کا عبدان لفظوں میں فرمایا ہے:

'کُنْتُ عَبْدَهٗ وَخَادِمَهٗ'

'(میں حضور ﷺ کا) بندہ اور انکا خدمت گزار تھا'

۔۔۔۔نیز۔۔۔۔قرآن کریم نے 'ہمارے غلاموں' کی 'ہمارے عباد' سے تعبیر کی ہے اور حدیث شریف میں 'ہمارے بندہ' کو 'ہمارا عبد' قرار دیا گیا ہے۔تفصیلات اور حوالہ جات کیلئے 'اسلام کا نظریہ عبادت' کا مطالعہ کیجئے۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔مسلم شریف کی مذکورہ بالا حدیث سے ہماری اس تشریح پر کوئی آنچ نہیں آتی، جو فائدہ زیر تحریر کے آغاز میں کی گئی ہے۔

۱۸۔۔۔۔ **وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَطَاُهَا** : 'وطی بالفعل' ہے، تو یہ قید اتفاقی ہے، جس سے عام حالات وعادات کی عکاسی ہوتی ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسکے باوجود بھی اعتاق وتزوج کا ثواب اُسے حاصل ہوگا۔اور اگر وطی سے مراد 'وطی بالقوۃ' ہے، جب بھی اس قید سے صرف تاکید کا فائدہ ہوتا ہے، اسلئے کہ لفظ اَمَۃ ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ 'بالقوۃ موطوۃً' ہے اور مالک 'بالقوۃ صاحب وطی'۔ بخاری کی روایت میں ہے 'اذا ادب الرجل امۃ فاحسن تادیبھا ۔۔۔الخ' اس روایت میں 'یطاھا' کی قید نہیں ہے جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث زیر شرح میں وطی سے مراد 'وطی بالقوۃً' ہی ہے۔

۱۹۔۔۔۔ **فَلَهٗ اَجْرَانِ** : فَلَہٗ کی ضمیر رجل کانت عندہ ۔۔۔الخ یعنی مراد اخیر کی طرف راجع ہے۔صرف باب امۃ میں فلہٗ اجران کی تکرار حالت امۃ کی تاکید کیلئے ہے۔اسلئے کہ یہاں دو اجر کے جو موجب ہیں، یعنی اعتاق اور تزوج، یہ دونوں امور مستحبہ میں سے ہیں۔ اور 'جائز الترک' ہیں۔انکو چھوڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔تو اب تاکید کی ضرورت ہوئی تاکہ اعتاق وتزوج کی اہمیت نظر سے اوجھل نہ ہو جائے اور ان پر مرتب ہونے والے اجر سے انسان محروم نہ رہ جائے۔اسکے برعکس حدیث زیر شرح کے وہ امور جو کتابی اور عبد مملوک سے متعلق ہیں وہ ایسے امور ہیں جنکی انجام دہی واجب ہے اور جنھیں ترک کرنا جائز نہیں۔یا اخیر میں فلہ اجران کے ذکر سے یہ ظاہر کرنا ہو کہ باب امۃ میں جو چار امور (یعنی تعلیم وتادیب، اعتاق وتزوج) ذکر کئے گئے ہیں، اس میں خصوصی طور پر موجب اجر صرف اعتاق وتزوج ہی ہے۔اسی لئے تعلیم وتادیب کے بجائے اعتاق وتزوج کے بعد فلہ اجران کا ذکر کیا گیا ہے۔رہ گئی تعلیم وتادیب تو یہ ہر حال میں موجب اجر ہے،

اپنوں کی ہو یا بیگانوں کی، آل واولاد کی ہو یا دوسرے انسانوں کی، اسکا موجب اجر ہونا کچھ امۃ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ فلہ اجران کے حکم کی تکرار امۃ اور اسکے تزوج کی شان کے اہتمام کیلئے ہے۔

۲۰۔۔۔۔اس مقام پر یہ خیال نہ کیا جائے کہ اپنی آزاد کردہ لونڈی سے تزویج کرنے والا اپنی اونٹنی پر سوار کی طرح ہے۔ پھر اس طرح کی تزویج پر کسی اجر کا کیا سوال ہے؟ اسلئے کہ اعتاق کے بعد تزوج ایک احسانِ عظیم کے بعد دوسرا احسانِ عظیم ہے۔ اگر عتق میں قید وغلامی کے قہر سے تخلیص و رہائی ہے، تو عتق کے بعد تزوج میں ایک مقہور کو قاہر سے ملا دینا ہے۔

۲۱۔۔۔۔فَلَہُ اَجرَانِ : یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ فلہ اجران کا معنی یہ ہے فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنُ الثَّلَاثَۃِ اَجرَانِ (پس ان تینوں میں سے ہر ایک کیلئے دوگنا اجر ہے) یعنی لہُ کی ضمیر ان تینوں میں سے ہر ایک کی طرف راجع ہے۔ اب اسکی تکرار یا تو تاکید کیلئے ہے یا طول کلام کیلئے۔ اس صورت میں اسکی حیثیت گویا ایک مفصل کے خلاصے کی ہے۔۔۔۔مثلاً: ارشاد ربانی ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴿سورۃ البقرہ:۸۹﴾

اور جب انکے پاس اللہ کی کتاب آئی، تصدیق کرنے والی اسکی جو انکے ساتھ ہے

۔۔۔۔ظاہر ہے کہ کتاب کہہ کر **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** کہنے کی ضرورت نہ تھی، اسلئے کہ کتاب تو خود ہی ہر تفصیل کی حامل ہے، لیکن اس تفصیل کا خلاصہ کیا ہے اسکو **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** سے تاکیداً وتنبیہاً بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث زیر شرح میں ذکر کردہ افراد سے متعلق ہر فقرہ کے بعد فَلَہُ اَجرَانِ ارشاد فرمایا گیا ہو، جسے راوی نے اختصار کے پیش نظر یا نسیان کے سبب ذکر نہ کیا ہو۔

۲۲۔۔۔۔اَجرانِ: دوچند اجر۔ اس سلسلے میں دو قول نظر سے گزرے ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔پہلا اجر 'اعتاق' پر اور دوسرا 'تزوج' پر۔۔۔۔اکثر یہی کہتے ہیں۔

﴿۲﴾۔۔۔پہلا اجر 'تعلیم وتادیب' پر اور دوسرا 'اعتاق وتزوج' پر۔۔۔۔بعض یہ کہتے ہیں۔

دوسرے قول کے قائلین کا کہنا ہے کہ حدیث زیر شرح میں جو 'ثم اعتقھا۔۔۔الخ' فرما کر تعلیم و تادیب اور اعتاق وتزوج کے مابین لفظ ثم (جو حرف عطف ہے) کو لایا گیا ہے اسکے ذریعہ عطف سے یہی فائدہ مرتب ہوتا ہے کہ دونوں کو الگ الگ دو خانوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور دونوں کے مابین بُعد مرتبہ کو ظاہر کرتے ہوئے، ان میں سے ہر ایک سے ایک ایک اجر کو وابستہ کر دیا جائے۔

۲۳۔۔۔۔اس مقام پر یہ سوال حاشیۂ خیال سے سر ابھارتا ہے کہ اگر صرف 'اعتاق وتزوج'

ہی پر دو اجر مرتب ہو جاتے ہیں، تو پھر 'تعلیم و تادیب' کے ذکر کی ضرورت ہی کیا ہے، اسلئے کہ اگر کوئی بالفرض تعلیم و تادیب کے بغیر ہی اعتاق و تزوج کو اپنا لے، اس صورت میں بھی اُسے دو چند اجر ملے گا۔ اس صورت میں یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، کہ تعلیم و تربیت کو ایک اجر اور اعتاق و تزوج کو دوسرے اجر کا سبب قرار دیا جائے۔ یہ دو اجر ایسے مخصوص اجر ہیں جنکا مستحق اپنے ہر ہر عمل خیر میں دوگنا اجر کا مستحق قرار دیدیا جاتا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔تعلیم و تربیت مثبت اعتاق و تزوج سے ایک ایسے مجموعہ کی تشکیل ہوتی ہے، جو مجموعہء امۃ ہی کے مخصوصات سے ہے۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔یہی وہ مجموعہ ہے جسکو اپنانے والا اپنے ہر کار خیر میں دو چند اجر کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ﴿والله اعلم بحقيقة الحال﴾

۲۴۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں جن اشیاء کا ذکر ہے انکے ذکر سے یہ مقصود نہیں ہے کہ انکے تمام ماسوا کی نفی کردی جائے اور یہ ظاہر کردیا جائے کہ دوگنے اجر کا ترتب صرف انھیں تین اشیاء پر ہوا کرتا ہے۔۔۔۔بلکہ۔۔۔۔مراد یہ ہے کہ یہ اشیاء اور انکے امثال و نظائر دوگنے اجر کے ترتب کا سبب ہیں۔

اس تشریح کے بعد اب یہ سوال خود بخود ہی اُٹھ جاتا ہے کہ ان تین چیزوں کی تخصیص کی وجہ کیا ہے، جبکہ انکے غیر میں بھی یہی شان ہے۔۔۔۔مثلاً: جس نے روزہ رکھا اور نماز پڑھی تو اسکے لئے دو اجر ہیں۔ ایک روزہ کا، اور ایک نماز کا۔۔۔۔یا۔۔۔۔جس بیٹے نے اللہ کا حق ادا کیا اور باپ کا حق ادا کیا اسکے لئے دو اجر ہیں: ایک حق اللہ کی ادائیگی کا اور دوسرا حق والد کی ادائیگی کا۔ اس سوال کے مذکورہ بالا جواب کا حاصل یہ ہوگا، کہ انکے ذکر سے انکے ماسوا کی نفی مقصود نہیں۔ مگر یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ پھر انھی تینوں اشیاء کے ذکر کو کس حکمت کو ظاہر کرنے کیلئے ترجیح دی گئی ہے۔ وجہ ترجیح سے متعلق دو قول نظر سے گزرے:

﴿۱﴾۔۔۔ادیان سابقہ کے نسخ سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ان پر ایمان لانے والوں میں سے مطلقاً کسی کو کوئی اجر نہیں ملے گا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔عوام میں یہ مشہور تھا کہ مملوک کا مالک کی خدمت کرنا کسی ثواب کا سبب نہیں۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔بعض یہ سوچنے لگے تھے کہ اپنی لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لینا یہ اپنی نفس کی غرض کیلئے ہے، پھر اس میں کسی اجر کا کیا سوال ہے۔ تو ان خیالات پریشاں کی اصلاح کیلئے ان تینوں امور کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا اور تزوج کے، سبب اجر ہونے کی وضاحت میں تاکید و مبالغہ اختیار کیا گیا۔

﴿۲﴾۔۔۔زمانہء جاہلیت میں ایک نبی کو ماننے والا دوسرے نبی پر ایمان کو محال خیال کرتا تھا۔۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ آقاؤں کے حقوق کی ادائیگی ناممکن سمجھی جاتی

تھی۔۔۔۔نیز۔۔۔۔لونڈی کو تعلیم وتربیت کے بعد آزاد کرنا۔۔۔۔یا۔۔۔۔آزاد کر کے پھر اُسی کو اپنے نکاح میں لے لینا شدید ناگوار تھا۔اسی لئے انکا خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا ہے اور انکو 'فلھم اجران' کہہ کر اس پر عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔﴿واللہ اعلم﴾

حدیث زیر شرح کے جواہر پارہ ۶ کے مضمون کو سامنے رکھا جائے، تو شروع ہی سے کوئی اعتراض نہیں وارد ہوتا اور نہ ہی کسی مخصوص اشیاء کے ذکر کی ترجیح کی وجہ سمجھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

۲۵۔۔۔۔مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ: 'جامع الصغیر' میں جلال الدین سیوطی رقمطراز ہیں:

رَوَاهُ الشَّیْخَانِ وَاَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنِّسَائِی وَابْنُ مَاجَهَ بِلَفْظِ ثَلَاثَةٌ یُوْتُوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَیْنِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ آمَنَ بِنَبِیِّهٖ وَاَدْرَکَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَآمَنَ بِهٖ وَاتَّبَعَهٗ وَصَدَّقَهٗ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَعَبْدٌ مَمْلُوْکٌ اَدّٰی حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ سَیِّدِهٖ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَرَجُلٌ کَانَتْ لَهٗ اَمَةٌ فَغَذَاهَافَاَحْسَنَ غَذَاهَا ثُمَّ اَدَّبَهَافَاَحْسَنَ تَادِیْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ۔

اسکی روایت شیخین، احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ان لفظوں میں کی ہے کہ تین شخص وہ ہیں جنھیں دوبارا اجر عطا فرمایا جائے گا۔ایک وہ مرد جو اہل کتاب سے ہے: اپنے نبی پر ایمان لایا اور رسول اللہ ﷺ کو پایا تو آپ پر ایمان لایا، آپ کی اتباع کی آپ کے دین کی تصدیق کی، تو اس کیلئے دو اجر ہیں۔اور دوسرا وہ مملوک بندہ: جس نے اللہ کا حق ادا کیا اور اپنے آقا کا حق ادا کیا، تو اس کیلئے دو اجر ہیں۔تیسرا وہ مرد: جسکے پاس لونڈی تھی، اس نے اسکی اچھی طرح پرورش کی، پھر اچھے انداز سے ادب سکھایا، اچھے طریقے سے علوم سے آراستہ کیا، پھر اسے آزاد کر کے اس سے اپنا نکاح کر لیا، تو اس کیلئے دو اجر ہیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَصِمُوْا مِنّیْ دِمَآءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ اِلَّا اَنَّ مُسْلِمًا لَّمْ یَذْکُرْ بِحَقِّ الْاِسْلَامِ.

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑوں جب تک وہ اس بات کی شہادت نہ دے لیں، کہ بیشک اللہ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور یقیناً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ ایسا کرنے لگیں گے، تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے بچالیں گے، سوا اسلامی حق کے اور انکا حساب اللہ کے ذمہ ہے (اس حدیث پر بخاری و مسلم دونوں کا اتفاق ہے) ہاں مسلم کی حدیث میں اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ کا لفظ مذکور نہیں ہے۔

جواہر پارے

۱۔۔۔حَتّٰی یَشْهَدُوْا۔۔۔الخ: یعنی کلمہ طیبہ کا اقرار کرلیں۔۔۔۔یا۔۔۔۔وہ عمل انجام دیں جو اس شہادت کے حکم میں ہے۔۔۔۔مثلاً: اہل کتاب کا جزیہ دینا قبول کرلینا۔۔۔۔یا۔۔۔۔بت پرستوں کا صلح کرلینا۔۔۔۔یا۔۔۔۔ان سب کا امن طلب کرلینا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جزیہ وصلح استیمان کے احکام کے نزول کے پہلے کا یہ ارشاد ہو۔ ایسی صورت میں مذکورہ بالا توجیہہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

۲۔۔۔وَیُقِیْمُوا۔۔۔الخ: قتال کا وجود شہادت کلمہ پہ منتہی ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد عبادات کا ذکر صرف اسلئے کیا ہے، تا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ شہادتِ کلمہ کو کمال، ارکان اسلام کی ادائیگی سے حاصل ہوتا ہے۔

۳۔۔۔عباداتِ اسلامیہ میں صرف نماز و زکوٰۃ کے ذکر کی چند وجہیں ہوسکتی ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔نماز و زکوٰۃ تمام عبادات کی اصل ہے۔

نماز عبادات بدنیہ کی اصل، زکوٰۃ عبادات مالیہ کی۔

﴿۲﴾۔۔۔قرآن کریم میں ان دونوں کا ذکر ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

یعنی ان دونوں کو ذکر میں قریب رکھا گیا ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔یہ بھی احتمال ہے کہ ان دونوں کے سوا اس وقت دوسری عبادتیں فرض نہ کی گئی ہوں، اسی لئے انھی کا ذکر فرمایا گیا۔

۴۔۔۔بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ عبادات کا ذکر اسلئے ہے تا کہ ظاہر ہو جائے کہ واجبات اور فرائض کا ترک اور تاویل فاسد کے ذریعہ اس ترک پر اصرار یہ خود قتال کا موجب ہے۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبر نے مانعین زکوٰۃ سے قتال کیا تھا۔ انھی بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر شعائر اسلام میں سے کسی شعار (۔۔۔۔مثلا: اذان دینا، ختنہ کرانا وغیرہ) کو کوئی قوم ترک کرے اور اس پر مصر ہو، تو امام وقت (سلطان وقت) کو اس سے قتال کرنیکا پورا حق ہے۔ ایسی صورت میں حدیث زیر شرح میں مذکور 'بِحَقِّ الْاِسْلَامِ' سے نفس معصومہ کا قتل، لوگوں کے اموال میں خیانت اور تاویل باطل کے ذریعہ ترک فرائض مراد ہوگا۔ ﴿فافهم﴾

۵۔۔۔۔الَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ :مگر بحق اسلامی وحکم شریعت۔۔۔۔مثلاً: کسی نے کسی کو قتل کردیا۔۔۔۔یا۔۔۔۔کسی نے کسی سے بدفعلی کی، تواس پر حکم شرع سے قصاص وحد کا نفاذ ہوگا۔۔۔۔یونہی ۔۔۔۔اگر کسی پر کسی کا مال واجب ہے اور وہ نہیں دیتا، تو بحکم شرع اسکا مال لے لیا جائے گا۔۔۔۔الحاصل ۔۔۔۔مذکورہ بالا اشخاص پر قصاص وحد کا نفاذ اسلام کا حق ہے۔

۶۔۔۔۔حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ :یعنی ہم تو اسکے ظاہر اسلام کو دیکھتے ہوئے اسکی جان اوراسکے مال کو محفوظ رکھیں گے۔اب اگر اسنے اپنے کفر اور اپنی معصیتوں کو چھپا رکھا ہے، تو اسکا حساب آخرت میں خدائے علیم وخبیر لے گا۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔ہم اسلام وحقوق اسلام کا حکم ظاہر کو دیکھ کر کرینگے۔رہ گیا باطن کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ، اسکا والی ومتولی ہے۔

۷۔۔۔۔حدیث زیر شرح اور اسی طرح کی دوسری احادیث صحیحہ کا اطلاق زنادقہ وملاحدہ کی توبہ کی قبولیت پر دلیل ہے۔چنانچہ اگر وہ آئیں اور بظاہر توبہ کریں، تو ہم قبول کر لینگے اور انکے خون سے باز آجائینگے، اگرچہ انھوں نے باطن میں کفر چھپا رکھا ہو۔انکے باطنی احوال کو خدا کے سپرد کردینگے۔ اس مسئلے میں طیبی نے علماء کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔جن میں صحیح تر قول یہی ہے کہ ظاہری اسلام والے کی توبہ قبول کی جائیگی۔اور جو یہ کہتے ہیں کہ انکی توبہ مقبول نہیں، انکی مراد یہ ہے کہ ایسوں کو تو ہم ضرور قتل کردینگے۔اب اگر واقعۃً انکی توبہ صحیح تھی تو انہیں اسکا فائدہ آخرت میں ملے گا۔ان تمام اقوال میں اظہر یہ ہے کہ اگر کسی نے الحاد کیا اور فوراً ہی بہ طیب خاطر توبہ کرلیا، تو اسکی توبہ قبول کر لی جائے گی۔اور جس نے راہ سرکشی اختیار کی اور اپنے الحاد پر مصر رہا اور صرف جان بچانے کیلئے اور مدافعہ وقت کے پیش نظر توبہ کی، یہاں تک کہ قرائن بھی نشاندہی کررہے ہوں کہ یہ اپنی توبہ میں منافق ہے اور تلوار کے خوف سے توبہ کررہا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔اسکی توبہ وقت کی سنگینی کے پیش نظر ایک مدافعانہ چال ہے تو اسکی توبہ نہیں قبول کی جائیگی اور اسے بہر صورت قتل کردیا جائے گا۔اب اگر فی الواقعہ اسکی توبہ صحیح ہوگی تو آخرت میں اسے اسکا فائدہ حاصل ہوگا۔

۸۔۔۔۔زندیق سے ہر وہ ملحد مراد ہے جسکا کوئی دین نہیں اور جو آخرت، ربوبیت اور دین سبھی کا منکر ہو۔ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ باطنی کفر اور ظاہری اسلام والے کو زندیق کہتے ہیں، جیسے کہ منافق۔قاموس میں ہے کہ زندیق زن دین (عورت کا دین) کا معرب ہے اور دراصل یہ مجوسیوں میں سے ایک قوم کا نام ہے، جسے ثنویہ کہا جاتا ہے، جو دو خالق کو ماننے والے ہیں۔ایک خالق

انوار وخیرات، اور دوسرا خالق ظلمات وشرور۔ لفظ زندیق زند سے ماخوذ ہے۔ زند فارسی زبان کی ایک کتاب ہے جسکے مصنف کا نام زردشت ہے۔

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ لِغَرْضِ اَنْ یَّحْصُلَ هٰذِهِ الْمَعْنٰی
مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے لڑوں اس معنی کے حصول کی غرض سے

ا۔۔۔مذکورہ بالا دونوں عبارتوں میں 'اس معنی' سے 'شہادت کلمۂ طیبہ' مراد ہے۔ اگر مراد اوّل معانی ہے تو قتال اس وقت تک لازمی ہوگا، جب تک کہ 'شہادت مذکورہ'، حاصل نہ ہوجائے۔ اس صورت میں حدیث زیر شرح میں 'الناس' سے مراد عرب کے کفار ومشرکین ہونگے۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا، کہ مجھے حکم دیا گیا ہے میں عرب کے کافروں سے اس وقت تک لڑتا رہوں، جب تک کہ وہ ایمان قبول نہ کرلیں۔ اور سرزمین عرب سے کفر وشرک کا بالکلیہ خاتمہ نہ ہوجائے، خواہ اسطرح سے کہ سارے کافر مسلمان ہوجائیں یا سب قتل کردیئے جائیں۔ یہ مقصود حاصل بھی ہوچکا ہے۔

۔۔۔حضور کا ارشاد ہے: لَا یَجْتَمِعُ دِیْنَانِ فِیْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ
'جزیرۂ عرب میں دو دین کی گنجائش نہیں'

اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ دوسرے منکرین اسلام میں سے ہر ایک کو اختیار ہے کہ وہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے اور جسکی چاہے پوجا کرے۔ اس گمراہی سے نکالنے کیلئے صرف اسے نصیحت اور فہمائش کی جاسکتی ہے، لڑائی نہیں۔ لیکن مشرکین عرب کیلئے دو ہی راہیں تھیں۔ یا تو ایمان لائیں یا پھر جنگ قبول کریں اور قتل وقید وعبدیت سے دوچار ہوں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب وہ لوگ تھے جن پر توضیح حق براہِ راست نبی کے ذریعے ہوئی، جس میں نقص کا کوئی امکان نہ تھا۔ اسلئے انکا ایمان لانے پر آمادہ نہ ہونا معنی یہ رکھتا ہے کہ انکے اندر سے بصیرت اور قبول حق کی آخری رمق بھی ناپید ہوچکی ہے۔ اور ان پر آخری حد تک اتمام حجت ہوچکا ہے۔ اب انکا حال اس سڑے ہوئے عضو کا سا ہے جسکے شفایاب ہونیکا کوئی امکان نہیں بلکہ الٹا اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ دوسرے تندرست اعضاء کو بھی اپنے زہر سے متاثر کردے گا۔ ایسی حالت میں جسم انسانی کی سچی بہی خواہی یہی ہے کہ

اس سڑے عضو کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ دوسرے منکرین اسلام کا یہ حال نہیں، اسلئے انکا حکم بھی مشرکین عرب سے مختلف ہونا چاہئے۔

۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔اول معنی مراد لینے کی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ حدیث زیر شرح کے 'الناس' سے جملہ بلا دو امصار اور تمام دنیا کے کفار مراد لئے جائیں۔ اسلئے کہ اگر ایسا ہوتا، یعنی ساری دنیا کے کافروں سے قتال کا حکم دیدیا ہوتا اور اس وقت تک کیلئے جب تک انکا بالکلیہ استیصال نہ ہو جائے، تو اس قتال ماموربہ کے حصول کے ساتھ کہیں بھی کفر کا وجود نظر نہ آتا۔ اور اگر حدیث زیر شرح سے ثانی مراد ہے یعنی اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ لِغَرْضِ اَنْ يَّحْصُلَ هٰذَا الْمَعْنٰى تو اس تقدیر پر حدیث زیر بحث کے 'الناس' سے تمام دنیا کے کفر و مشرکین مراد ہو سکتے ہیں۔ اور حاصل ارشاد کو تمام عالم سے ازالہء کفر پر محمول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا۔ اسلئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو انسان کی غرض ہو وہ بروقت حاصل بھی ہو جائے۔ اس صورت میں حدیث شریف کا حاصل مطلب یہ ہوگا، کہ تمام عالم سے بالکلیہ ازالہء کفار و مشرکین کی غرض سے قتال کرو۔ بالفعل تمام عالم سے کفر کا زوال ہو یا نہ ہو، مگر غرض ازالہء کفر، تو متحقق و موجود رہی۔

حدیث زیر شرح سے اول معنی مراد ہوں یا ثانی، دونوں صورتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جہاد کا منشاء ملک گیری یا مال گیری نہیں۔ بلکہ ہدایت و ارشاد و اعلاء کلمۃ الحق ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ثانی معنی مراد لینے کی صورت میں وہ توجیہہ کرنی پڑیگی جو جواہر پارہ نمبر ا میں کی گئی ہے۔

۲۔۔۔۔خیال رہے کہ مشرکین عرب کیلئے حکم جزیہ نہیں، وہ یا تو ایمان لائیں یا قتل و قید و عبدیت اختیار کریں۔۔۔ ارشاد ربانی ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔۔۔ ﴿سورۃ البقرہ: ۱۹۳﴾

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے۔۔۔

۔۔۔عرب کے اہل کتاب اور عجم کے تمام کفار کیلئے ایمان یا جزیہ ورنہ قتل و قید، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ﴿سورۃ التوبۃ: ۲۹﴾

جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر

۔۔۔مرتد کیلئے اسلام یا قتل، ان کیلئے نہ جزیہ نہ قید۔۔ چنانچہ۔۔ ارشاد ربانی ہے:

تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴿سورۃ الفتح: ۱۶﴾

ان سے لڑو یا وہ مسلمان ہو جائیں

۔۔۔باغیوں کیلئے قتل یا بغاوت سے توبہ۔۔چنانچہ۔۔ارشاد ربانی ہے:

فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ ﴿سورۃ الحجرات:۹﴾

تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے

۳۔۔۔۔چونکہ اس زمانہ ءمبارکہ میں نئے فرقے نہ بنے تھے۔کلمہ، نماز وزکوٰۃ ایمان کی علامت تھی۔اسلئے فرمایا کہ جو یہ تین کام کرے، اسکا جان و مال محفوظ ہے۔اب بہت سے مرتد فرقے کلمہ، نماز، اور زکوٰۃ پر کاربند ہیں، مگر مرتد ہیں۔ان پر ارتداد کا جہاد ہوگا۔جیسے حضرت صدیق اکبر نے مسیلمہ کذاب کے معتقدین پر جہاد کیا۔اب بھی قادیانیوں وغیرہ مرتدین کا یہی حکم ہے۔

۴۔۔۔۔جواہر پارہ نمبر۴ میں بعض لوگوں کا جو قول پیش کیا گیا وہ میرے خیال ناقص میں کمزور ہے۔اسلئے کہ فرائض وواجبات کا ترک اور ہے اور انکا انکار ومنع اور ہے۔دونوں کے دو حکم ہیں۔حضرت صدیق اکبر نے تارکین زکوٰۃ سے نہیں، بلکہ مانعین ومنکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔اور یہ ظاہر ہے کہ جو نماز، زکوٰۃ وغیرہ فرائض کا منکر ہے یا اس سے روکنے والا ہے، وہ یقیناً کافر ہے۔اور اسکے ساتھ کفار جیسا ہی سلوک کیا جائے گا۔اب اگر وہ کلمہ کا اقرار کرتا ہے۔تو اسکا یہ اقرار صحیح نہیں۔لہٰذا وہ سرے سے کلمہ ہی کا منکر ہے۔غور کیجئے دن کے انکار کے ساتھ آفتاب کے وجود کا اقرار کہاں میل کھاتا ہے۔لہٰذا اس سلسلے میں جو بات جواہر پارہ نمبر۲ اور۳ میں کہی گئی ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

۔۔۔الحاصل۔۔۔نماز وزکوٰۃ کے تارکین کی گوشمالی تو کی جائیگی، مگر انہیں قتل نہیں کیا جائیگا۔۔۔ہاں۔۔۔جو اسکے منکرین ومانعین ہیں انہیں ضرور قتل کیا جائیگا۔اسلئے کہ انہیں اس صورت میں کلمہ کا منکر قرار دیا جائیگا۔کیونکہ فرائض اسلامیہ کا انکار یا ان سے روکنا، خود کلمہ شہادت کے انکار کو مستلزم ہے۔

۵۔۔۔۔**اُمِرْتُ**۔۔۔الخ: سرکار رسالت ﷺ نے حکم دینے والے کا ذکر نہیں فرمایا کہ آخر اس امر کا آمر کون ہے۔اسلئے حضور اکرم ﷺ آیہ ءرحمت کو حکم دینے والا خود آپ ﷺ کا پروردگار ہے۔یہ ایک واضح حقیقت ہے۔اب ارشاد کا حاصل یہ ہوا:

اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِالْوَحْیِ ۔۔۔۔میرے پروردگار نے مجھے وحی کے ذریعہ حکم دیا

۔۔۔۔اب خواہ وہ وحی خفی ہو یا جلی۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔رسول کریم ﷺ کا آمر وحاکم صرف خدائے عزوجل ہے۔باقی تمام موجودات، رسول عربی ﷺ کے مامور ومحکوم ہیں۔

۶۔۔۔**اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ**۔۔۔الخ: یعنی لوگوں سے مجاہدہ ومحاربہ یعنی جنگ کروں اور لڑوں۔

۷۔۔۔**حَتّٰی یَشْهَدُوْا**۔۔۔الخ: ایک روایت میں 'حتّٰی یقولوا' ہے۔دونوں کا حاصل ایک ہے۔

۸۔۔۔اکثر شارحین حدیث کا ارشاد ہے کہ حدیث زیرشرح میں 'الناس' سے مراد وہ مشرکین وبت پرست جواہل کتاب کے سواہیں۔اسلئے کہ اہل کتاب لا الہ الا اللہ، کہنے والے ہیں ۔۔۔المختصر۔۔۔ بت پرستوں کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ کارنہیں، کہ وہ یا تو جنگ قبول کریں یا جزیہ دینا۔
اس خیال کی تائید نسائی کی اس روایت سے ہوتی ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ الْمُشْرِكِيْنَ۔۔۔۔

مجھے مشرکین سے لڑنے کا حکم دیا گیا

شارحین کرام کی مذکورہ بالا تشریح اسی روایت سے مطابقت کھاسکتی ہے۔جس میں 'وَاَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ' کا فقرہ نہ ہو۔لیکن جس روایت میں یہ فقرہ موجود ہو۔۔۔مثلاً:خود یہی روایت زیرشرح جس میں 'اَنْ لَّااِلٰـهَ اِلَّااللّٰهُ' کےساتھ ساتھ 'وَاَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ' بھی موجود ہے،تواس روایت سے یہ تشریح میل نہیں کھاتی،اسلئے کہ اہل کتاب اگرچہ لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ کہتے ہیں مگر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نہیں کہتے۔
میں شارحین کرام کے حضور اپنا یہ معروضہ بھی پیش کروں گا کہ بت پرستوں کی دوقسمیں ہیں:
ایک جزیرۃ العرب کے بت پرست اور دوسرے عجمی بت پرست،ان دونوں سے متعلق دوحکم ہیں۔
عرب کے اہل کتاب اور عجم کے بت پرست،ان دونوں کا حکم ایک ہے کہ یہ یا تو ایمان لائیں یا جنگ کریں یا جزیہ دیں۔اسکے برخلاف عرب کے بت پرست کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے،تو ان کیلئے حکم جزیہ نہیں اور یہ جنگ کرنے پرمجبور ہیں۔اب اس جنگ کے نتیجے میں خواہ وہ قتل کردیئے جائیں یا قید وبندگی گزارنے پرمجبور ہوجائیں۔
لہٰذا ایسی صورت میں مناسب راہ یہی نظرآتی ہے کہ حدیث زیرشرح میں 'الناس' سے یا تو جزیرۃ العرب کے بت پرست مراد لے لئے جائیں ۔۔۔یا۔۔۔ ایک ایسا عام معنی مراد لیا جائے، جو تمام کفار ومشرکین عرب وعجم اوراہل کتاب کو شامل ہو۔اور پھراہل کتاب ومشرکین عجم کے حکم کو آیت جزیہ سے مخصوص کردیا جائے۔طیبی نے اسی دوسری روش کو اختیار کیا ہے۔اسی کو اولیٰ کہا گیا ہے۔
اسلئے کہ قتال کا امر مدینہ میں نازل کیا گیا ہےاورتمام مخالفین اسلام سے قتال کا حکم دیا گیا۔۔۔۔فائدہ نمبر۱میں اچھی طرح وضاحت کردی گئی ہے کہ کس صورت میں کیا مراد متعین ہوتی ہے۔
۹۔۔۔ابن صباغ نے کہا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے، توآپ ﷺ پر اولاً توحید وتبلیغ اورقرأت قرآن کو فرض کیا گیا۔

۔۔چنانچہ۔۔ارشاد ہوا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿سورۃ العلق:۱﴾

اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے پیدا کیا

۔۔۔۔پھر مکہ میں نماز فرض کی گئی۔اسکے بعد ہجرت کے دوسال بعد روزہ فرض کیا گیا۔یونہی ۵ھ یا ۶ھ میں حج فرض کر دیا گیا۔رہ گئی زکوٰۃ تو ایک قول کی بنیاد پر روزے کی فرضیت کے بعد اور دوسرے قول کی بنیاد پر اس سے پہلے فرض کی گئی۔ہاں جہاد کا اذن مکے میں نہیں دیا گیا بلکہ مدینے میں دیا گیا، وہ بھی اولاً اس طرح کا کہ اگر کوئی تم سے لڑے، تو تم اس سے لڑو۔خود سے آگے نہ بڑھو۔اسکے بعد پھر اسکی اجازت دی گئی، کہ اب ضرورتاً تم خود سے بھی آگے بڑھ کر جنگ کر سکتے ہو۔مگر حرم میں۔۔۔۔نیز ۔۔۔ان مہینوں میں جنگ نہیں کر سکتے، جنہیں اشہر حرم، قرار دیا گیا ہے اور جن میں جنگ کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔اسکے بعد اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا گیا اور اس بات کی اجازت دے دی گئی، کہ حرم میں اور اشہر حرم میں بھی ضرورتاً جنگ کر سکتے ہو۔

۱۰۔۔۔۔وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ۔۔۔الخ: یہاں نماز سے فرض نمازیں مراد ہیں۔اور ان کی اقامت سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان تمام شرائط وارکان کے ساتھ ادا کیا جائے جن پر سب کا اجماع ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ جن شرائط وارکان پر اجماع ہو چکا ہے، انکی ادائیگی پر ہر فقہ کا ماننے والا متفق و متحد ہوگا۔اور پھر فروعی اختلاف کا نفس اقامت صلوٰۃ پر اثر نہ پڑیگا۔

۱۱۔۔۔۔اس مقام پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایک ہے قتل اور ایک ہے مقاتلہ، دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔جان لے لینا یہ قتل کا لازمی نتیجہ ہے۔بخلاف مقاتلہ ومحاربہ (جنگ کرنے) کے، اسلئے کہ مقاتلہ کے نتیجے میں جہاں کسی کی جان جانے کا امکان ہے وہیں اسکے راہ راست پر آجانے کا بھی امکان ہے۔اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قتل کا بنیادی مقصد جان لے لینا ہے۔مگر مقاتلہ کا بنیادی مقصد راہ راست پر لانا ہے۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں بر بنائے انکار، تارکین صلوٰۃ سے مقاتلہ کا حکم ضرور ہے، تاکہ وہ اس ترک وانکار سے باز آجائیں اور راہِ راست پر آجائیں۔مگر یہ حکم نہیں ہے کہ کسی تارک صلوٰۃ کو قتل کر دیا جائے اور اسے راہ راست پر لانے کی جدوجہد نہ کی جائے۔بلکہ صراطِ مستقیم پر آنے کے راستے کو اس کیلئے مسدود کر دیا جائے اور سوچنے سمجھنے کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔راہ راست پر نہ آنے کی صورت میں بھی جان لے لینا مقاتلہ کا لازمی نتیجہ نہیں، اسلئے قید وبند وجزیہ وہ صلح و استیمان میں سے کوئی مقاتلہ کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ہاں مرتد وباغی اگر ارتداد وبغاوت سے توبہ نہیں کرتے اور راہِ راست پر نہیں آتے، تو پھر ان سے مقاتلہ انکے قتل ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

اس تشریح کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ بہرصورت اس حدیث زیرِشرح سے، تارک صلوٰۃ، کے قتل کا حکم نکلتا ہے، تو میں اس سے عرض کروں گا کہ جس طرح تارک صلوٰۃ کے قتل کا حکم نکلتا ہے اسی طرح، تارک زکوٰۃ، کے بھی قتل کا حکم نکلتا ہے۔ حالانکہ اسکا کوئی قائل نہیں۔ رہ گیا منکرین و مانعین صلوٰۃ و زکوٰۃ سے مقاتلہ، تو یہ تو ایک متفقہ مسئلہ ہے۔

۱۲۔۔۔**وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ**: زکوٰۃ صرف فرض ہی تو ہوتی ہے نفل وغیرہ نہیں۔ یہ حدیث مانعین و منکرین زکوٰۃ سے مقاتلہ کی دلیل ہے۔ اسی لئے حضرت صدیق اکبر نے ایسوں سے مقاتلہ کیا اور صحابہ کرام نے اس پر اجماع فرمایا۔۔۔ ایک قول کے مطابق اسکا معنی یہ ہے:

حَتّٰی يَقْبَلُوا فَرِضِيَّتَهُمَا۔۔۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی فرضیت کو تسلیم کرلیں

۔۔۔ اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شریف میں ذکر دو ہی کا کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے مراد وہ پانچوں فرائض ہیں جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔۔۔ المختصر۔۔۔ ان دو کو انکے سوا باقی عبادتوں کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔ اسلئے کہ یہ دونوں عبادت بدنیہ و مالیہ کی بنیاد و اساس ہیں اور ان میں کبیر الشان ہیں۔۔۔ قرآن کریم میں بکثرت ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چونکہ نفوس انسانیہ کو ان سے بار بار سابقہ پڑتا ہے، تو یہ نفوس کیلئے شدید آزمائش و امتحان کا سامان ہیں۔ نماز کے متعلق ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ۔۔۔ نماز دین کا ستون ہے

۔۔۔ زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اَلزَّكٰوةُ قِنْطَرَةُ الْاِسْلَامِ۔۔۔ زکوٰۃ اسلام کی بلند عمارت ہے

۔۔۔ اسی لئے ان دونوں کو ارکان اسلامیہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے اور ذکر میں ان کو مخصوص رکھا گیا ہے۔ انہی کے ذکر کو مخصوص کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ صوم و حج اس وقت فرض نہ کئے گئے ہوں، جس وقت کا یہ ارشاد ہے۔ جیسا کہ جواہر پارہ ۳ میں ظاہر کیا جاچکا ہے۔

۱۳۔۔۔**يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ**: اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ 'حَتّٰى يُسْلِمُوْا' یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوجائیں۔ بخاری کی ایک روایت بھی اسکی وضاحت کرتی ہے۔

۔۔۔ وہ روایت یہ ہے:

حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيُؤْمِنُوْا بِيْ وَبِمَا جِئْتُ بِهٖ

یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دیں اور مجھ پر اور جو کچھ میں لایا ہوں اس پر ایمان لائیں

۔۔۔ چونکہ اس ایک روایت میں واضح بیان آچکا تھا، لہٰذا روایت زیرِشرح میں اس تفصیل کی ضرورت

نہیں سمجھی گئی اور صرف دو ہی کے ذکر پر اکتفا کیا گیا اور وہ بھی اسلئے کہ چونکہ شہادتین جو اصل عبادت ہیں انکا ذکر ہو ہی چکا ہے، تو پھر صرف دو ہی عبادتوں کے ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۱۴۔۔۔۔تحقیق یہ ہے کہ شہادت سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ لوحِ قلب کی، شرک جلی وخفی اور تمام فاسد اور ردی نقوش سے تطہیر کرلی جائے اور اسے بخوبی معارف یقینیہ، حکمت ہائے الٰہیہ، اعتقاداتِ حقیہ، احوال ومعاد ومتعلقاتِ امور غیبیہ اور احوالِ اخرویہ سے آراستہ کرلیا جائے۔ اسلئے جو بھی اللہ پر اسکے تمام اسماء وصفات کے ساتھ ایمان لائے گا اور اسکے غیر سے الٰہیت والوہیت کی شان کی نفی کریگا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔رسول کریم ﷺ کی رسالت کی تصدیق سچائی اور امانت داری کے ساتھ کریگا، تو وہ یقیناً اپنے جملہ فرائض سے عہدہ برا ہوگا۔ اور تمام چیزوں پر ایمان لے آئے گا، جن پر ایمان لانا واجب ہے۔۔۔۔مثلاً: کتب الٰہیہ، رسل ومعاد وغیرہا۔

یہی سبب ہے کہ ان تمام امور کو شمار نہیں کرایا گیا جنکی شہادت ضروری ولازمی ہے۔ یونہی اقامت صلوٰۃ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ بدنی راحتوں سے دست کش ہوکر آلات جسدیہ اور اعضاء وجوارح کو مشقت کا عادی بنایا جائے اور چونکہ نماز 'ام العبادات' ہے، لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ سچا نمازی دوسری عبادات بدنیہ سے محروم رہے۔ نماز سبھی کیلئے مستعد کردیتی ہے۔ اسی لئے دوسری عبادات بدنیہ کے ذکر کی بھی حاجت نہ رہ گئی۔۔۔۔اور چونکہ:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ﴿سورۃ العنکبوت: ۴۵﴾

بے شک نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے

۔۔۔۔اسلئے اس بات کی بھی ضرورت نہ رہی کہ ترک سیئات کا بھی ذکر کردیا جائے۔ اسی طرح ایتاء زکوٰۃ کا مطلب یہی نہیں، کہ صرف زائد مال سے اعراض کرلیا جائے، بلکہ ایتاء زکوٰۃ کا فریضہ ہمیں وجود حقیقی کے ذریعہ ہر موجود وہمی سے اعراض سکھاتا ہے اور یہ درس دیتا ہے کہ اگر کوئی فتوح وفیضان کے ابواب کو کھولنا چاہے، تو وہ اپنے مال کو خرچ کرے، وہ مال جسے گویا روح کا ٹکڑا قرار دیا گیا ہے۔

۱۵۔۔۔۔الصلوۃ اور الزکوٰۃ: میں لام عہد کا ہے یا جنس کا۔ دونوں صورتوں میں صلوٰۃ وزکوٰۃ سے انکا فرد کامل یعنی مومنین کی نماز وزکوٰۃ مراد ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں ہی کی نماز وزکوٰۃ دراصل نماز وزکوٰۃ ہے، انکے سوا کی نماز وزکوٰۃ کا کوئی اعتبار نہیں۔

۱۶۔۔۔۔فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ: ذٰلِكَ سے مراد اَلْمَذْكُوْرَ مِنَ الشَّهَادَتَيْنِ وَالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ہے۔ (یعنی وہ ہے جسکا ذکر حدیث زیر شرح میں ہوچکا ہے۔ یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهِ اور مُحَمَّدٌ

رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادتیں اور نماز وزکوٰۃ)۔۔۔۔نماز وزکوٰۃ کا تعلق فعل وعمل سے ہے۔لیکن شہادت کا یہ حال نہیں۔شہادت قول ہے فعل نہیں۔بخلاف نماز وزکوٰۃ کے کہ وہ فعل ہیں قول نہیں۔پھر حدیث میں قول کو فعل کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اسکے دو جواب ہیں۔ایک تو یہ کہ ایسا تغلیباً کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ شہادت اگرچہ قول ہے مگر یہ قول بھی تو زبان کا عمل ہے۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔اس اعتبار سے اسے فعل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۷۔۔۔۔**عَصِمُوْا مِنِّیْ** :مجھ سے یعنی میری اتباع کرنیوالوں سے یا میری طرف سے اور میرے دین کی جہت سے۔

۱۸۔۔۔۔**دِمَآءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ** :حدیث شریف میں ذکر کردہ لفظ مقاتلہ سے انکے خون بہانے اور انکے مالوں کو غنیمت بنالینے کی جواباحت مفہوم ہوتی ہے، وہ اب نہ رہے گی۔اور انکا خون۔۔۔۔نیز۔۔۔۔انکے اموال محفوظ ومعصوم قرار دیئے جائینگے۔

۱۹۔۔۔۔**اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ** :یعنی جب وہ ایسا کرلینگے تو انکا خون بہانا یا انکے اموال کو مباح سمجھنا،تمام اسباب میں سے کسی سبب سے جائز نہ ہوگا،مگر حق اسلام کی ادائیگی کیلئے۔۔۔۔مثلاً: جان کے بدلے میں جان لینا،کسی حصہ بدن کے کاٹنے کی صورت میں حصہ بدن کا کاٹنا،غصب کردہ مال کے عوض مال لینا،چور کا ہاتھ کاٹنا،زانی پر رجم کرنا۔۔۔۔یا۔۔۔۔بصورت دیگر کوڑے لگانا،مال محترم کو ہلاک کردینے والے سے تعزیراً مال وصول کرنا وغیرہ۔ ﴿ذلك من الحقوق الاسلامیه﴾

۲۰۔۔۔۔ابن مالک کے نزدیک تقدیر عبارت یہ ہے:

عَصِمُوْا مِنِّی دِمَائَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا دِمَاءً وَّاَمْوَالًا مُلْتَبِسَةً بِحَقٍّ

تو وہ مجھ سے اپنے تمام جانوروں اور اپنے تمام مالوں کو بچالیں گے

سوا اس جان کے یا اس مال کے جو کسی حق (اسلامی) سے ملا ہوا ہو۔

۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔یہاں دماء اور اموال سے استثناء اور مستثنیٰ موصوف محذوف ہے۔

۲۱۔۔۔۔ **وَحِسَابُھُمْ**: یعنی انکا حساب ان امور میں جنہیں وہ چھپارہے ہیں یعنی کفر ومعاصی وغیرہا۔

۲۲۔۔۔۔**عَلَی اللّٰہِ** : حِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ کا جملہ مستانفہ بھی ہوسکتا ہے اور عَصِمُوْا مِنِّیْ۔۔۔الخ کا معطوف بھی۔اس پورے جملے کا حاصل معنی،یہ ہے کہ ہم تو ظاہر حال اور ایمان قولی ہی کو دیکھ کر اسلام وایمان کا حکم کردیں گے اور مسلمانوں جیسا اسکے ساتھ سلوک کریں گے اور اسکے ساتھ وہ

سلوک نہ کرینگے جسکے مستحق کفار ہیں اوراس سے ہمارا مواخذہ صرف حقوق اسلامیہ تک محدود رہے گا جیسا کہ اسکا ظاہر حال اسی بات کا مقتضی ومستدعی ہے، کہ اسکو اپنے ایمان میں مخلص ہی تصور کیا جائے۔ رہ گیا اسکے باطنی احوال کا حساب، تو اللہ اسکا علیم وخبیر ووالی ومتولی ہے، جو مخلص کو اجر عطا فرمائیگا، منافق کو سزا دے گا اور اپنے فسق پر مصر رہنے والوں کو سزا دے گا یا معاف فرمادے گا۔ یہ حدیث زیر شرح اس بات پر دلیل ہے کہ جس نے اسلام ظاہر کیا اور کفر چھپایا، تو ظاہر میں اسکے اسلام کو قبول کرلیا جائے گا۔۔۔الغرض ۔۔۔قتال وعصمت یہ دونوں دنیوی احکام سے ہیں۔ رہ گئے اخروی امور یعنی ثواب وعذاب اور انکی کیفیت وکمیت، تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف مفوض ہیں جن میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔

حضرت امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ زندیق (جو اچھی طرح سے کسی کفر کو کفر جانتے ہوئے اپنے اندر اس کفر کو چھپائے اور ظاہر میں اپنے کو اسلام والا دکھائے) ایسے کی توبہ نہیں قبول کی جائے گی۔ اسے بہر صورت قتل کردیا جائے گا۔ اب اگر بالفرض وہ اپنی توبہ میں صادق رہا، تو آخرت میں اسے اسکا نفع حاصل ہوگا۔ بعض علماء کا ارشاد ہے کہ ایسوں کی صرف ایک بار توبہ قبول کرلی جائے گی۔ بعض کا کہنا ہے کہ اگر وہ تلوار کے نیچے پہنچنے سے پہلے توبہ کرلے، تو اسکی توبہ قبول کرلی جائے گی۔ بعض اس بات کے قائل ہیں کہ اسکی وہ صفت جو گمراہی وضلالت کی طرف لیجانے کی داعی ومحرک بنی تھی، اگر توبہ کے وقت بالکلیہ فنا ہوگئی، تو اسکی توبہ قبول کرلی جائے گی۔۔۔اس سلسلے میں فیصلہ کن بات وہی ہے، کہ جسکا ذکر تفصیلاً حدیث زیر شرح کے تحت جواہر پارہ ۷ میں ہوچکا ہے۔

۲۳۔۔۔حِسَابُهُمْ: یہ خیال رہے کہ یہ حساب ومحاسبہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر عقلاً واجب نہیں، بلکہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس حساب کا وعدہ فرمایا ہے، لہٰذا یہ حساب اس پر شرعاً واجب ہے۔ یعنی خود رب تبارک وتعالیٰ نے اس حساب کو اپنے ذمہ عدل وکرم میں کرلیا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ اس حساب ومحاسبہ کیلئے عقلاً مجبور تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر واجب شرعی عفوودرگزر کے فقدان کی صورت میں نفس الامر میں وقوع وتحقیق کے لحاظ سے واجب عقلی ہی کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس میں فی نفسہ یہ امکان رہتا ہے کہ خود واجب فرمانے والے کا عفوودرگزر اسکے وقوع میں مانع ہوجائے، بخلاف واجب عقلی کے، اسلئے کہ اس وقوع میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے۔۔۔المختصر۔۔۔یہ حدیث زیر شرح معتزلہ، کیلئے حجت نہیں جنکا عقیدہ ہے کہ خدائے عزوجل پر یہ حساب ومحاسبہ عقلاً واجب ہے اور وہ اسکے بجالانے پر عقلاً مجبور ہے۔ ﴿نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ﴾

۲۴۔۔۔حساب مصدر ہے جسکا معنی ہے، 'شمار کرنا'۔ 'حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ'، کا یہ معنی ہے

کہ اللہ تعالیٰ انکو اس بات سے باخبر فرمادے گا کہ ان کیلئے کیا انعام ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔ان پر کیا عذاب ہونیوالا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔انکے اعمال کتنے ہیں اور ثواب وعذاب میں انکا کیا حصہ ہے۔ اسطرح کی ضروری باتوں کا علم اللہ تعالیٰ انکے قلوب میں تخلیق فرمادے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ مخلوقات سے حساب کی صورت یہی ہے کہ ساری مخلوق بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگی اور انکے ہاتھوں میں انکے نامہ ہائے اعمال دیئے جائینگے۔ پھر ارشاد فرمایا جائیگا کہ ہم نے معاف کردیا، پھر انکی نیکیاں انکے روبرو پیش کی جائینگی اور کہا جائیگا تمہارے لئے ہم نے انہیں دوگنا کردیا۔ چونکہ حساب مذکور انسان کے اس علم کے حصول کا سبب ہے کہ اسکے ساتھ اچھا یا برا کس طرح کا سلوک کیا جائیگا، اسی لئے اس علم مخصوص کا نام حساب رکھ دیا گیا۔

۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔یہ اطلاق 'اطلاق السبب علی المسبب' کے قبیل سے ہے۔ حِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزا یا سزا دے گا۔ چونکہ حساب ہی جزا وسزا اور اخذ وعطا کا سبب ہے اسی لئے جزا وسزا کو حساب کہہ دیا گیا۔۔۔۔ارشاد ربانی ہے:

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿سورۃ البقرہ:۲۰۲﴾

۔۔۔۔اس ارشاد میں سرعت الٰہیہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام ممکنات سے متعلق ہے اور وہ کسی شے کی احداث وتخلیق میں کسی غور وفکر اور مدت وعدت کا محتاج نہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

اِنَّهٗ يُحَاسِبُ الْخَلْقَ فِي مِقْدَارِ حَلْبَةِ شَاةٍ أَوْفِي لَمْحَةٍ

اللہ تعالیٰ خلق سے محاسبہ فرمائیگا اتنی ہی دیر میں جتنی دیر میں بکری کا

دودھ دوہ لیا جاتا ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ایک لمحہ میں ﴿مرقات﴾

۲۵۔۔۔۔مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ: یعنی جمیع حدیث مذکور کی روایت پر بخاری ومسلم متفق ہیں۔ سوا اسکے کہ امام مسلم کی روایت میں 'اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ' کا لفظ مذکور نہیں ہے، لیکن وہ بہر حال مراد ہے۔ اسی حدیث کی روایت نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔

۲۶۔۔۔۔حدیث زیر شرح اس ارشاد ربانی کے موافق ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴿سورۃ التوبۃ:۵﴾

پس اگر وہ (شہادتین کا اقرار کرکے کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انکے راستے کو چھوڑ دو (یعنی ان سے کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ وغیرہ نہ کرو)۔

۲۷۔۔۔۔جامع صغیر میں ہے کہ ایک جماعت نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث

کی روایت ان لفظوں میں کی ہے کہ:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَاِذَا قَالُوْهَا عَصِمُوْا مِنِّیْ دِمَاءُهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ

۔۔۔۔پس یہ حدیث، مذکورہ لفظ کے ساتھ متواتر معنوی ہے۔

۲۸۔۔۔۔جامع کبیر میں ہے کہ ابن جریر نے اور طبرانی نے اوسط میں اس حدیث کی ان لفظوں میں روایت کی ہے اور اسکی تحسین کی ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
فَاِذَا قَالُوْهَا عَصِمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا قِیْلَ وَمَا حَقُّهَا
قَالَ زَنَا بَعْدَ اِحْصَانٍ اَوْ کُفْرٌ بَعْدَ اِسْلَامٍ اَوْ قَتْلَ نَفْسٍ فَیُقْتَلُ بِهَا

میں مامور کیا گیا ہوں کہ لوگوں سے مقاتلہ کروں (یعنی جنگ کروں) یہاں تک کہ وہ شہادت دینے لگیں کہ بے شک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس جب وہ کہہ لیں گے تو ہم سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچالینگے، سوا اس کلمۂ طیبہ کے حق کے۔ عرض کیا گیا اسکا حق کیا ہے۔
جواباً ارشاد ہوا کہ شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کرنا، اسلام لانے کے بعد کفر کرنا،
اور کسی نفس کو قتل کر دینا، یہ وہ امور ہیں جن کو انجام دینے والے
پر کلمۂ طیبہ کا حق یہ ہے، کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

۲۹۔۔۔۔حدیث زیر شرح سے دو باتیں واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔شہادتین کا اقرار صحت اسلام اور ترتب احکام کیلئے شرط ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔وہ اہل بدعت جو اہل قبلہ سے ہیں اور شہادتین کا اقرار کرنے والے ہیں۔۔۔۔ نیز۔۔۔شریعت اسلامیہ سے چمٹے ہوئے ہیں، انکی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا یہ حدیث فرقہ مرجیہ کے اس خیال کا بلیغ رد فرما رہی ہے، کہ ایمان کو اعمال کی قطعی ضرورت نہیں۔
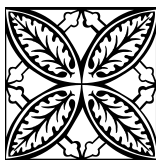
عَنْ اَنَسٍ اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا
فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِىْ لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ
فَلَا تُخْفِرُوْا اللّٰهَ فِىْ ذِمَّتِهٖ. ﴿رواہ البخاری﴾

حضرت انس سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبح کئے ہوئے جانوروں کو کھائے، وہ مسلمان ہے، جو خدا اور خدا کے رسول کے عہد و امان میں ہے، تو تم خدا کے عہد کو نہ توڑو (یعنی اس شخص کو تکلیف نہ دو، کہ اس سے خدا کا عہد ٹوٹ جائے گا)۔

جواہر پارے

۱۔۔۔مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا۔۔۔الخ: صرف انہی تین امور کا ذکر کیا گیا ہے۔اسکے سوا اسلام اور دوسرے ارکان اسلام۔۔۔مثلاً: شہادتین وغیر ہا کا ذکر نہیں کیا گیا، اسلئے کہ یہ تینوں ان علامات صحیحہ میں سے ہیں، جوانکے حاملین کے اسلام پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں اور مسلم کو غیر مسلم سے ممتاز کردیتی ہیں، اسلئے کہ جو مسلمانوں کی طرح نماز پڑھے گا، اسکا یہ عمل دلالت کرے گا کہ وہ رسول عربی ﷺ کی رسالت ونبوت پر ایمان لا چکا ہے اور جو کچھ رسول کریم ﷺ بارگاہ خداوندی سے لے کر آئے ہیں، ان سب کو مان چکا ہے۔اب رہ گیا استقبال قبلہ، تو بظاہر اسکے ذکر کی ضرورت نہ تھی، اسلئے کہ یہ تو خود نماز کیلئے شرط ہے، مگر چونکہ کعبہ کا مسلمانوں ہی کا قبلہ ہونا کافی معروف ومشہور ہے اور یہ مسلمانوں ہی کی نماز کا قبلہ ہے، تو اسکی اسی شہرت اور اسی اختصاص کے سبب علامات میں اس کو شمار کر دیا گیا ہے۔بخلاف قیام وقرأت کے۔اسلئے کہ قیام وقرأت وغیر ہا کے ذریعہ عبادت، مسلمانوں کے مخصوصات سے نہیں۔یہی استقبال قبلہ والا حال ہے مسلمانوں کے ذبیحہ کا، کہ اسے صرف مسلمان ہی کھاتے ہیں۔یہودی وغیرہ نہیں کھاتے۔

۲۔۔۔ذِمَّۃُ اللّٰہِ: الذمة والذمام بالكسر کا معنی ہے اماں، عہد، ذمہ داری وکفالت، حرمت اور حق اسی سے اهل الذمة، یعنی مسلمانوں کے عہد وامان میں داخل ہونے والا۔

۳۔۔۔فَلَا تُخْفِرُوااللّٰہَ :'بضم التاء وسكون الخاء وكسرة الفاء على صيغة المضارع'۔خَفر وخُفرة سے یہ مشتق ہے، باب افعال کا صیغہ ہے۔خَفر وخُفرة کا معنی عہد وامان کے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

مَنْ صَلَّی الصُّبْحَ فَھُوَ فِیْ خُفْرَۃِ اللّٰہِ اَیْ ذِمَّتِہٖ

جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کی امان میں ہے

۔۔۔حدیث میں ہے:

اَلدُّ مُوْعُ خُفَرُ الْعُیُوْنِ

آنسو آنکھوں کی پناہ ہیں

۔۔۔۔اس حدیث میں خفر، خفرۃ کی جمع ہے۔حدیث کا معنی یہ ہے:

اَلدُّمُوْعُ الَّتِیْ تَجْرِیْ خَوْفًا مِّنَ اللّٰہِ تُخْفُو الْعُیُوْنَ مِنَ النَّارِ

وہ آنسو جو خدا کے خوف میں جاری ہوں، وہ آنکھوں کو جہنم سے بچاتے ہیں

۔۔۔۔کہا جاتا ہے کہ خفرہ بمعنی اجارہ (اسکو پناہ دی) فھو خفیر۔۔۔پس وہ پناہ یافتہ ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔یونہی کہا جاتا ہے:

خَفَّرَہٗ مِنَ التَّخْفِیْرِ وَاَخْفَرَہٗ بمعنی جَعَلَہٗ خَفِیْراً

اسے پناہ یافتہ بنایا یعنی اسے امن دیدیا

۔۔۔۔اور کبھی ہمزہ سلب ماخذ کیلئے آتا ہے۔۔۔۔مثلاً: کہا جاتا ہے:

اَخْفَرْتُہٗ بمعنی غَادَرْتُہٗ وَنَقَضْتُ عَھْدَہٗ

ہم نے فلاں کے عہد و پیماں کو توڑ دیا

۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں یہی آخری معنی مراد ہے:

۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰہَ کا معنی مراد یہ ہوا کہ:

لَاتَغْدِرُوْہُ فِیْ عَھْدِہٖ وَلَا تَعَامَلُوْہُ مُعَامَلَۃَ الْغَادِرِ فِیْ نَقْضِ عَھْدِہٖ

اللہ کے عہد و پیمان کو نہ توڑو اور اس سے عہد شکنی کر کے اسکے ساتھ
وہ معاملہ نہ رکھو، جو ایک خائن اور عہد شکن کا معاملہ ہوتا ہے۔

فوائد

ا۔۔۔۔خیال رہے کہ مومن کی علامات مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں۔اس لحاظ سے انکے متعلق مختلف احادیث وارد ہوئیں۔ایک وقت صرف کلمہ پڑھنا مومن کی علامت تھی۔نماز وغیرہ کوئی احکام نہ آئے تھے،تب ارشاد ہوا:

مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ

جس نے کلمہ پڑھ لیا جنتی ہو گیا

۔۔۔۔پھر وہ وقت آیا جب نماز وغیرہ بھی آگئی، توارشاد ہوا جو یہاں مذکور ہے۔ مدینہ منورہ میں منافقین بھی تھے، جو کلمہ، نماز وغیرہ ادا کرتے ہوئے بھی بے ایمان رہے۔ تب اللہ ورسول ﷺ کی محبت علامت ایمان قرار پائی، اور ارشاد ہوا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی اَکُوْنَ۔۔۔الخ

آئندہ کے متعلق خبر دی گئی کہ آخر زمانہ میں ایک قوم ہوگی جو تم سے زیادہ عابد وزاہد ہونگے،

مگر اسلام سے خارج ہونگے۔ غرضیکہ جیسے حالات ویسے علامات۔ ﴿مرات﴾

۲۔۔۔۔مومن اللہ ورسول کی امان میں ہے، اسے نہ ستاؤ ورنہ اللہ ورسول کے خائن ٹھہرو گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی پناہ لینا اور ذمہ لینا، آپ کو اپنی پناہ وامان تصور کرنا شرک نہیں، بلکہ ایمان کا رکن ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ متقی مسلمان کو ستانا فاسق کو ستانے سے زیادہ برا ہے، کہ اس میں ظلم بھی ہے اور اللہ ورسول ﷺ کی خیانت بھی۔

۳۔۔۔۔مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ جو قومیں مذہب واصول کی روشنی میں ذبیحے کے بغیر کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتیں، وہ بھی مسلمانوں کے ذبیحے کو کھانا اپنے لئے درست نہیں سمجھتیں۔ رہ گئیں وہ قومیں جنکے نزدیک ذبیحہ کوئی ضروری چیز نہیں، اس مقام پر وہ خارج از بحث ہیں۔

۴۔۔۔۔**عَنْ اَنَسٍ اَنَّہٗ قَالَ:** اَنَّہٗ کا لفظ ان تمام نسخوں میں موجود ہے جنکی تصحیح کی جا چکی ہے۔

۵۔۔۔۔**مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا:** مَنْ صَلّٰی کَمَا نُصَلِّیْ یعنی جو اسطرح نماز پڑھے جس طرح ہم (مسلمان) نماز پڑھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسی موحد سے ممکن ہے جو رسالت محمدیہ ﷺ کا معترف ہو چکا ہے اور یہ اعتراف، جمیع عقائد واحکام اسلامیہ، کے اعتراف کو مستلزم ہے۔ اسی لئے نماز کو اسلام کی علامت قرار دے دیا گیا۔ شہادتین کے ذکر نہ کرنے کی ایک وجہ تو وہ ہے، جسکا ذکر جواہر پارے کے ضمن میں ہو چکا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ شہادتین تو خود ہی نماز میں حقیقتاً یا حکماً داخل ہیں۔

۶۔۔۔۔**اَسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا:** ہماری نماز میں بعض ایسے ارکان ہیں جو دوسروں کی نماز میں بھی موجود ہیں، مگر استقبال قبلہ ہمارے ہی ساتھ مخصوص ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔اسکی شہرت کا عالم یہ ہے

کہ جونماز کا طریقہ بھی نہیں جانتا وہ بھی اپنے قبلہ کو خوب پہچانتا ہے۔نماز چونکہ دین کا ستون ہے اسلئے اسکے ذکر کے بعد زکوٰۃ وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس قول کو ارشاد فرمانے کے وقت، دوسرے فرائض کا وجود نہ ہوا ہو۔

۷۔۔۔۔**وَاَ کَلَ ذَبِیْحَتَنَا** : اولاً اس چیز کا ذکر کیا گیا جو مومنین کی عبادت کو غیروں کی عبادت سے ممتاز کردے۔اسکے بعد اس چیز کو ذکر کیا جو مومنین کی عبادت وعادت دونوں کو غیروں کی عبادت وعادت سے ممتاز کردے۔اسلئے کہ ذبائح کو کھانے سے توقف، جس طرح کی عبادات میں سے ہے، اسی طرح ان عادات میں سے ہے، جنکا ثبوت گزشتہ ملتوں میں ملتا ہے۔

۸۔۔۔۔**اَلْذَ بِیْحَةَ** : فعلی ۃ کے وزن پر مفعوله کے معنی میں ہے اور اس میں 'تاء' جنس کیلئے جیسا کہ الشاۃ (بکری) کی تاء۔

۹۔۔۔۔**فَذٰلِكَ**: اَیْ مِنْ جَمِیْعِ هٰذِهِ الاَوْصَافِ الثَّلٰثَةِ یعنی جن میں یہ تین صفتیں جمع ہوں۔ذٰلک مبتداء ہے، المسلم ،اسکی خبر ہے۔۔۔یا۔۔۔المسلم، ذلك کی صفت ہے۔موصوف اپنی صفت سے مل کر مبتداء جسکی خبر الذی له ذمة الله ۔۔۔الخ ہے۔

۱۰۔۔۔۔**اَلَّذِیْ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ** :یعنی وبال کفار کیلئے شروع ہو چکے ہیں۔۔۔۔مثلاً قتل وقتال وغیرہ۔اللہ ورسول ﷺ نے ان تمام سے مسلمانوں کو امان دیدی ہے۔

۱۱۔۔۔۔اللہ ورسول ﷺ دونوں سے پہلے لفظ ذمہ استعمال فرمایا گیا، تاکہ یہ ظاہر ہوجائے کہ خدا اور رسول ﷺ دونوں کی امان وپناہ مومنین کا مقصود ومطلوب ہے۔خدا کی امان اصل ہے۔رسول کی امان اسکی فرع۔۔۔۔نیز۔۔۔۔دونوں میں سے ہرایک، ایک دوسرے کو لازم ہے۔اسی تلازم کے سبب فَلَا تُخْفِرُوْا اللّٰهَ فِیْ ذِمَّتِهٖ میں صرف خدا کے عہد وامان کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۲۔۔۔۔**رواہ البخاری**: ابوداود، ترمذی اور نسائی نے بھی اس معنی میں روایت کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَتٰی اِعرَابِیٌّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَالَ تَعْبُدُاللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا وَّتُقِیْمُ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوبَةَ وَتُؤَدِّی الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَ تَصُوْمُ رَمَضَانَ قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا اَزِیْدُ عَلٰی هٰذَا شَیْئًا وَّلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی هٰذَا. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْه﴾

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ بارگاہِ نبوت میں ایک دیہاتی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، آپ مجھے ایسے کام کی ہدایت فرمایئے کہ میں کروں تو جنتی ہوجاؤں۔ سرکارِ رسالت نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کو پوجو، اسکا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز قائم کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو۔ وہ بولے قسم ہے اسکی جسکے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کبھی اس پر نہ کچھ بڑھاؤں گا اور نہ اس سے کچھ گھٹاؤں گا۔ پھر جب وہ واپس ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا، کہ جو کسی جنتی مرد کو دیکھنا چاہے وہ اسے دیکھ لے۔ ﴿بخاری مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔اَتٰی اِعْرَابِیٌّ: جزیرۃ العرب کے شہریوں کو العرب کہا جاتا ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ العرب کا اطلاق ملک عرب کے شہریوں اور غیر شہریوں دونوں کیلئے عام ہے۔لیکن اعراب کا اطلاق صرف عرب کے بادیہ نشینوں اور دیہاتیوں ہی پر ہوتا ہے۔لفظ اعراب کا کوئی واحد نہیں۔عرب و اعراب سے متعلق قاموس میں یہی کہا گیا ہے۔مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اعراب دیہاتیوں کو کہتے ہیں خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی۔

۲۔۔۔تَعْبُدُ اللّٰہَ۔۔۔الخ: چونکہ شہادت کا اسلام کا رکن اول ہونا مشہور ومعروف امر تھا اسلئے اسکے ذکر کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔لَاتُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا خود اسکو متضمن ہے ۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔سوال ان امور کی دریافت سے متعلق تھا جنکا نمبر شہادت کے بعد آتا ہے۔

۳۔۔۔لَاتُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا: اشراک سے مراد عبادت اصنام ہے۔۔۔یا۔۔۔ریا ہے۔پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ صرف خدا کو پوجو،اسکے سوا بت وغیرہ کو نہ پوجو۔اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ خدا کی عبادت کرو مگر پرخلوص عبادت کرو،دکھانے والی عبادت اور ریا سے بچو۔

۴۔۔۔لَااَزِیْدُ عَلٰی ھٰذَا شَیْئًا۔۔۔الخ: اس پر ایک سوال حاشیہء خیال سے سر ابھارتا ہے،کہ حدیث زیر شرح میں واجبات ومنہیات اور سنن ومندوبات کا ذکر نہیں فرمایا گیا ہے تو پھر لا ازید کا قول کیسے صحیح ہوگا۔؟اس سوال کے مندرجہ ذیل جوابات دیئے گئے ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔سائل کا سوال صرف فرائض سے متعلق تھا اور ممکن ہے کہ سوال کے وقت فرائض کی تعداد یہی رہی ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔لَااَزِیْدُ اور لَااَنْقُصُ سے سائل کی مراد یہ ہوسکتی ہے کہ میں نہ نوافل کو بڑھاؤں گا اور نہ فرائض میں کمی کروں گا۔اور ظاہر ہے کہ جسکا یہ حال ہے،وہ بلاشبہ ناجی ہے۔اگرچہ ترک سنن سے وہ گنہگار ہوگا اور ترک نوافل وخیرات سے مراتب درجات سے محروم رہے گا۔

﴿۳﴾۔۔۔ممکن ہے کہ نوافل وسنن کی مشروعیت سے پہلے کا یہ ارشاد ہو۔

﴿۴﴾۔۔۔ممکن ہے کہ سائل کی مراد یہ ہو کہ حد مشروع پر نہ زیادتی کروں گا اور نہ اس میں کوئی کمی۔۔۔مثلاً:دو رکعت والی نماز میں چار رکعت بڑھانا۔۔۔یا۔۔۔چار رکعت والی نماز میں دو رکعت

پراکتفاء کرنا۔اس طرح کے امور سے میں باز رہوں گا۔

﴿۵﴾۔۔۔اس حدیث میں مختلف روایتیں ملتی ہیں۔بعض میں بعض ان واجبات کا ذکر ملتا ہے جنکا ذکر دوسری روایت میں نہیں۔ یہ فرق راویوں کے احوال کے فرق کی نشاندہی کرتا ہے۔حفظ و ضبط میں جو راوی جتنا ممتاز تھا اس نے اسی قدر مفصل روایت پیش کی۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔روایت کے وقت حدیث کے جس حصے میں راوی کا استشہاد متعلق تھا وہ اسی قدر تھا۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔مقتضائے وقت کے پیش نظر پوری حدیث روایت کرنی راوی کا مقصود و مطلوب نہ تھا۔صرف اسی حصے کا بیان کر دینا مقصود تھا، جسکا تعلق اسکے استشہاد سے تھا۔اور یہ ظاہر ہے کہ روایت میں ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہےاور بخاری کی اسی حدیث کی ایک روایت میں زیادتی آئی ہےجسکے الفاظ یہ ہیں:

فَاَخْبَرَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَرَائِعِ الْاِسْلَامِ فَاَدْبَرَالرَّجُلُ وَهُوَيَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَااَزِيْدُ وَلَااَنْقُصُ مِمَّا فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيَّ شَيْئاً ﴿لمعات﴾

پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں شرائع اسلام (تمام شریعت اسلامیہ) سے باخبر کر دیا تو وہ کہتے ہوئے واپس ہو گئے، کہ خدا کی قسم میں ان میں کچھ کی زیادتی نہ کروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ضروری ٹھہرا دیا ہے۔

اس صورت میں اب یہاں کسی اشکال کا سوال نہیں رہ جاتا۔غور کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ روایت زیر شرح سے بھی مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے۔اسلئے اس میں اولاً فرمایا گیا کہ تعبد اللہ (اللہ کی عبادت کرو) اور ظاہر ہے کہ عبادت کا اطلاق ایک وسیع ترین مفہوم پر ہوتا ہے۔ جملہ عبادات، مفروضہ عبادات واجبہ، عبادات موکدہ، عبادات غیر موکدہ، عبادات مستحبہ اور عبادات نافلہ وغیرہا ساری عبادتیں، عبادت ہی کے دائرے میں آتی ہیں۔اب اس عموم کے بعد مقتضائے حال کے پیش نظر اگر چند فرائض کا ذکر خصوصی طور پر کر دیا گیا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب دوسری عبادتیں مقصود و مطلوب نہ رہ گئیں۔

۶۔۔۔۔یہ بھی ممکن ہے کہ سائل کے کلام کا منشاء یہ ہو کہ آپنے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اسکی فرضیت کی مزید تحقیق کیلئے کسی سے سوال نہ کرونگا اور اسکی تصدیق وقبول میں اپنی طرف سے ذرہ برابر کمی نہ کرونگا۔

۷۔۔۔۔یہ بھی ممکن ہے کہ سائل کہیں کا قاصد وایلچی ہو اور اسکے کلام کا منشاء یہ ہو کہ آپنے جو کچھ ارشاد فرمایا اسے میں اپنی قوم تک بلا کم وبیش پہنچا دونگا۔اس ابلاغ وترسیل میں کمی کرونگا نہ زیادتی۔

۸۔۔۔۔سائل کے کلام کا جو ظاہری معنی ہے، ممکن ہے کہ وہ سائل کی مراد نہ ہو، بلکہ وہ اپنے کلام سے کنایۃً ارشاد رسول ﷺ کے ضبط واخذ میں اپنی شدت ومبالغہ اور شارع علیہ السلام کے فرمودات

و ماموارت کے مہتم بالشان ہونے کی نشاندہی کرنا چاہتے ہوں۔اس صورت میں حقیقت کلام مراد نہ ہوگی ،اور پھر یہ کلام نوافل وواجبات کی انجام دہی کے منافی نہ ہوگا۔

فوائد

۱۔۔۔اَتٰی اَلنَّبِیَّ :اَیْ جَاءَہٗ (آپ ﷺ کے پاس آئے) ایک روایت میں ہے اَتٰی اِلَی النَّبِیِّ۔۔اسکا بھی معنی وہی ہے۔

۲۔۔۔دُلَّنِیْ: بِضَمِّ الدَّالِ وَفَتْحِ اللَّامِ المُشَدَّدَۃِ، دلالت سے ہے۔اسکا معنی ہے 'ارشدنی' (میری رہنمائی کیجئے)۔

۳۔۔۔عَلٰی عَمَلٍ :عمل موصوف ہے،اسکی صفت ہے اِذَاعَمِلْتُہٗ۔۔الخ۔دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ۔ بظاہر یہی بات قرین قیاس نظر آتی ہے کہ یہاں دخول سے مراد دخول اول ہے، یعنی کسی طرح کے عذاب سے دوچار ہوئے بغیر۔اگرچہ جواہر پارہ نمبر۴ کی توجیہ نمبر۱۲ سکے مناسب نہیں۔

۴۔۔۔قَالَ تَعْبُدُ اللّٰہَ : یہ خبر ہے معنی میں امر کے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔اس سے پہلے اَن مقدر ہے اور یہ تاویل میں مصدر کے ہے۔جب اَن کو حذف کردیا تو فعل کو رفع کردیا،نصب کے اثر کو باقی رکھتے ہوئے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔اَن کی تقدیر کے ساتھ ساتھ فعل کو ذکر کیا اور اس سے معنی حدوثی مراد لیکر اسکو مصدر کی منزل میں پہنچادیا،اسلئے اسکو رفع دیدیا جیسا کہ:

تَسْمَعُ بِالْمُعِیْدِیْ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَرَاہُ۔۔۔معیدی کوسننا اسے دیکھنے سے بہتر ہے

۔۔۔اور ارشاد ربانی: وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ ﴿الروم:۲۴﴾۔۔۔اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تمہیں برق دکھانا

۔۔۔وغیرہا امثال میں ہے۔۔۔۔حدیث زیر شرح ہے تعبد۔۔۔الخ۔مرفوع المحل ہے خبریت کی بنا پر اسکا مبتدا محذوف ہے۔عبارت کا حاصل یہ ہوگا:

اَلْعَمَلُ الَّذِیْ اِذَا عَمِلْتُہٗ دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ ھُوَعِبَادَۃُ اللّٰہِ۔۔۔الخ

وہ عمل کہ جسکو کروتو جنتی ہوجاؤ، وہ اللہ کی عبادت ہے۔۔۔الخ۔

۔۔۔حدیث زیر شرح میں عبادت سے کیا مراد ہے؟

تو اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہاں عبادت سے مراد توحید ہے۔اسلئے کہ عطف کی اصل معطوف علیہ کے مابین مغایرت ہے، یہ توحید نبوت کو بھی شامل ہے۔اسلئے کہ اسکے بغیر اسکا کوئی اعتبار نہیں۔یہ

ناممکن ہے کہ نبوت کی تصدیق نہ ہو اور توحید اسلامی ہاتھ آجائے۔ پس توحید اسلامی کے ذکر کے بعد نبوت کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ سائل اہل ایمان سے تھا، اسلئے توحید کا ذکر عقیدۂ توحید کے شرف اور اسکے اصل الاصول ہونے کے اظہار کیلئے تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت سے مراد ایک مفہوم عام ہو اور یہ عطف، 'عطف الخاص علی العام' کے باب سے ہو۔

۵۔۔۔۔لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا : اَىْ مِنَ الاشْيَاءِ یعنی اشیاء میں سے کسی شئے کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ۔۔۔۔ یا یہ کہ۔۔۔۔لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا مِّنَ الشِّرْكِ جَلِيًّا اور خَفِيًّا ، یعنی اللہ کے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کرو، نہ خفی نہ جلی۔

پہلی صورت میں فقرہ زیر شرح تعبد اللہ کی تاکید ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ عبادت اس وقت تک کامل نہیں، جب تک کہ شائبۂ ریا سے بھی پاک وصاف نہ ہو اور ان کفار کا رد بھی ہو جاتا ہے، جو یہ گمان کرتے ہیں کہ غیر خدا کی عبادت سے وہ خدا کے قریب ہو جائیں گے۔۔۔۔ ارشاد ربانی ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ﴿سورۃ الکہف:۱۱۰﴾

توجو اپنے رب کی لقاء کا امیدوار ہو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

۔۔۔۔ولا تشرك به۔۔۔الخ۔ یہ جملہ حالیہ ہے، یعنی تو اللہ کو پوجے درآنحالیکہ تو مشرک نہ ہو۔۔۔۔

المختصر۔۔۔۔ولا تشرك۔۔۔الخ۔ غیر مشرک کے معنی میں جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ فقرہ سابقہ میں عبادت سے مراد توحید ہی ہے۔

۶۔۔۔۔عارفین کرام کا ارشاد ہے کہ تعبد اگر ثواب حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے کی غرض سے کیا جائے، اسکا نام عبادت ہے اور یہ سب سے نچلا درجہ ہے، اسلئے کہ اسکا معبود درحقیقت وہی ہے جو اسکا مطلوب ہے۔ اس سلسلے میں امام فخر الدین رازی نے متکلمین کا اجماع نقل کیا ہے:

'ایسے کی عبادت صحیح نہیں یعنی ذریعہ تقرب الٰہی نہیں'

۔۔۔۔اور اگر تعبد کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی طرف انتساب اور اسکی اطاعت شعاری کا شرف حاصل ہو جائے تو اسے معبودیت کہتے ہیں، اسکا درجہ پہلے سے اونچا ہے۔ مگر بایں ہمہ یہ خالصۃً لوجہ اللہ نہیں۔ ہاں اگر تعبد کا منشاء صرف خدا کی رضا و خوشنودی ہے اور اسکے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں، تو اسکو عبودۃ کہتے ہیں، جو اعلیٰ مقامات اور ارفع حالات سے ہے۔

۷۔۔۔۔اَلصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ : صلوٰۃ کے ساتھ مکتوبہ اور زکوٰۃ کے ساتھ مفروضہ کی قید

محض تفنن کے طور پر ہے۔۔۔نیز۔۔۔صلوٰۃ کے ساتھ مکتوبہ کی قید احترازی ہے اور زکوٰۃ کے ساتھ مفروضہ کی قید محض تاکیدی ہے۔ اسلئے کہ صلوٰۃ مفروضہ وغیر مفروضہ دونوں ہوتی ہے۔ مگر زکوٰۃ تو مفروضہ ہی ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کے ساتھ مفروضہ کی قید سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ ذہن اسکے شرعی معنی ہی کی طرف متوجہ ہوگا اور اس بات کا وہم بھی نہ ہوگا کہ یہاں زکوٰۃ سے لغوی زکوٰۃ یعنی مطلق صدقہ مراد ہے۔

۸۔۔۔**وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ**: اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلاضرورت بھی سچی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

۹۔۔۔**لَااَزِیْدُ**۔۔۔الخ: اس روایت زیرِ شرح میں صوم وحج کا ذکر نہیں۔ ایک روایت میں ایمان کا ذکر نہیں اور بعض روایات میں صلہ رحم کا ذکر ہے۔۔۔نیز۔۔۔بعض میں اداءِ خمس کا تذکرہ ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر جواہر پارہ نمبر۴ توجیہ نمبر۵ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ اس مقام پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سنن ونوافل وغیرہا فرائض پر زیادتی نہیں، بلکہ انہیں درجہء کمال پر پہنچانے والی ہیں۔۔۔نیز۔۔۔نماز فواحشات ومنکرات سے روکنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔۔۔المختصر۔۔۔حدیث شریف میں جن امور کا ذکر ہے وہ اپنے متعلقات ومناسبات کے ساتھ تمام شریعت اسلامیہ کو حاوی ہیں۔

۱۰۔۔۔**مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّنْظُرَ**۔۔۔الخ: یعنی جس کسی کو جنتی مرد کا دیکھنا خوشی ومسرت سے مالامال کردے، اسے چاہئے کہ وہ اس مرد کو دیکھے جو ماموارت کے کرنے اور محذورات کو چھوڑنے کا کیسا پاکیزہ عزم رکھتا ہے، تو ہر اس شخص پر لازم ہے کہ جو اسکی طرح جنتیوں میں شامل ہونا چاہتا ہے کہ وہ وہی عزم کرلے جو اس مرد نے کیا ہے، تاکہ وہ بھی نجات پانے والوں میں سے ہوجائے۔۔۔الغرض۔۔۔ارشاد رسالت کا منشاء صرف ایک جنتی مرد کو دکھانا ہی نہیں تھا، بلکہ حاضرین کو یہ سمجھانا بھی تھا کہ راہ نجات کیا ہے۔ اس حدیث سے دو مسئلے اور بھی واضح ہوتے ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔صالحین کی زیارت مومنین کی فرحت وسرور کا باعث اور وجہ اجر وثواب ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔رسول کریم ﷺ کو ہر ایک کے انجام، نیک بختی وبدبختی کا علم عطا فرمایا گیا ہے۔ جبھی تو آپ نے یقین واذعان کی روشنی میں اعرابی کے جنتی ہونے کا فیصلہ فرمادیا اور واضح کردیا کہ انکا خاتمہ ایمان وتقویٰ پر ہوگا۔

۱۱۔۔۔اس بات کا بھی احتمال ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرد جنسی کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اس صورت میں ارشاد گرامی کا معنی یہ ہوگا کہ:

'جو کوئی کسی جنتی مرد کو دیکھنا چاہے وہ اس جیسے مرد کو دیکھ لے'

۔۔۔مگر اظہر یہی ہے کہ اس مقام پر فرد شخصی ہی کی طرف اشارہ ہے۔

عَنْ سُفْیَانَ ابْنِ عَبْدِاللّٰہِ الثَّقَفِیِّ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قُلْ لِّیْ فِی الْاِسْلَامِ قَوْلاً لَّااَسْأَلُ عَنْہُ اَحَدًا بَعْدَکَ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ غَیْرَکَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ.

﴿ رواہ مسلم ﴾

-- - $ جمہءحد $ - -- -

حضرت سفیان ابن عبداللہ ثقفی سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اسلام کے متعلق مجھ کو کوئی ایسی بات بتلا دیجئے کہ پھر آپ کے بعد میں اسکے متعلق کسی سے کچھ دریافت نہ کروں۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پھر آپ کے سوا کسی سے دریافت نہ کروں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ (زبان و دل سے) اس امر کا اقرار، کر کہ میں خدا پر ایمان لایا، اور پھر اس پر قائم رہ۔

جواہر پارے

۱۔۔۔جس روایت میں غیرك كالفظ ہے وہ بعدك والی روایت کے لفظ بعدك کے مفہوم کی وضاحت کرتی ہے۔

۲۔۔۔**لَّا اَسۡـأَلُ عَنۡهُ**: ای عن ذلك القول،یعنی اسلام کے متعلق ایک ایسا واضح جامع اورحق وباطل کے مابین خط امتیاز کھینچنے والا ارشاد عطا فرمایئے، جس میں کسی طرح کا کوئی اشکال و اجمال نہ ہو،تا کہ کسی اور سے اسکی مزید وضاحت کرانے کی ضرورت نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عنه کی ضمیر کا مرجع اسلام ہے۔اس صورت میں حاصل کلام یہ ہوگا کہ اسلام کے متعلق ایک ایسا بیان ارشاد فرمایئے، کہ پھر کسی سے اسلام کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ ﴿فافهم﴾

۳۔۔۔**قُلۡ اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسۡتَقِمۡ**:یعنی اللہ کی وحدانیت کی گواہی دو اور اسکے جملہ صفات واسماء وافعال پر صدق دل سے ایمان لاؤ، جو خبر دے اسے مانو، جو حکم دیا اُسے کرو اور جس سے روکا اس سے رُکو اور پھر اسی پر تاحیات قائم رہو۔۔۔الغرض۔۔۔یہ مختصر سے ارشاد میں وہ تمام امور داخل ہیں،عقیدۃً وعملاً جنہیں اپنانا ایک مومن کیلئے ضروری ہے۔۔۔نیز۔۔۔وہ امور بھی شامل ہیں،جو ایک مومن کے ایمان وعمل کو درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔

۴۔۔۔**ثُمَّ اسۡتَقِمۡ**: انسان کی استقامت کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہِ مستقیم پر ہمیشہ کیلئے ایسا گامزن رہے کہ کبھی اس سے پل بھر کیلئے بھی ادھر اُدھر نہ ہٹے۔

استقامت ایک لفظ جامع ہے، جسکے مفہوم میں زیغ وفتور،کجی وبے راہ روی سے بالکلیہ الگ ہوکر علی وجه الدوام تمام اوامر ونواہی شرعیہ کی انجام دہی داخل ہے۔قاموس میں ہے استقام الامر اعتدال ،یعنی معاملہ ٹھیک اور درست ہوگیا۔شرح 'الحکم العطائیه' میں ہے کہ استقامت اتباع حق میں وہ میانہ روی ہے جو کامل درستگی کی راہ پر ہو،جسکے ارکان میں افراط وتفریط کا گزر نہ ہو۔۔۔وہ عمل ہے جسکی ادائیگی میں کسی طرح کی سستی وکمزوری اور کمی وکوتاہی نہ ہو۔۔۔وہ توبہ ہے جو کسی اسرار اور رجوع کرنے کی کوششوں کے بغیر خود بخود وجود میں آجائے۔۔۔وہ فرمانبرداری ہے، جس

میں کسی جھگڑے یا جس سے پھر جانے اور اعراض کر لینے کا اندیشہ نہ ہو۔۔۔وہ تفویض (اپنے کو سپرد کر دینا) ہے، جو کشش و پیچ اور غور وفکر کے بغیر پائی جائے۔۔۔المختصر۔۔۔استقامت، اتباع حق میں میانہ روی، عمل وتوبہ، اطاعت وفرمانبرداری اور اخلاص وتفویض کا ایک ایسا گلدستہ ہے، جس تک افراط وتفریط، سستی وکمزوری، کمی وکوتاہی، اصرار ورجوع، بناوٹ ودیکھا دیکھی، منازعت واعراض اور تردد وتدبیر کی رسائی نہیں۔اور ظاہر ہے کہ جو مذکورہ بالا معنی میں مستقیم ہے، وہ یقیناً اہل حق اور اہل ایمان سے ہے۔اور جو اس سے محروم ہے وہ بلاشبہ نقصان وخسارے میں ہے۔۔۔اب اگر غور کیجئے تو ظاہر ہو جائے گا، کہ انسان پر خدا کا سب سے بڑا فضل اور انسان کی سب سے بڑی کرامت درحقیقت یہی استقامت ہے۔۔۔۔قواعد الطریقہ میں ہے کہ:

اَلاِسْتِقَامَۃُ حَمْلُ النَّفْسِ عَلٰی اِخْلَاقِ الْقُرْآنِ وَالسُّنَّۃِ اَیْ اِرْتِیَاضُھَا اِعْتِیَادُھَا بِتَحْصِیْلِ الْمَلْکَاتِ الرَّاسِخَۃِ فِیْھَا مِنَ الْفَضَائِلِ ﴿لمعات﴾

فضائل وکمالات کے ملکہء راسخہ کی تحصیل کے سبب نفس انسانی کا قرآن وسنت کے اخلاق کا خوگر وعادی ہو جانا استقامت ہے۔
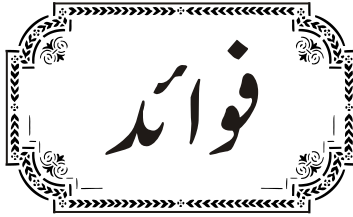
۱۔۔۔**سُفْیَانَ**: اس لفظ کے سین پر زبر، زیر، پیش سبھی لگا سکتے ہیں، مگر پیش زیادہ مشہور ہے۔

۲۔۔۔حضرت سفیان ابن عبداللہ ابن ربیعہ رضی اللہ عنہ قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ابوعمرو آپ کی کنیت تھی۔ایک قول کے مطابق آپ کی کنیت ابوعمرہ تھی۔آپ طائف کے رہنے والے تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔خلافت فاروقی کے دور میں طائف پر حاکم بھی رہے۔آپ سے صرف کل پانچ حدیثیں مروی ہیں۔آپ نہایت متقی وپرہیزگار تھے۔

۳۔۔۔**قُلْ لِّیْ فِی الْاِسْلَامِ**: یعنی ایسی بات ارشاد فرمایئے، جس سے اسلام درجہء کمال تک پہنچتا ہو، اور جس میں اسلام کے حقوق کی کامل رعایت ہو۔۔۔۔نیز۔۔۔۔جو اسلام کے فرمانبرداروں کی اسلامیت کی دلیل ہو۔ایک قول کے مطابق اس کلام کا منشاء یہ ہے کہ سائل، اسلام

کے مبادی اور غایات کو دریافت کرنا چاہتے ہیں۔اس صورت میں جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ اسلام کا مبدأ ہے، ایمان باللّٰہ اور اسکی انتہا ہے استقامت فی الدین۔

۴۔۔۔۔قَوْلًا لَّا اَسْأَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ: ای قَوْلًا جَامِعاً اَحْتَاجُ فِيْهِ اِلٰى سُؤَالِ اَحَدٍ بَعْدَ سُوَالِكَ هٰذَا۔ یعنی ایک ایسا جامع ارشاد عنایت فرمائیے کہ اسکے متعلق آپکے حضور پیش کردہ اس سوال کے بعد کسی اور سے کسی مزید سوال کی ضرورت نہ رہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ

یعنی اللہ جو رحمت لوگوں کیلئے کھولے اسکا کوئی روکنے والا نہیں ﴿سورۃ فاطر:۲﴾
اور جو کچھ روک لے، تو اس روک کے بعد اسکا کوئی چھوڑنے والا نہیں

۵۔۔۔۔وَفِیْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ: اَیْ لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحَداً غَيْرَكَ، یعنی آپ کے سوا کسی سے اسکے متعلق سوال نہ کروں۔ پہلی روایت اس دوسری روایت کو مستلزم ہے، اسلئے کہ جب آپ سے سوال کے بعد کسی سے سوال نہ کیا جائیگا، تو لازمی طور پر آپکا غیر اس سوال کا مسئول نہیں ہوگا۔اسی لئے پہلی روایت کو اولیت دی گئی ہے اور اسے اصل قرار دیا گیا ہے، اور دوسری کو محض روایۃً ذکر کر دیا گیا ہے۔اس مقام پر یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ آپ سے سوال کے بعد کسی سے سوال نہ کرنا یہ آپکے غیر سے سوال نہ کرنے کو مستلزم ہے۔لیکن آپکے غیر سے سوال نہ کرنا، آپ سے سوال کے بعد کسی سے سوال نہ کرنے کو مستلزم نہیں، اسلئے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ سے سوال کر لینے کے بعد پھر دوبارہ آپ ہی سے سوال کر لیا جائے، تو یہ غیر سے سوال نہ ہوا، مگر سوال کے بعد سوال ہو گیا۔

۶۔۔۔۔ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ: یعنی ایمان لایا میں ان تمام چیزوں پر جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۷۔۔۔۔ثُمَّ اسْتَقِمْ: یہ فرمان مبارک اس ارشاد ربانی کی ترجمانی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر وہ (اوامر کی بجا آوری اور زواجر ونواہی سے اجتناب پر) مستقیم رہے، تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہونے والے ہیں۔ ﴿سورۃ الاحقاف:۱۳﴾

۔۔۔۔یہ حدیث 'جوامع الکلم' سے ہے جو جملہ اصول اسلام کو شامل ہے۔اگر ایک طرف اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ سے توحید حاصل ہے، تو دوسری طرف 'ثُمَّ اسْتَقِمْ' کے تحت طاعت اپنے تمام انواع کے ساتھ مندرج ہے۔اسلئے کہ ہر مامور کی بجا آوری اور ہر محذور سے اجتناب کا نام استقامت ہے، تو اس میں

قلوب وابدان دونوں کے اعمال یعنی ایمان واسلام اوراحسان سب کے سب داخل ہوگئے، کیونکہ کج روی کے ساتھ استقامت کا حصول ناممکن ہے،اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں:

اَلْاِسْتِقَامَۃُ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ کَرَامَۃٍ

استقامت ہزار کرامت سے بہتر ہے

۔۔۔یایوں کہئے۔۔۔آمَنْتُ بِاللّٰہِ ،تمام طاعات کی بجا آوری اورمنہیات سے اجتناب کوشامل ہے، اور ثـم استـقـم ثبات ودوام پرمحمول ہے کہ طاعات کی امتثال اورمنہیات سے اجتناب کرنے والا اپنے اس عمل ،یعنی امتثال واجتناب پر دائم وثابت قدم رہے۔امراستقامت کی عظمت کے اظہار کیلئے ارشادنبوی ﷺ ہے:

شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَۃُ ھُوْدٍ لِاَنَّہٗ نَزَلَ **فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ**

سورۂ ہود،میرابڑھاپا ہے کیونکہ اس میں نازل ہوا ہے کہ تم قائم رہوجیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا

استقامت تمام انواع تکالیف کوجامع ہے۔صوفیاءکرام کاارشاد ہے کہ مدعو کے صراطِ مستقیم پرہونے کے باوجوداُسے دعوت الی اللہ دینا ایک مشکل امر ہے، جواس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ داعی صاحب بصیرت نہ ہو۔صاحب بصیرت ہونے کی صورت میں وہ خوب جان لے گا کہ اسکی دعوت ایک اسم سے دوسرے اسم کی طرف ہے۔۔۔ارشاد ربانی: **فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ** کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قرآن کریم میں جتنی آیتیں ہیں، ان میں سے یہی ایک آیت ہے جوذات رسالت مآب ﷺ پراشدواشق ثابت ہوئی، اسی لئے جب حضور ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ پر بڑھاپا بہت جلد(قبل از وقت) طاری ہوگیا،تو آپ نے فرمایا:

شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٍ وَاَخَوَاتِھَا

سورۂ ہوداوراسکی امثال میرے بڑھاپے کاسبب ہیں

۔۔۔اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ سرکار ﷺ کو یہ اندیشہ نہ تھا، کہ کہیں آپ خود ہی دامن استقامت ہاتھ سے نہ چھوڑدیں، بلکہ جس غم وفکر نے اس آیت کوسن کر سرکار رسالت ﷺ پر بڑھاپے کے آثار طاری کردیئے، وہ امت کاغم تھا اورامت کی فکر تھی۔ نبی کریم ﷺ جواپنی ضعیف وناتواں امت کے حال سے باخبر تھے، ہمیشہ امت کی سہولت کے خواہاں اوراسکے لئے آسانیوں کے جویاں رہے، بھلا ایسے رؤف ورحیم نبی کواس بات کی فکر کیوں نہ ہوتی، کہ انکی امت کے کاندھوں پرایک بارِگراں رکھ کر اسکوشدید آزمائشوں کے حوالے کیا جارہاہے۔آیت کریمہ میں گوخطاب بظاہر رسول ہی سے ہے،مگر آپ ﷺ کے توسط سے امت بھی اسکی مخاطب ہے۔امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں کہ استقامت

ایک سخت اور دشوار امر ہے، اسلئے کہ وہ عقائد واعمال واخلاق سبھی کو شامل ہے۔۔۔۔مثلاً: عقائد میں تشبیہ و تعطیل سے اجتناب، اعمال میں تغیر وتبدیل سے احتراز اور اخلاق میں افراط وتفریط سے کنارہ کشی، ان سب کو استقامت حاوی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ دنیا میں صراطِ مستقیم پر استقامت ایسا ہی ہے، جیسے پل صراط پر گزرنا۔۔۔۔دونوں بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہیں۔۔۔۔راہ استقامت پر ثابت قدم رہنے کی صعوبت کا اندازہ اس ارشاد نبوی ﷺ سے بھی ہوتا ہے:

اِسۡتَقِیۡمُوۡا وَلَنۡ تُحۡصُوۡا

ثابت قدم رہو، مگر تم ایسا ہرگز نہ کرسکو گے

۔۔۔۔یعنی تم میں اگرچہ ایسی استطاعت اور طاقت نہیں ہے کہ تم ویسا ثابت قدم رہو، جیسا کہ ثابت قدمی کا حق ہے، لیکن اللہ کی اطاعت میں حتی المقدور کوشش کرتے رہو۔اسلئے کہ جو بالکلیہ ہاتھ نہ آسکے اُسے بالکلیہ چھوڑ دینا بھی نہیں چاہیے۔اس ارشاد میں اس بات کی بھی تنبیہ ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھنے لگے کہ وہ راہ استقامت پر ویسا ہی ثابت قدم ہے، جیسا کہ اسکا حق ہے۔اور پھر اس سمجھنے کے نتیجے میں اپنے نفس کو لوامہ کی صفت سے بالکلیہ خارج تصور کرنے لگے اور پھر غرور وفخر۔۔۔۔نیز۔۔۔۔خود بینی کا شکار، بدترین ملامت کا مستحق ہوجائے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ استقامت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی تمام ساعتوں میں مرنے تک اپنے حالات ومقامات پر قائم وثابت رہے۔انسان میں اطاعت پر ثابت قدم رہنے کی استطاعت نہ رہنے میں راز یہ ہے، کہ انسان کا ضمیر آب نسیان سے تیار کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ نسیان کا وجہ عصیان ہونا غیر معقول نہیں، اسی لئے سرکار ارشاد فرماتے ہیں:

کُلُّکُمۡ خَطَّآئُوۡنَ وَخَیۡرُ الۡخَطَّائِیۡنَ التَّوَّابُوۡنَ

تم سب خطا شعار ہو اور سب سے بہتر خطا شعار وہ ہے، جو بہت زیادہ توبہ کرنے والا ہے۔

۸۔۔۔۔**ثُمَّ اسۡتَقَمۡ**: لفظ ثم یہاں استعارۃً رتبہ ومقام کی تراخی کیلئے ہے، کیونکہ امنت باللہ کے قول سے استقامت افضل ہے۔اسلئے کہ استقامت عقائد واعمال واخلاق سبھی کو شامل ہے۔

﴿ ذکرہ الزمخشری والامام ﴾

۹۔۔۔۔از روئے لغت، استقامت، اعوج (کجی وٹیڑھاپن) کی ضد ہے، یعنی بلند ہونے اور کھڑے ہونے کی صورت میں بالکل سیدھا کھڑا ہونا، استقامت ہے۔اسکی چند قسمیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔استقامت عمل: یعنی راہ سنت کے اندر رہتے ہوئے، ایسی میانہ روی جو اخلاق کی

حد سے متجاوز نہ ہو۔۔۔نیز۔۔۔ریاء، سمعہ، صلے کی امید اور کسی غرض کی طلب سے پاک وصاف ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔استقامت قلب: یعنی راہ صواب پر ثابت قدم رہنا۔ محققین کے نزدیک سیر الی اللہ میں قصد وارادہ کی درستگی اور اوامر کی بجا آوری۔۔۔نیز۔۔۔نواہی سے اجتناب کے ذریعہ اس درستی کے حدود پر قویٰ کو ثابت وقائم رکھنا، استقامت ہے۔

۱۰۔۔۔'سیر الی اللہ' میں استقامت، 'سیر فی اللہ' میں استقامت سے نیچے ہے۔ اسلئے کہ 'سیر فی اللہ' صفات الٰہیہ سے متصف ہوجانے کا نام ہے، بخلاف 'سیر الی اللہ'۔ کیونکہ 'سیر الی اللہ' راستے کی منزل ہے۔ جہاں تک سلوک صرف طریق مستقیم پر چلنے سے حاصل ہوجاتا ہے۔ ان دو استقامتوں کے سوا ایک ہے، 'استقامت فی اللہ'، اسکا مقام، 'استقامت فی السیر فی اللہ' سے اونچا ہے۔ سرکارِ مدینہ ﷺ کو فاستقم کما امرت، سے اسی استقامت کا امر دیا گیا ہے۔ یہ مقام جمع الجمع، اور بقاء بعد الفناء کی منزل ہے۔ 'استقامت فی السیر الی اللہ' مبتدئین کیلئے ہے اور 'استقامت فی السیر فی اللہ' متوسطین کیلئے ہے۔ لیکن 'استقامت فی اللہ' یہ اخص الخواص کیلئے ہے۔

۱۱۔۔۔استقامت عمل، اور استقامت قلب کے سوا، استقامت کی ایک تیسری قسم، استقامت روح ہے، یہ 'ثبات علی الحق' کا نام ہے اور در حقیقت استقامت اسی ثبات کو کہتے ہیں۔

۱۲۔۔۔امام قشیری فرماتے ہیں: استقامت ایک ایسا درجہ ہے جسکے ذریعہ امور کو کمال حاصل ہوتا ہے اور جسکے وجود سے خیرات وحسنات کا حصول ہوتا ہے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔خیرات وحسنات میں آراستگی پائی جاتی ہے۔ پس جو مستقیم نہیں، اس نے اپنی کوششوں کو ضائع کردیا اور اپنی جدوجہد میں نامراد رہا۔

۱۳۔۔۔بعض عارفین فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے، کہ توحید الٰہی سے واقف ہونے اور جلال ربانی کو دیکھ لینے کے بعد، تو حق کو اپنا مرکز نگاہ بنا کر اسکے گرد ایسی گردش کرتا رہے کہ رضاءِ الٰہی پر راضی رہے اور قضاءِ الٰہی پر شاکر اور پھر اس مقامِ رضا سے نیچے اتر کر ہوا وہوس اور نفسانی خواہشات کے فتور کا شکار نہ بنے۔

۱۴۔۔۔امام غزالی فرماتے ہیں کہ استقامت کی عزت وشرافت اور ہر حال میں اسکی احتیاج کو سمجھنے کیلئے یہی کافی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ پنجوقتہ نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرات کو (جو دعا استقامت پر مشتمل ہے) امر واجب قرار دیا ہے۔

۱۵۔۔۔**رواہ مسلم**: امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔ ترمذی کی روایت کچھ مفصل ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللّٰهِ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّاْسِ نَسْمَعُ دُوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ يَسْاَلُ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِى الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا اِلَّا اَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَاَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُوْلُ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ. ﴿متفق علیہ﴾

حضرت طلحہ بن عبید اللہ کا بیان ہے کہ نجد کا ایک شخص بال بکھیرے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جسکی آواز کی گنگناہٹ کانوں میں آتی تھی، لیکن ہم اسکی بات نہیں سمجھ رہے تھے یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کے قریب پہنچ گیا، تو ہم نے سنا کہ وہ سرکار رسالت سے اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے، جسکے جواب میں حضور نے فرمایا، رات دن میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اسنے عرض کیا کہ کیا مجھ پر انکے سوا بھی کوئی نماز فرض ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تو خود ہی بطور نفل نماز پڑھے، پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ رمضان کے مہینے کا روزہ فرض ہے۔ اسنے عرض کیا، کیا اس روزے کے سوا بھی مجھ پر کوئی روزہ لازم ہے، آپنے فرمایا نہیں لیکن یہ کہ تو خود ہی بطور نفل روزہ رکھے۔ حدیث کے راوی حضرت طلحہ فرماتے ہیں کہ پھر حضور نے اسکے سامنے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا، جس پر اسنے عرض کیا کہ کیا اسکے سوا بھی مجھے کچھ دینا فرض ہے، تو حضور نے فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ تو خود ہی بطور نفل کسی کو کچھ دیدے۔ حضرت طلحہ کا بیان ہے کہ اسکے بعد وہ آنے والے صاحب یہ کہتے ہوئے واپس ہوگئے، کہ میں نہ اس پر کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس شخص نے یہ سچ کہا ہے، تو کامیاب ہوگیا۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔۔مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ: نجد کے معنی ہے بلند زمین۔نجد کا مدمقابل ہے غور، جسکا معنی 'پست زمین' ہے۔ نجد عرب کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے جسکے شمال میں عراق وشام ہے۔اور جنوب میں تہامہ یعنی مکہ معظّمہ اور سرزمین حجاز کے جنوبی علاقے ہیں، نیز ذات عرق جسکا میقات ہے۔

۲۔۔۔۔ثَائِرَ الرَّاسِ: ثور کا معنی ہے جوش میں آنا، بھڑکنا، کودنا، بلند ہونا، پھیلنا، کہا جاتا ہے: ثار الشی یثور ۔۔۔یعنی چیز پراگندہ ہوئی اور بلند ہوئی۔حدیث میں ہے: صَلٰوةُ العِشَاءِ اِذَا سَقَطَ ثَوْرُ الشَّفَقِ۔۔۔یعنی عشاء کی نماز کا وقت اس وقت آتا ہے جبکہ شفق کا انتشار ساقط ہوجائے اور اسکی سرخی زائل ہوجائے۔شفق کی سُرخی کو ثوران کہتے ہیں، اسلئے کہ وہ بھی دامن فلک پر منتشر رہتی ہے۔۔۔۔حدیث میں ہے:

رَاَیْتُ الْمَاءَ تَثُوْرُ مِن بَیْنِ اَصابِعِهٖ

میں نے دیکھا کہ پانی آپ کی انگلیوں کے بیچ سے ابل رہا ہے

۔۔۔۔حدیث زیر شرح میں ثائرالراس سے مراد منتشر، پراگندہ اور کھڑے کھڑے بال والا ہے۔نحوی ترکیب کے لحاظ سے ثائرالراس یہاں پر حال ہوکر منصوب ہے یا صفت ہوکر مرفوع ہے۔

۳۔۔۔نَسْمَعُ دُوِیَّ صَوْتِهٖ: 'دوی' کی دال پر زبر، واؤ پر زیر، اور یا پر تشدید ہے اور یہی مشہور بھی ہے۔دال پر زبر کی جگہ پیش کی بھی حکایت کی گئی ہے۔'دوی' اس آواز کو کہتے ہیں جو بلند نہ ہو، جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ، ہوا کی سنسناہٹ، اور پرندہ کی پھڑ پھڑاہٹ کو بھی 'دوی' کہتے ہیں۔ہوا میں دور سے آواز بلند ہو، جو سمجھ میں نہ آئے اُسے بھی 'دوی' کہا گیا ہے۔ایسی آواز جو بار بار مسلسل اور دراز ہو کہ سمجھ میں نہ آئے اسکی بھی تعبیر 'دوی' سے کی گئی ہے۔آنے والے چونکہ آواز پر آواز لگارہے تھے، اسلئے انکی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔نسمع یعنی صیغہ معروف کی جگہ نُسمع یعنی صیغہ مجہول کی بھی روایت آئی ہے۔پہلی صورت میں 'دَوِیّ'، منصوب ہے اور دوسری صورت میں مرفوع۔

۴۔۔۔عَنِ الْاِسْلَامِ: یعنی اسلام کے ارکان وفرائض واحکام کے متعلق سوال کیا۔ جواب میں حج کا ذکر نہیں فرمایا گیا، اسکی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقت تک ممکن ہے کہ حج فرض

ہی نہ کیا گیا ہو۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔سائل اہل حج (یعنی حج کی استطاعت رکھنے والوں میں) سے نہیں تھا ۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔سوال و جواب اسلام کے ارکان خمسہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔صرف ان ارکان سے متعلق ہے جو اس وقت فرض ہو چکے تھے۔لہٰذا حدیث زیر شرح میں هل عليّ غير هن ؟ هل عليَّ غيره ؟ اور هل عليّ غيرها؟ کی ضمیروں کا مرجع علی الترتیب، نماز، روزہ اور زکوۃ ہی ہے اور سائل کے سوال کا منشاء وہی ہے جو حدیث زیر شرح کے ترجمے سے ظاہر کیا جا چکا ہے۔

۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔حدیث مذکور سے یہ مفہوم ہرگز نہیں پیدا ہوتا کہ جن چیزوں کا ذکر اس میں نہیں ہے وہ واجب ہی نہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔حدیث مذکور میں جن امور کا ذکر نہیں انکے عدم ذکر سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی۔۔۔۔مثلاً: کسی نفل نماز کو شروع کر دے، تو اس پر اسکی تکمیل لازم نہیں رہ جاتی۔۔۔۔اسلئے کہ۔۔۔۔سائل کا منشاء صرف ان فرائض کو معلوم کرنا ہے جو اس پر بہر حال فرض ہیں خواہ ان کو شروع کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ان اعمال سے اسکا سوال متعلق نہیں، جو خود اسکے اپنے شروع کر دینے سے اس پر لازم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔چونکہ قرآن کریم میں ہے کہ:

لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿سورۂ محمد:۳۳﴾۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنے اعمال کو باطل نہ کرو

۔۔۔۔اسلئے کسی عمل خیر کو شروع کر کے اسکو تکمیل تک پہنچانا لازمی ہو جاتا ہے۔شریعت اسلامیہ میں فرض عین اور فرض کفایہ بکثرت ہیں اور وہ ان فرضوں کے علاوہ ہیں، جنکا ذکر حدیث زیر شرح میں ہے۔یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ حدیث زیر بحث سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں، کہ اس میں ذکر کردہ امور کے سوا کچھ فرض نہیں۔رہ گیا وتر کا معاملہ تو یہ ان فرائض قطعیہ میں سے نہیں، جو حدیث زیر شرح میں مراد ہیں اور جنکا ذکر یہاں مقصود ہے، اسلئے وتر کے ذکر کی ضرورت نہ رہی۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک وتر واجب نہ ہوئی ہو۔حدیث میں تطوع سے مراد وہ ہے جو فرض کا مقابل ہو۔۔۔۔یا۔۔۔۔جنکا وجوب حدیث میں ذکر کردہ امور کے وجوب کے بعد ثابت ہو۔۔۔۔مثلاً: حج۔

۵۔۔۔۔یہ بھی ممکن ہے کہ سائل کا سوال حقیقت اسلام سے متعلق ہو۔ایسی صورت میں جواب میں شہادتین کا ذکر نہ کرنا، یا تو ان کی شہرت کی وجہ سے ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔اس وجہ سے ہے کہ شہادتین کا علم و یقین تو سائل کو پہلے ہی سے حاصل ہو چکا تھا۔

۶۔۔۔۔اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ : فلاح کامیابی اور نجات کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ حدیث میں ذکر کردہ امور پر بغیر کسی کم و بیش کے عمل کرنے کی سائل نے جو خبر دی ہے، اگر اس

میں وہ سچا ہے اور واقعی اس نے یوں ہی عمل کیا، تو اسے نجات مل جائے گی۔۔۔۔ یا یہ کہ۔۔۔۔ ذکر کردہ امور کی تصدیق واذعان کو اپنانے اور انکی طرف والہانہ رغبت کا جو اہتمام سائل کے کلام سے سمجھا جاتا ہے، تو اگر واقعی وہ اپنے اس اہتمام اور رغبت میں سچا ہے تو وہ کامیاب ہو گیا۔ اس دوسری توجیہ پر کامیابی حسن نیت سے متعلق ہو جائیگی۔

۷۔۔۔۔اِنْ صَدَقَ: ہمزہ پر زیر ہے اور کبھی تقدیر لام کے ساتھ اس پر زبر بھی دیا گیا ہے۔

۸۔۔۔۔ابوداؤد اور نسائی نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ابوداؤد اور نسائی میں الزکوٰۃ کی جگہ 'الصدقة' کالفظ ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ ابوداؤد میں 'اَفْلَحَ وَاللّٰهِ اِنْ صَدَقَ' کے الفاظ ہیں۔

فوائد
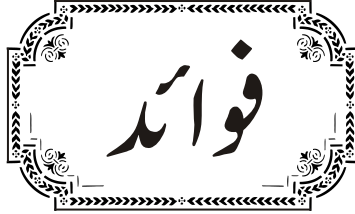
۱۔۔۔۔عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ: آپ کی کنیت ابومحمد قرشی ہے، حضرت ابوبکر کے بھتیجے، قدیم الاسلام ہیں، غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات میں حضور ﷺ کے ساتھ رہے، جنگ احد میں حضور ﷺ کی ڈھال بنے اور چوبیس زخم کھائے، آپ کے جسم پر کل ۷۵ زخم تھے جو غزوات میں کھائے تھے، جنگ جمل ۳۶ھ میں بصرہ میں شہید ہوئے، وہاں ہی آپ کا مزار پرانوار ہے۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر شریف ۶۴ سال کی تھی۔ حضور ﷺ نے آپ کا نام طلحہ الخیر، اور طلحہ الجود رکھا، یعنی سخاوت و بھلائی کے درخت خورما کا شگوفہ۔ ایک جماعت نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ آپ کے غزوہ بدر میں نہ شریک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو اور سعید بن زید کو اس موقع پر اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ دونوں اس قریشی قافلے کی خبر حاصل کرلیں جو ابو سفیان بن حرب کی قیادت میں سرگرم سفر تھا۔ معلومات و واقفیت حاصل کر کے جب آپ لوٹے تو جنگ تمام ہو چکی تھی۔ حضور ﷺ نے از راہ کرم نوازی آپکا حصہ اپنے مال سے مقرر فرمایا۔

۲۔۔۔۔جَآءَ رَجُلٌ: کہا گیا ہے کہ وہ آنے والے مرد ضمام ابن ثعلبہ تھے جو قبیلہ سعد بن بکر کے قاصد تھے۔

۳۔۔۔۔ مِنْ اَهْلِ نَجْدٍ: حضور ﷺ کے ارشادات عالیہ میں اکثر ملکوں اور شہروں کا

ذکر ملتا ہے جن میں شام، یمن اور نجد بھی ہیں۔ اس جگہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ عہد نبوی میں اور اسکے بعد بھی شام، یمن اور نجد اہل عرب کی تین اہم اور زبردست تجارتی منڈیاں تھیں۔ رسول مقبول ﷺ نے شام و یمن کے متعلق دعائیں فرمائی ہیں اور نجد کو شیطانوں اور فتنہ و فساد کی جگہ بتایا ہے۔

آیئے احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں نجد کا جائزہ لیں:

﴿ا﴾۔۔۔رسول ﷺ نے بیک وقت تین تین بار شام اور یمن کے حق میں دعائے برکت فرمائی ہے۔ تینوں بار عرض کیا گیا کہ نجد کیلئے بھی دعا فرمائیں، تیسری بار حضور ﷺ نے فرمایا کہ نجد ایسی جگہ ہے جہاں سے فتنہ پر فتنہ، زلزلہ پر زلزلہ اُٹھے گا اور وہاں سے قرن شیطان نکلے گا اور دعا نہ فرمائی۔

﴿ب﴾۔۔۔ارشاد ہے کہ نجد سے ایسا شیطان نکلے گا جس سے عرب کا جزیرہ ہل جائیگا۔

﴿ج﴾۔۔۔بیر معونہ کے واقعے میں حضور ﷺ نے ابو برا نجدی سے فرمایا کہ مجھے نجد سے خوف ہے۔ میں نجد سے ایمن نہیں۔

﴿د﴾۔۔۔دارالندوہ کے متعلق حدیث سے ظاہر ہے کہ ابوجہل کے سوال پر شیطان نے جواب دیا کہ میں نجد کا رہنے والا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک شیطان کو شیخ نجد کہتے ہیں۔

﴿ہ﴾۔۔۔ارشاد ہے کہ مسیلمة الکذاب کے شہر سے ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو دین اسلام کو بدل دے گا۔

﴿و﴾۔۔۔ارشاد ہے کہ وادی بنی حنیفہ سے ایک شخص ۱۲۰۰ھ میں نکلے گا۔۔۔الخ۔ مسلم شریف میں دو شیطان کی خبر ہے۔

بہ ترتیب ابجد (ز، تا، ف) گیارہ حدیثوں میں ارشاد ہے کہ مشرق، یعنی پورب سے شیطان نکلے گا اور اس شیطان سے امت کو بہت ڈرایا اور بچنے کو کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ وہ لوگ دین سے نکلے ہوئے ہونگے۔۔۔۔وغیرہ، وغیرہ۔۔۔

پہلی چار حدیثوں میں صاف صاف نجد کا نام فرمایا گیا ہے جہاں سے قرن شیطان کے نکلنے کی خبر دی گئی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ پوری دنیا میں سوا اس ایک نجد کے دوسرا کوئی نجد نہیں۔ پانچویں حدیث میں مسیلمة الکذاب کے شہر کا ذکر ہے کہ وہاں سے دین اسلام کو بدل دینے والا شخص پیدا ہوگا اور یہ بھی مسلم ہے کہ مسیلمة الکذاب خاص نجد ہی کا رہنے والا تھا۔ چھٹی حدیث میں وادی بنی حنیفہ کا ذکر فرمایا گیا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ وادی بنی حنیفہ بھی نجد ہی میں ہے، جہاں سے ۱۲۰۰ھ میں ابن عبدالوہاب نجدی نے خروج کیا۔

ز، تا، ف (یعنی ۷ تا ۱۷) یعنی گیارہ حدیثوں میں صرف یہ ارشاد ہے کہ مدینہ طیبہ کے پورب سے شیطان نکلے گا۔ ان گیارہ حدیثوں میں کسی شہر ومقام کا نام نہیں ہے، صرف سمت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی۔۔۔'پورب'۔۔۔ جغرافیہ کے سارے قدیم وجدید نقشے شاہد ہیں کہ صفحہ ءزمین پر سوا اس ایک نجد کے اس نام کی دوسری جگہ ہے ہی نہیں۔

۔۔۔ پروفیسر جان مارتھولوی کا پرانا مستند نقشہ ملاحظہ فرمائیں۔
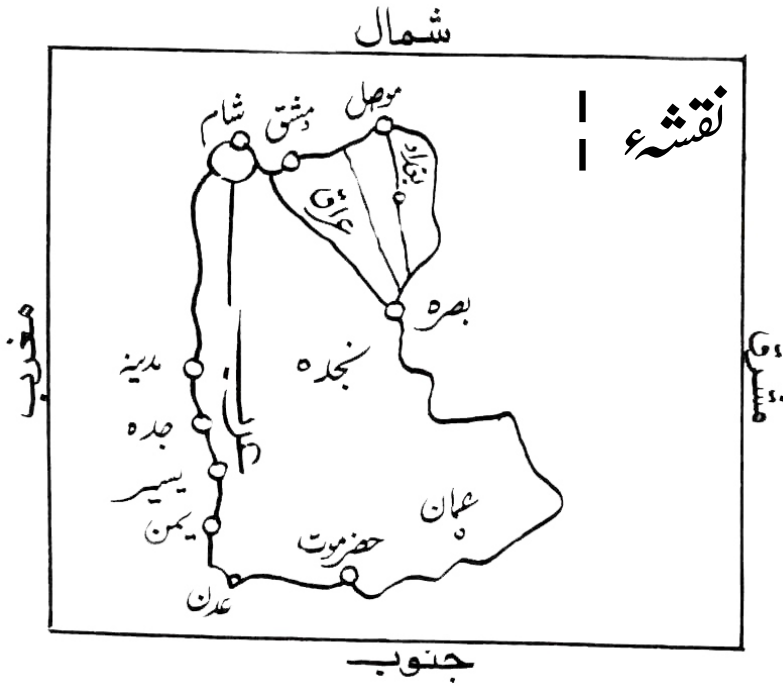
۔۔۔ اسکے علاوہ الجمعیۃ بک ڈپو، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی نمبر ۶، انڈیا، کی طرف سے شائع کئے گئے مرقع عہد رسالت وخلافت راشدہ بھی موجود ہیں جو اکثر شہروں کی مسجدوں میں دعوت نگاہ دیتے ہیں۔ یہ مرقع بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ جناب سید رفیع الدین احمد صاحب رحمانی نے مرتب کئے ہیں۔ اور تاریخ وجغرافیہ کے پیش نظر مستند وصحیح ہیں۔

ارباب نظر واصحاب خبر غور فرمائیں کہ یہی وہ مشہور اور واحد مقام نجد ہے جہاں سے مُسَیْلَمَۃ الْکَذَّاب نکلا۔ اسی واحد نجد میں وادی بنی حنیفہ ہے۔ یہی نجد ابو برا نجدی کا وطن ہے۔ یہی مدینہ ءطیبہ سے ٹھیک پورب، ایک خط پر واقع ہے۔ یہی نجد ابلیس کا وطن ہے اور اسی واحد نجد سے ۱۲۰۰ھ میں ابن عبدالوہاب نجدی نے خروج کیا۔۔۔ نیز۔۔۔ ساری دنیا میں نجد نام کی اسکے سوا کوئی اور جگہ نہیں بلکہ ساری

دنیامیں نجد صرف ایک ہی ہے،اوریہی ہے جس میں حضور ﷺ کی بتائی ہوئی ساری نشانیاں موجود ہیں۔

۔۔۔۔لہٰذا۔۔۔۔وہابیت نوازی اورنجدیت پرستی کے نشے میں چور ومخمور ہوکرخواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بے جا تاویل کے ذریعہ کرۂ ارض پرکسی دوسرے نجد کا اختراع کرنا اورنبوی پیشینگوئیوں کا رخ اس اختراعی نجد کی طرف موڑ دینا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔مُسَیْلَمَۃ الْکَذَّاب اورابن عبدالوہاب کے نجد کو نبوی پیشینگوئیوں کی زد سے بچانے کی کوشش کرنا علمی بددیانتی کی بدترین مثال ہے،جسکا تصور، وہ بھی مذکورہ بالا دلائل وشواہد کی موجودگی میں،کسی صاحب علم سے تو کیا،کسی صاحب ہوش سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ رہ گئیں کج بحثیاں اورکٹ حجتیاں،تو اسکا دروازہ بھلا کون بند کرسکا ہے۔ان پہاڑوں کی طرح ٹھوس اوراٹل حقیقتوں کے باوجود بعض وہابیوں کا یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو نجد ضرور فرمایا ہے لیکن اس سے عراق مراد ہے۔اب کوئی ان سے پوچھے کہ ذرا انصاف ودیانت کے ساتھ بتائیں:

﴿۱﴾۔۔۔ان حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ کی زبان اقدس پرنجد کے سوا کہیں پر عراق کا نام و نشان بھی آیا ہے؟

﴿۲﴾۔۔۔مسیلمۃ الکذاب کوعراق سے کوئی دور کا بھی واسطہ یالگاؤ ہے؟

﴿۳﴾۔۔۔وادی بنی حنیفہ جو آج تک نجد میں موجود ہے اُسے کہیں چھپایا جاسکتا ہے؟

﴿۴﴾۔۔۔نقشہ پیش نظر ہے۔عراق مدینہ منورہ سے پورب ہے کہ اُتر؟ پورب تو نجد ہی ہے، بالکل ایک خط پر، نہ کہ عراق۔عراق مدینہ سے شمال کی طرف ہے؟

﴿۵﴾۔۔۔ابوبرا نجدی کا نجد جس سے حضور ﷺ نے اپنے خوف واندیشے کا اظہار کیا تھا،کیا کوئی دوسرا نجد ہے؟

﴿۶﴾۔۔۔ابوجہل کے سوال پرابلیس نے جس نجد کا شیخ اپنے کو بتایا،کیا یہ مسلم نہیں کہ وہ یہی ابن عبدالوہاب والا نجد ہے؟

﴿۷﴾۔۔۔۱۲۰۰ھ میں ابن عبدالوہاب نجدی نے جس جگہ سے خروج کیا اوراپنے اعمال و عقائد۔۔۔نیز۔۔۔حرکات ناشائستہ سے ایک فتنہ عظیم برپا کردیا،دین ومذہب میں تبدیلیاں شروع کردیں،کیا یہ مسلم نہیں کہ وہ یہی نجد ہے؟ کیا ۱۲۰۰ھ میں عراق سے بھی کوئی ابن عبدالوہاب جیسا نکلا؟ ہے کوئی جو سعودی اوروہابی نجد کے علاوہ پوری دنیامیں کوئی ایسا نجد بنام نجد مجھے دکھلادے:

﴿۱﴾۔۔۔جو اس نجد کے علاوہ بنام نجد نقشے میں ملے۔

﴿۲﴾۔۔۔جہاں سے مسیلمۃ الکذاب پیدا ہوا ہو۔

﴿۳﴾---جو مدینہ طیبہ سے پورب ہو۔
﴿۴﴾---جہاں وادی بنی حنیفہ ہو۔
﴿۵﴾---جہاں ابو برا نجدی کا وجود ہوا ہو۔
﴿۶﴾---جو ابلیس لعین کا مسکن ہو۔
﴿۷﴾---جس کیلئے حضور ﷺ نے ایک مہینہ بددعا کی ہو اور اپنے خوف وتردد کا اظہار فرمایا ہو۔
﴿۸﴾---جہاں سے ۱۲۰۰ھ میں قرن شیطان (شیطان کی سینگ یا شیطان کا گروہ) ظاہر ہوا ہو۔

ان لوازمات وخصائص کے ساتھ اگر دنیا میں کوئی نجد ہے، تو صرف یہی ابن سعود اور ابن عبد الوہاب والا نجد ہے اور اسی کی طرف نبوی پیشینگوئیوں کا روئے سخن ہے۔ ان تحقیقات کے بعد آسمان نیچے آجائے اور زمین اوپر ہو جائے، جب بھی پوری کائنات میں ان خصوصیات کے ساتھ کوئی دوسرا نجد مل ہی نہیں سکتا۔ خالی نجد بھی نہیں مل سکتا، پھر ان لوازمات کے ساتھ بھلا کیا ملے گا۔

۴---فائدہ نمبر ۳ میں، میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ سب کا سب تحقیقات نجد سے ماخوذ ہے، جسکے مؤلف ہیں گرامی قدر منزلت:

جناب ڈاکٹر سید طلحہ رضوی برق

ایم اے (ڈبل)---پی ایچ ڈی---لکچرار---ایچ ڈی---جین کالج، آرہ

---آپ محلّہ شاہ ٹولی، داناپور، پٹنہ، بہار، انڈیا کے رہنے والے ہیں اور عالم تورات وانجیل حضرت علامہ سید شاہ محمد قائم صاحب قبلہ رضوی، چشتی، نظامی، قتیل داناپوری دامت برکاتہم العالیہ کے فرزند ارجمند ہیں۔

۵---**اَفۡلَحَ الرَّجُلُ اِنۡ صَدَقَ** : یعنی اگر صدق دل سے وعدہ کیا---یا---اگر اس وعدہ کو پورا کر دکھایا، تو کامیاب ہو گیا۔ حضور ﷺ کے اس کلام بلاغت نظام کا اسلوب بھی اشارہ کر رہا ہے کہ نجدیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے حدیث ۱۱ میں ایک سائل کے انھی الفاظ پر حضور ﷺ نے فلاح وکامیابی کا قطعی حکم دے دیا۔ اور اس نجدی کے انہی الفاظ پر مشکوک طریقہ سے کامیابی بیان فرمائی۔
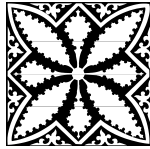
عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَیْسِ لَمَّا اَتَوُا النَّبِیَّ ﷺ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنِ الْقَوْمُ اَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوْ رَبِیْعَۃُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْبِالْوَفْدِ غَیْرَخَزَایَا وَّلَانَدمٰی قَالُوْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّالَانَسْتَطِیْعُ اَنْ نَّاْتِیَکَ اِلَّافِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ وَبَیْنَنَاوَبَیْنَکَ ھٰذَا حَیٌّ مِّنْ کُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِاَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرُ بِہٖ مَنْ وَرَاءَ نَا وَنَدْ خُلُ بِہِ الْجَنَّۃَ وَسَاَلُوْہُ عَنِ الْاَشْرِبَۃِ فَاَمَرَھُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاالْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ قَالُوْا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ شَھَادَۃُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَاَنْ تُعْطُوْا مِنَ الْمُغْنِمِ الْخُمُسَ وَنَھَا ھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِیْرِ وَالْمُذَفَّتِ وَقَالَ اِحْفِظُوْا ھُنَّ وَاَخْبِرُوْا بِھِنَّ مَنْ وَّرَآءَ کُمْ ۔

﴿متفق علیہ ولفظہ للبخاری﴾

ـ ـــ ـــ ,ترجمہ ٔ حدیث $ ـــ ـــ ـ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ قبیلہ عبدالقیس کی نمائندہ جماعت جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ قوم ۔۔۔۔یا۔۔۔۔یہ نمائندہ جماعت کس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔آنے والوں نے عرض کیا، ہم قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔حضور نے ارشاد فرمایا: اے آنے والی قوم۔۔۔۔یا۔۔۔۔آنے والی نمائندہ جماعت کو مرحبا! نہ تم رسوا ہوئے، نہ شرمندہ (یا نہ تم کبھی رسوا ہو نہ پشیمان) ان لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، ہم اشہر حرام (یعنی ذیقعد یا ذی الحجہ ومحرم ورجب) ہی میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو سکتے ہیں، اسلئے کہ ہمارے اور آپ کے مابین قبیلہ ٔ مضر کے کفار حائل ہیں (۔۔۔۔الختصر ۔۔۔۔ہم جلد جلد آپکی بارگاہ میں حاضری دینے سے قاصر ہیں) لہٰذا آپ ہم کو فیصلہ کن احکامات و ہدایت سے سرفراز فرمائیں، تا کہ جنہیں ہم گھروں میں چھوڑ آئیں ہیں انہیں آپکے فرمودات سے باخبر کردیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ان ہدایت پر عمل کر کے ہم جنت میں بھی داخل ہو سکیں اسکے بعد انہوں نے پینے کے برتنوں کے متعلق بھی احکامات معلوم کئے۔آپنے اس جماعت کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے روکا۔چنانچہ آپنے انہیں ایک خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا، تم جانتے ہو کہ ایک خدا پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے۔انہوں نے عرض کیا! اللہ اور اسکا رسول ہی خوب جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا (خدا پر ایمان لانے کے معنی) اس امر کی شہادت دینا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد خدا کے رسول ہیں، اور نماز پڑھنے، زکواۃ دینے، رمضان کا روزہ رکھنے، اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ دینے کا حکم فرمایا۔پھر آپ نے ان چار قسم کے برتنوں کو استعمال کرنے سے منع فرمایا، یعنی لاکھ کئے ہوئے مرتبان، یا ٹھلیوں سے، کدو کے تونبوں سے، درختوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے بنائے ہوئے برتنوں سے اور روال کئے ہوئے (یعنی تارکول والے) پیالوں سے۔اسکے بعد آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ان باتوں کو ذہن نشین کرلو اور ان لوگون کو آگاہ کردو، جنہیں تم پیچھے (یعنی گھروں پر) چھوڑ آئے ہو۔ ﴿بخاری ومسلم﴾ ﴿اس حدیث میں الفاظ بخاری کے ہیں﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔ **عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ:** آپ کے مناقب بہت ہیں، جو محتاج بیان نہیں۔ ہجرت کے تین سال پہلے آپکی ولادت ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کے وصال شریف کے وقت آپ کی عمر شریف ۱۳ سال یا ۱۵ کی تھی۔ آپ نے حضرت جبرائیل کو دوبار (۲) دیکھا۔ آپ دیکھنے میں نہایت حسین وجمیل، گفتار میں بہت بڑے فصیح اور علم حدیث میں سب پر ممتاز تھے۔ ترجمان القرآن اور سلطان المفسرین آپ کے القاب تھے۔ آپ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ زبردست عاقل و صابر وحلیم تھے۔ آپ اس قدر دراز قامت تھے، کہ لوگوں کے بیچ میں ایسا لگتا کہ آپ سواری پر سوار ہیں حضرت عباس آپ سے بھی دراز قامت تھے۔ اور حضرت عبدالمطلب، حضرت عباس سے بھی زیادہ بلند قامت تھے۔ آپ کی قامت زیبا کی وجاہت اور عارض پاک کی صباحت آپکی جلالت شان کو نمایاں کر رہی تھی۔ ۷۱ سال کی عمر شریف میں ۶۸ھ میں طائف میں آپ کا وصال ہوا۔

۲۔۔۔ **اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ:** الوفد، وافد کی جمع ہے۔ وہ لوگ جو کسی مشترکہ غرض کیلئے بادشاہ یا حاکم کے پاس جائیں 'وفد' کہلاتے ہیں۔ عبدالقیس اس عظیم قبیلے کے جداعلی کا نام ہے جسکا سلسلہ نسب ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان تک پہنچتا ہے۔ عرب کا طریقہ تھا کہ اپنے قبیلے کا نام اپنے جداعلی کے نام پر رکھ دیا کرتے تھے، چنانچہ انکے اکثر قبیلوں کا نام انکے باپوں ہی کے نام پر ہے۔

۳۔۔۔ **مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ:** مرحب کشادہ جگہ کو کہتے ہیں مرحبا مسافر سے خوش آمدید کہنے کے موقع پر کہا جاتا ہے۔ جس سے اسکا اکرام اور اس سے کمال انس ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اھلاً و سھلاً کا لفظ بھی اس سے ملا دیا جاتا ہے یعنی تو اپنے گھر میں اور نرم وملائم جگہ میں آیا۔

۴۔۔۔ **غَيْرَ خَزَايَا وَّلَا نَدَامٰی:** خزایا، خزیان یا خزی، کی جمع ہے جسکے معنی ہیں ذلیل اور مصیبت زدہ اور ندامی نادم کی جمع ہے جسکے معنی ہیں شرمندہ پشیمان۔۔۔ یہ اس قوم کیلئے حضور آیۂ رحمت ﷺ کی طرف سے بشارت ودعائے خیر ہے۔

۵۔۔۔ **اَلشَّهْرَ الْحَرَامِ:** شہر حرام سے جنس مراد ہے۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب، یہ چار مہینے شہر حرام یعنی حرمت والے مہینے ہیں۔ عرب ان مہینوں میں آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کرتے تھے اور ان مہینوں کی عظمت کا خیال کر کے ان مہینوں میں مقاتلہ ومحاربہ کو حرام

قرار دیتے تھے۔ذی القعد، ذی الحجہ اور محرم کی حرمت وعظمت کے سوا ان تین مہینوں میں قتال نہ کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بیت اللہ شریف کے زائرین راہ میں دشمنوں کے خوف وخطر سے محفوظ و مامون رہیں۔ مذکورہ بالا تین مہینوں میں ماہِ محرم اگر چہ حج کے مہینوں میں سے نہیں ---- بایں ہمہ---- بہت سے زائرین حرم کعبہ کی اپنے وطن کی طرف واپسی ماہِ محرم میں ہوتی تھی ۔لہٰذا تمام زائرین کو اپنے اپنے وطن پہنچنے تک راہ کے خطرات سے محفوظ رکھنے کیلئے ماہ محرم میں بھی قتال سے بچنا ضروری تھا،تو اس حیثیت سے ماہ محرم بھی گویا حج کے مہینوں میں سے ہوگیا۔

٦ ---- **فِی الشَّھرِ الحَرَامِ** :بعض حواشی میں شہرحرام کی تفسیر ماہ رجب سے کی گئی ہے اسلئے کہ یہ وفد بارگاہِ رسالت ﷺ میں محرم کے بعد حاضر ہوا تھا۔ظاہر ہے کہ اب حرمت والے مہینوں میں سے آگے آنے والا مہینہ رجب ہی تھا---- یہ بھی ممکن ہے کہ رجب کے سوا دوسرے حرمت والے مہینوں میں کسی اور وجہ سے بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے سے معذور ہوں اور صرف رجب کے مہینے کی حاضری میں کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہ آتی ہو۔شاید اسی لئے اشھر کی جگہ شھر یعنی واحد استعمال کیا تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کوئی ایک مہینہ مراد ہے۔

٧ ---- **کُفَّارِ مُضَرَ**: مضر(میم پر پیش اور ضاد پر زیر) ایک قبیلہ کا نام ہے جو مضر بن یزار کی اولاد سے ہے اور ربیعہ کا مقابل ومحارب ہے۔

٨ ----**بِاَمْرٍ فَصْلٍ**: امر فصل اس حکم محکم کو کہتے ہیں، جو بالکل واضح ہو اور اس میں کسی طرح کا اجمال اور اشکال نہ ہو----نیز----جو حق و باطل کے مابین خط امتیاز کھینچ دے۔یہاں امر امور کا واحد ہے اوامر کا واحد نہیں۔یعنی امر سے مراد وہ نہیں جو نھی کا مقابل ہے۔بلکہ امر بمعنی شان ہے،فصل بمعنی فاصل--یا--بمعنی مفصول--یا--یہ کہ مصدر کو مبالغۃً وصف قرار دیا گیا۔

٩ ----**مَنْ وَرَآءَنَا**: الوراء کا معنی ہیں پیچھے اور کبھی آگے کے معنی میں آتا ہے۔حدیث میں دونوں کا احتمال ہے۔

١٠ ---- **فَاَمَرَھُمْ بِاَرْبَعٍ** : یہاں امر سے مراد وہی ہے جو نھی کے مقابل میں ہے جب ہی اس کے مقابلے میں نَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ فرمایا گیا ہے۔رہ گیا 'اَمْرِ فَصْلٌ'، تو وہ اس اَمْرٌ وَنَھیٌ دونوں پر مشتمل ہے۔

١١ ----**اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ**: یہی ایمان باللہ باعتبار ان ارکان کے جنکا ذکر حدیث زیر بحث میں ہے چار کے قائم مقام ہیں۔حدیث شریف میں حج کا ذکر نہیں فرمایا، اسلئے کہ

اس وقت حج فرض ہی نہیں کیا گیا تھا۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔وہ لوگ حج کی استطاعت والے نہیں تھے۔طیبی نے اس وقت حج کی عدم فرضیت ہی پر جزم کیا ہے اور قاضی عیاض سے نقل فرمایا ہے کہ انکا ارشاد ہے کہ عبدالقیس کا وفد بارگاہ رسالت ﷺ میں ۸ھ میں حاضر ہوا۔ابھی حضور ﷺ نے مکہ کی طرف خروج بھی نہیں فرمایا تھا اور حج مشہور قول کی بنیاد پر ۹ھ میں فرض کیا گیا۔قول مشہور اسلئے فرمایا کہ اکثر لوگوں کا گمان ہے کہ حج ۶ھ میں فرض کیا گیا۔لیکن پہلی بات زیادہ قوی ہے۔مذکورہ بالا توجیہہ کی بنیاد پر ان تعطوا کا شمار ان چار کے سوا میں ہوگا،اسکا ذکر اسلئے کر دیا گیا کہ وہ لوگ اہل جہاد سے تھے اور کفار مضر کے مقابل ومحارب تھے۔اس صورت میں ان تعطوا 'باربع' پر معطوف ہو جائے گا اربع کے تحت داخل نہ ہوگا۔بعض کا کہنا ہے کہ وہ چار جنکا امر دیا گیا ہے ان میں پہلا اقامت صلوٰۃ ہے۔رہ گیا شہادتین کا ذکر،تو یہ تبرکاً ہے،اسلئے کہ وہ سارے آنے والے مومنین تھے۔اس توجیہہ پر ان تعطوا کا شمار انہی چار امور میں ہوگا جن کا امر فرمایا گیا ہے۔

۱۲۔۔۔ **اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ:** ان سے جب پوچھا گیا کہ تنہا خدا پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اسکا رسول زیادہ جاننے والا ہے۔بارگاہِ نبوت میں یہ صحابہ کا ادب تھا کہ جب حضور ﷺ کچھ دریافت فرماتے،تو وہ جاننے کے باوجود، بارگاہ رسالت ﷺ میں یہی عرض کرتے۔

۱۳۔۔۔ **نَھَا ھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ** :جب انہوں نے پینے کے برتنوں کے متعلق سوال کیا تو انہیں چار برتنوں کے استعمال سے روک دیا گیا:

﴿۱﴾۔۔۔**الحَنْتم:** (بفتع الحاء المهمله وسكون النون وفتح الفوقانيه)سبز رنگ کی ٹھلیا، جس میں نبیذ بنایا کرتے تھے۔

﴿۲﴾۔۔۔ **الدُّبَاء:** (بضم الدال وتشديد الباء ممدودا) خورہ: وہ حقیقتاً کھوکھلا کیا ہوا کدو یا کدو کی شکل کا لکڑی کا بنایا ہوا برتن ہو لیکن پہلا اظہر ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔**اَلنَّقِیرُ:** لکڑی کی جڑ جسکو کھود کر اس میں نبیذ بناتے ہیں اور اسکی نبیذ تیز وتند ہوتی ہے۔

﴿۴﴾۔۔۔**المُزَفَّتُ:** (بضم الميم وتشديد الفاء المفتوحه) وہ پیالہ جس میں تارکول جیسی چیز مل دی گئی ہو، تاکہ پانی سے اسکی حفاظت ہو جائے۔

۱۴۔۔۔اب یا تو مذکورہ بالا برتنوں کے استعمال سے روکا گیا ہے تاکہ شراب پینے والوں اور شراب کے برتنوں کی مشابہت سے احتراز میں مبالغہ ہو جائے اور شراب کے آثار تک کا قلع قمع ہو

جائے۔۔۔اور یا۔۔۔ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی گئی ہے، اسلئے کہ ان برتنوں میں نبیذ تیار کرنے سے اس میں جوش کی شدت کے سبب نشہ آجاتا ہے۔اسلئے حدیث شریف میں مشک کے سوا نبیذ بنانے سے روکا گیا ہے۔اسلئے کہ مشک میں تیار کردہ نبیذ میں جوش بہت ہی ہلکا ہوتا ہے۔دوسری بات یہ بھی ہے جو نبیذ مشک میں تیار کی جائیگی۔۔۔یا۔۔۔رکھی جائیگی اسکی حالت ظاہر رہے گی بخلاف ان برتنوں میں رکھی ہوئی نبیذ کے۔اسلئے اندیشہ ہے کہ اس میں نشہ زوروں پر آجائے اور کوئی غفلت میں اسے نوش کرلے۔بظاہر یہی پتہ چلتا ہے کہ ممانعت ان برتنوں میں اسی انتباذ کی ہے۔جمہور کا کہنا ہے کہ ان برتنوں میں انتباذ (نبیذ تیار کرنے) کی تحریم عہد اسلام کے آغاز میں تھی تاکہ شراب کے آثار کا قلع قمع ہوجائے اور اسکی حرمت کی تاکید ہوجائے، پھر اس تحریم کو منسوخ کردیا گیا۔اور بعض حضرات کا قول ہے کہ تحریم اب بھی باقی ہے۔حضرت امام مالک اور امام احمد اسی طرف گئے ہیں۔

فوائد

۱۔۔۔ **عَنُ اِبُنِ عَبَّاسٍ**: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کے حقیقی چچا کے فرزند تھے۔لبابہ بنت الحرث آپکی والدہ تھیں اور ام المومنین حضرت میمونہ آپ کی حقیقی خالہ تھیں۔ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ کے وصال کے وقت آپ کی عمر شریف دس سال تھی۔ حضور ﷺ نے آپ کیلئے زیادتی علم وحکمت اور فراوانی فقہ وتاویل کی مخصوص دعا فرمائی ہے۔حضرت فاروق اعظم نے انہیں اپنے قریب کر رکھا تھا اور اجلہ صحابہ کے مابین ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آخری عمر شریف میں آپکی بینائی ختم ہوگئی تھا۔حضرت عبداللہ ابن زبیر کے عہد خلافت میں آپکا وصال ہوا۔کثیر صحابہ وتابعین نے آپ سے روایت کی ہے۔

۲۔۔۔ **وَفُدَ عَبُدِالُقَيُسِ**: قبیلہ عبدالقیس بحرین الطیب کے اطراف اور ہجر وغیرہ بستیوں میں آباد تھا۔بصورت وفد بارگاہِ رسالت میں انکی حاضری کا سبب یہ بنا کہ منقذ ربن حبان جو اس قبیلے سے تھے، مدینہ شریف بغرض تجارت آئے۔حضور ﷺ انکے پاس سے گزرے تو انکے پاس کھڑے ہوکر انکی قوم کے اشراف کا نام لے کر ان سب کا حال دریافت فرمانے لگے۔سرکارِ رسالت ﷺ کی اس بصیرت اور قوت غیب دانی کو دیکھ کر انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔اور پھر سورۃ فاتحہ اور **اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ** کی تعلیم حاصل کرلی۔پھر وہ اپنے وطن ھجر کی طرف روانہ ہوگئے اور حضور ﷺ کا

اشراف قوم کے نام ایک مکتوب بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ چند دن مکتوب کو چھپائے رکھا اور کسی پر ظاہر نہیں کیا، لیکن جب آپکی زوجہ نے آپکو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کیلئے وضو وغیرہ کرتے دیکھا، تو یہ ناگوار لگا اور انہوں نے آپکے والد منذر سے اسکا ذکر کردیا۔ والد بزرگوار کچھ دیر تک تو کشمکش میں رہے۔

۔۔۔المختصر۔۔۔غور وفکر کے بعد باپ نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اور وہ حضور ﷺ کا مکتوب لے کر اپنی قوم میں لے گئے، انہیں پڑھ کر سنایا، تو سب کے سب مسلمان ہو گئے اور اس بات پر اتفاق کیا کہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضری دینی چاہئے، تو ان میں سے چودہ سوار اس کام کو انجام دینے کیلئے تیار ہو کر مدینہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ مدینے میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ امورِ غیبیہ کے ادراک کیلئے قوت قدسیہ رکھنے والے نبی کریم ﷺ نے حاضرین مجلس کو خبر دے دی کہ تمہارے پاس عبدالقیس کا وفد آرہا ہے، جو مشرق کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں اشج بھی ہے (جنکا نام منذر ہے) حضور ﷺ نے ان کو اشج اسلئے فرمایا کہ انکے چہرے پر زخم کا نشان تھا۔۔۔الغرض۔۔۔نگاہ نبوت انکے چہرے کے نشانات کو بھی دیکھ رہی تھی۔

ان حقائق نے واضح کردیا کہ حضور ﷺ نے من القوم، یا من الوفد سے جو سوال کیا تھا یہ کچھ لاعلمی کی بنیاد پر نہ تھا۔۔۔بلکہ۔۔۔یہ سوال وجواب محض لوگوں کو سنانے کیلئے تھا، تا کہ حاضرین کے سامنے ان آنے والوں کے تعلق سے جو کچھ حضور ﷺ فرما چکے تھے، ان آنے والوں کی زبان سے بھی اسکی تصدیق ہو جائے۔ اور اگر قالوا ربیعه کا یہ مطلب لیا جائے، کہ حضور ﷺ کے سوال پر بعض صحابہ نے یہ عرض کیا کہ حضور ﷺ یہ آنے والے ربیعہ ہیں، یہ خواہ انہوں نے اپنے سابقہ تعارف کی بنا پر کہا ہو یا ان آنے والوں سے دریافت کرنے کے بعد عرض کیا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے ان آنے والوں کے متعلق ان کے آنے سے پہلے جو خبر دی تھی وہ بالکل سچی تھی۔۔۔پوچھنے کیلئے لاعلمی ضروری نہیں۔۔۔رب تبارک وتعالی نے پوچھا کہ:

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿۱۷﴾ ﴿سورۃ طٰہٰ:۱۷﴾۔۔۔۔۔۔۔۔اے موسی! تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے

۔۔۔تو کیا رب کو معلوم نہ تھا؟۔۔۔معلوم ہوا کہ بعض سوال لاعلمی کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ اسکے پیچھے کوئی اور حکمت ومصلحت ہوتی ہے۔

۳۔۔۔**وَلَا نَدَامٰى**: قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ ندمان بامعنی نادم کی جمع ہو، ویسے غیر قیاسی طور پر اسے نادم کی جمع قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ نادم کی قیاسی جمع 'نادمین' آتی ہے۔ یہ کلمات دعائیہ ہیں یا خبریہ۔۔۔پہلی صورت میں معنی یہ ہوا کہ خدا کرے کہ تمہیں کبھی رسوائی وشرمندگی نہ ہو۔

اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوا کہ اچھا ہوا کہ تم خوشی سے اسلام لاکر حاضر ہوگئے۔ ورنہ کچھ عرصہ بعد لشکر اسلام تمہارا ملک فتح کرتا پھر تمہیں شرمندگی ورسوائی ہوتی۔ اب عزت سے ایمان لے آئے۔

۴۔۔۔**اِلَّافِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ**: ان مہینوں میں قتال سے ممانعت آغاز اسلام میں تھی پھر اسے آیۃ کریمہ۔۔۔ **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ** سے منسوخ کردیا گیا۔

۵۔۔۔**بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ**: قبیلہ عبدالقیس کیلئے مدینہ کا جوراستہ تھا اس پر قبیلہء مضر آباد تھے مضر جسکے نام پر قبیلے کا نام ہے وہ ربیعہ کا بھائی تھا۔

۶۔۔۔**فَمُرْنَا بِاَمْرٍ**: امر بمعنی شان ہے اس میں باءصلہ کا ہے اور تنکیر تعظیم کیلئے ہے یہ امر امور کا واحد ہے اور اس سے لفظ کا معنی ومورد مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق امر، اوامر کا واحد ہے بمعنی القول الطالب للفعل ۔۔۔ ایسا فعل جو طالب قول ہو۔ اس صورت میں تنکیر تقلیل کیلئے اور باء استعانت کیلئے ہوگی اور اس سے مراد 'لفظ' ہوگا۔ اور مامور بہ محذوف ہوگا۔ اس صورت میں حاصل کلام یہ ہوگا: مُرْنَا نَعْمَلُ بِقَوْلِكَ آمِنُوْا اَوْ قُوْلُوْا آمَنَّا یعنی آپ اپنے ارشاد آمنو۔۔۔یا۔۔۔ قولوا آمنا کے ذریعے ہمیں حکم دیجئے تاکہ ہم عمل کریں۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ آپ ﷺ ہمیں حکم دیں کہ ہم آپکے ارشاد آمنو۔۔۔یا۔۔۔ قولوا آمنا پر عمل کریں۔ اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر امر بمعنی شان نہ ہوتا، بلکہ 'بمعنی قول طالب' ہوتا تو حدیث کے راوی یہ نہ فرماتے کہ 'امرھم بالایمان ۔۔الخ' اسلئے کہ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امر بمعنی شان ہے، نہ کہ بمعنی قول طالب۔ ورنہ راوی حدیث یوں روایت کرتے کہ 'قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لَهُمْ آمِنُوْا اَوْ قُوْلُوْا آمَنَّا' یعنی حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ایمان لاؤ۔۔۔یا۔۔۔ آمنا کہو۔

۷۔۔۔**فَصْلٍ**: اسکا معنی جہاں فاصل ومفصول ہوسکتے ہیں وہیں یہ بھی امکان ہے کہ اسکا معنی مفصل ہو۔ حضور ﷺ نے ایمان کی اسکے ارکان خمسہ کے ساتھ تفصیل بیان فرما کر انکی اس خواہش کی تکمیل فرمادی۔

۸۔۔۔**مَنْ وَرَآءَنَا**: یعنی ہماری قوم کے وہ لوگ جو ہمارے پیچھے ہیں، جنہیں اپنے گھروں میں چھوڑ آئے ہیں۔۔۔یا۔۔۔ وہ لوگ جو بعد میں آنیوالے ہیں اور ہمیں پانے والے ہیں۔

۹۔۔۔**نَدْخُلُ بِهٖ**: یعنی آپکے امر کو قبول کر لینے اور اس پر عمل کرنے کے سبب۔۔۔یا ۔۔۔اسکی خبر غیر موجود افراد قوم تک پہنچانے کے سبب۔

۱۰۔۔۔**نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ**: فائزین کے ساتھ۔۔۔یا۔۔۔ نجات پانے والوں کے

ساتھ۔ جنت کا دخول اللہ کے فضل وکرم سے وابستہ ہے۔ لیکن عمل صالح اسکا سبب ہے جیسے کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے اور بھوک اللہ کے فضل سے مٹتی ہے اسلئے اللہ پر کچھ واجب نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہاں جنت سے درجات جنت مراد ہیں۔ اسلئے کہ درجات اعمال کے مقابلے میں ہیں اور دخول جنت فضل وکرم سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔ حدیث شریف میں ہے۔

لَنۡ یَّدۡخُلُ الۡجَنَّۃَ اَحَدٌ مِنۡکُمۡ بِعَمَلِہٖ ۔۔۔ تم میں کا کوئی اپنے عمل سے جنت میں ہرگز ہرگز داخل نہ ہوگا ۔۔۔۔ اس حدیث سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ عمل دخول جنت کیلئے سبب مستقل نہیں۔ چنانچہ جب حضور ﷺ سے پوچھا گیا:

وَلَا اَنۡتَ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ ۔۔۔۔ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ بھی اپنے عمل کے سبب جنت میں نہ جائینگے؟ ۔۔۔۔ آپ ﷺ نے جواب مرحمت فرمایا:

وَلَا اَنَا اِلَّا اَنۡ یَتَغَمَّدَنِی اللّٰہُ بِرَحۡمَتِہٖ ۔۔۔ ہاں میں بھی نہیں لیکن یہ کہ اللہ اپنی رحمت میں مجھے ڈھانک لے ۔۔۔۔ لہٰذا جن ارشادات الٰہیہ میں جنت کا سبب اعمال کو قرار دیا گیا ہے وہاں مراد سبب مستقل نہیں بلکہ عمل جنت کیلئے ایسا ہی سبب ہے جیسے پانی پیاس بجھانے اور کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے۔ کہ یہ ظاہری سبب ہے نہ کہ حقیقی ولازمی ۔۔۔۔ حدیث کی مذکورہ بالا توجیہہ کی روشنی میں اس حدیث کا آیۃ کریمہ:

وَتِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ ﴿سورۃ الزخرف:۷۲﴾

یہ جنت جس کا میں نے تمہیں وارث بنایا ہے، یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے

یعنی تمہارے اعمال وراثت جنت کے ظاہری اسباب ہیں

۔۔۔۔ سے کوئی تعارض نہیں رہ جاتا۔ آیت وحدیث کے مابین تعارض اٹھانے کیلئے بہت سے جوابات دیئے گئے ہیں جن میں چند یہ ہیں:

﴿۱﴾ ۔۔۔ آیت میں 'باء' ملابست کیلئے ہے۔۔۔۔ معنی یہ ہیں:

اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا مُلَابَسَۃً لِّاَعۡمَالِکُمۡ اَیۡ لِثَوَابِهَا

ہم نے تمہیں جنت کا وارث بنایا درآنحالیکہ وہ تمہارے اعمال کے ثواب سے ملی ہوئی ہے

۔۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ ملابست اور چیز ہے اور سببیت اور چیز ۔۔۔۔ یا یہ کہ ۔۔۔۔ 'باء' مقابلہ کیلئے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ بعتہ بدرھم ۔۔ میں نے اسے درہم کے بدلے میں بیچ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ درہم اس فروخت کردہ چیز کے حصول کا حقیقی ولازمی سبب نہیں، بلکہ ظاہری سبب ہے، جسکا سبب بننا بائع و مشتری کے ارادے اور انکی رضا پر موقوف ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔آیت میں جنت سے مراد جنت عالیہ ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔آیت میں جنت سے مراد درجات جنت ہیں، جو درجات عمل سے حاصل ہوتے ہیں اور دخول فضل سے۔

﴿۴﴾۔۔۔امام نووی فرماتے ہیں، کہ دخول عمل کے سبب ہے اور عمل اللہ کی رحمت سے ہے۔ امام موصوف کا یہ قول صراحت حدیث کے خلاف نہیں، اسلئے کہ اس حدیث کے عمل کے سبب مستقل ہونے کی نفی کی گئی ہے اور رحمت پر سارا دارومدار رکھا گیا ہے۔اور اس توجیہہ میں بھی رحمت ہی پر سارا دارومدار ہے، بغیر اسکے عمل کا وجود ہی نہ ہوگا، جنت میں داخل ہونا تو بڑی بات ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ حدیث میں خاص طور پر انکار مقصود ہے، جو یہ لحاظ کئے بغیر کہ انکے اعمال بھی اللہ کی رحمت سے ہی ہیں، صرف اپنے اعمال کو دخول جنت کیلئے کافی تصور کرتے ہیں۔

﴿۵﴾۔۔۔حدیث شریف سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عمل کا، دخول جنت کا سبب نہ ہونا، خدا کا عدل ہے اور اسکا دخول جنت کا سبب ہونا، خدا کا فضل ہے۔تو اب جہاں جہاں جنت کو عمل کا بدلہ قرار دیا گیا ہے وہ 'علی طریق الافضل' ہے اور جہاں جہاں عمل کو بدلہ نہیں قرار دیا گیا ہے وہ (علی وجہ العدل) ہے۔

۱۱۔۔۔**فَـامَرَهُمْ** : باربع ای باربع خصال : چار خصلتوں کا انہیں حکم دیا۔تنبیہ کرتے ہوئے اس بات پر کہ یہ خصلتیں نہایت اہم اور تحصیل کمال میں کامل واکمل ہیں۔

وَنَهاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَیْ اَرْبَعَ خِصَالٍ۔۔۔۔اور انہیں چار خصلتوں اور عادتوں سے روکا ۔۔۔۔اور یہ اصناف ظروف کے اعتبار سے پینے کی قسمیں ہیں۔

۱۲۔۔۔**اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ**: یعنی ذات میں واحد، صفات میں منفرد، اور افعال میں لاشریک۔اسے محض تمہیداً ذکر کیا ہے اسلئے کہ امر ونہی تکالیف شرعیہ کے فروغ سے ہے اور تکلیف شرعی ایمان پر موقوف ہے، اسلئے کہ ایمان اسکی صحت کی شرط اور اسکے ثبوت کا مبداء ہے۔

۱۳۔۔۔**قَالَ اَتَدْرُوْنَ**۔۔۔الخ :تنبیہاً اسے ذکر کیا تاکہ لوگ ہر طرف سے خالی الذہن ہوکر یکسوئی خیال کے ساتھ ان امور کے حفظ وضبط کیلئے تیار ہوجائیں اور بات کو دل کی گہرائیوں تک لے جانے کیلئے آمادہ ہوجائیں۔

۱۴۔۔۔**اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ**: معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو اللہ سے ملا کر دونوں ہستیوں کیلئے ایک صیغہ استعمال کر سکتے ہیں۔یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو بہت علم بخشا ہے۔

۱۵۔۔۔**شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ**: ایمان باللہ

کی تفسیر میں رسالت کا ذکر فرما کر واضح کر دیا، کہ بغیر رسالت پر ایمان لائے ہوئے خود اللہ پر ایمان صحیح نہیں ہوسکتا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔رسالت پر ایمان کچھ ایمان باللہ سے الگ نہیں ہے۔ذہن نشین رہے کہ یہاں شہادت سے مراد دل کی گواہی ہے، یعنی ماننا اور قبول کرنا، ورنہ زبانی اقرار ایمان کا جزو نہیں، بلکہ احکام اسلامی جاری ہونے کی شرط ہے۔

۱۶۔۔۔۔**وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ**۔۔۔الخ: اظہر یہی ہے کہ اقام، ایتاء اور صیام کو مجرور (زیر کے ساتھ) پڑھا جائے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے جس طرح ایمان کا حکم دیا اسی طرح اقام الصلوۃ وغیرہ کا بھی حکم دیا۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔اقام الصلوۃ وغیرہ ایمان کی تفسیر نہیں۔

۱۷۔۔۔۔طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث زیر شرح میں دو اشکال ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔حدیث میں مامور بہ صرف ایک ہے نہ کہ چار۔رہ گئے ارکان، تو وہ اسی ایک مامور بہ کی تفسیر ہیں جس پر أتدرون ماالایمان کا ارشاد دلالت کرتا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ارکان پانچ ذکر کئے گئے ہیں اور آغاز کلام میں صرف چار ارکان کے ذکر کی بات ہے۔

پہلے اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ایمان کو اسکے اجزاء مفصّلہ کی طرف نظر کرتے ہوئے چار قرار دیا گیا ہے اور دوسرے اشکال کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہاں ذکر شہادتین مقصود نہیں، اسلئے کہ یہ قوم ایمان والی اور شہادتوں کا اقرار کرنے والی تھی۔انکا قول، اللّٰہ ورسولہ اعلم جس پر شاہد عدل ہیں۔

بخاری کی ایک روایت سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے جسکے الفاظ یہ ہیں کہ:

اَمَرَھُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَھَاھُمْ بِاَرْبَعٍ اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَالزَّکٰوۃَ وَصُوْمُوْا رَمَضَانَ وَاَعْطُوْا خُمُسَ مَاغَنِمْتُمْ وَلَا تَشْرَبُوْا فِی الدُّبَاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالنَّقِیْرِ وَالْمُزَفَّتِ

انہیں چار حکم دیئے اور چار سے روکا۔نماز قائم کرو، زکوۃ دیتے رہو، رمضان کا روزہ رکھتے رہو، مال غنیمت کا پانچواں حصہ دیتے رہو اور دباء، حنتم، نقیر اور مزفت میں مت پیو۔یہ روایت تمام اشکالات کو دور کر دیتی ہے اور تمام تاویلات کا مرجع ہے۔

۱۸۔۔۔۔سید جمال الدین کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اشکال سے خالی نہیں، اسلئے کہ اگر اقام الصلوٰۃ۔۔۔الخ۔شہادت پر معطوف قرار دے کر مرفوع پڑھا جائے، تو سارا مجموعہ ایمان کی تفسیر کے تحت آجائیگا، پھر تین باقی کہاں رہے اور اگر بالایمان پر معطوف قرار دے کر مجرور پڑھا جائے، تو مذکورہ پانچ ہوجائینگے، نہ کہ چار۔تقدیر اول پر یہ جواب دیا گیا ہے، کہ باقی تین کو راوی نے اختصاراً۔۔۔۔یا۔۔۔۔نسیاناً حذف کر دیا ہے اور تقدیر ثانی پر یہ جواب پیش کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اسکے مطابق اولاً چار کا ذکر فرما دیا، اور پھر خاص طور پر انکے حال کے پیش نظر پانچویں یعنی اداء

خمس کا اضافہ فرمادیا، اسلئے کہ وہ اہل جہاد وارباب غنائم تھے۔سب سے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مجرور پڑھا جائے اور عطف کے ذریعے ان مجرورات اربعہ ہی کو مامورات قرار دیا جائے۔

رہ گیا ذکر ایمان، تو یہ صرف اسلئے ہے کہ اسکے فضل وشرف کا اظہار ہوجائے اور پتہ چل جائے کہ ایمان کی حیثیت بنیادی واساسی ہے،خواہ وہ مومن ہو یا مرتد۔اس صورت میں اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ سے لیکر آخر شہادتین تک جملہ معترضہ کی طرح ہوجائے گا اور تقدیر عبارت یہ ہوجائیگی اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ ایضاً انہیں، ان چاروں امور کے سوا ایمان کا بھی حکم دیا۔تمام اہلسنّت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ارکان، ایمان کے اجزاء سے نہیں ہیں۔۔نیز۔۔بخاری کی سابقہ روایت دونوں سے اس بات کی تائید ہورہی ہے۔

۱۹۔۔۔**وَنَهَاهُمْ**۔۔۔الخ: مطلقاً ان برتنوں کے استعمال کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے، بلکہ اس میں خشک کھجور بھگونے اور اس سے نشہ والی چیز پینے سے روکا گیا ہے۔اب خصوصیت کے ساتھ حکم کی نسبت انکی طرف کرنے کی چند وجہیں ہوسکتی ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔وہ لوگ عادۃً ان برتنوں کو مسکرات ہی میں استعمال کرتے تھے۔

﴿۲﴾۔۔۔یہ ایسے برتن ہیں جن میں نہ باہر کی ہوا نفوذ کرسکتی ہے، اور نہ اس سے پانی کا ترشح ہو پاتا ہے۔تو جو چیز اس میں بھگوئی جائے گی، اس میں جوش بہت زیادہ آجائے گا، تو ممکن ہے قلیل زمانے ہی میں وہ نشہ میں تبدیل ہوجائے۔

﴿۳﴾۔۔۔یہ ظروف شراب ہی کیلئے مخصوص تھے، لہٰذا ان میں شراب کے اثرات موجود تھے ۔۔۔یا۔۔۔انکے استعمال سے شراب خمر سے مشابہت ہوجاتی تھی۔چنانچہ جب ایک مدت گزر گئی شراب کے اثرات زائل ہوگئے اور شراب خمر سے مشابہت کا سوال اٹھ گیا، تو حضور ﷺ نے ان ظروف کے استعمال کو مباح فرمادیا۔شروع شروع میں ہر شے کی تحریم میں بڑی شدت اختیار کی جاتی ہے اور بہت مبالغہ فرمایا جاتا ہے، تاکہ لوگ اس سے بالکل کنارہ کش ہوجائیں اور جب معاملہ مستقر ہوجاتا ہے تو مقصود کے حصول کے بعد شدت زائل ہوجاتی ہے۔

۲۰۔۔۔**اَخْبِرُوْا بِهِنَّ**: یعنی عامل باعمل بھی بنو اور معلم بھی اور کامل بھی اور کامل کرنے والا بھی۔معلوم ہوا کہ تبلیغ کیلئے کامل عالم ہونا شرط نہیں، جو صحیح مسئلہ معلوم ہو، اسکی تبلیغ کرے۔یہ بھی پتہ چلا کہ حرام سے بچنے کیلئے اسباب حرام سے بچنا ضروری ہے۔

۲۱۔۔۔**مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ**: ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کی ہے۔الفاظ حدیث بخاری کے ہیں۔مسلم نے اسی کے ہم معنی روایت کی ہے، تو اس اعتبار سے یہ حدیث متفق علیہ ہوگئی۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَوْلَهُ عَصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِیْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰی مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فِی الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَهُوَ عَلَيْهِ اِلَی اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَآءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰی ذٰلِكَ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ﴾

حضرت عبادہ ابن صامت سے روایت ہے: انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جماعت صحابہ کو جو آپ کے گرد جمع تھے، مخاطب کر کے فرمایا کہ اس امر پر مجھ سے بیعت کرو۔ یعنی میرے سامنے اس بات کا عہد کرو کہ تم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، کسی پر خود ساختہ بہتان نہ باندھو گے اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پس جس شخص نے تم میں سے اپنے اس عہد کو پورا کیا، اسکا اجر خدا کے ذمہ کرم میں ہے اور جو ان میں سے کچھ کر بیٹھا اور دنیا میں اسکو اسکی سزا مل گئی، تو یہ سزا اسکا کفارہ ہے اور جو ان میں سے کچھ کر بیٹھا پھر رب نے اسکی پردہ پوشی کی، تو اس کا معاملہ خدا کے دست قدرت میں ہے، وہ خواہ اسکو معاف فرما دے یا سزا دے۔ حضرت ابو عبادہ فرماتے ہیں: چنانچہ ہم سب لوگوں نے اس پر بیعت کی، یعنی حضور کے سامنے اسکا عہد کیا۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔ **عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ:** آپ انصار کے نقباء سے تھے۔عقبہ اولیٰ، عقبہ ثانیہ، اور بدر، ہر جگہ شریک رہے۔طویل وجسیم اور حسین وجمیل تھے۔قرآن کریم کے جمع کرنے والوں میں ایک آپ بھی تھے۔قاضی ومعلم کی حیثیت سے حضرت فاروق اعظم نے آپ کو شام روانہ فرمایا۔

۲۔۔۔ **عَصَابَةٌ**۔۔۔الخ: (بکسر العین) مردوں۔۔۔یا۔۔۔گھوڑوں۔۔۔یا۔۔۔ پرندوں کی جماعت، ۱۰ سے ۴۰ تک کی جماعت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ عصبه (بضم العین) کا اطلاق مردوں، گھوڑوں، پرندوں کی جماعت، ۱۰ سے ۴۰ تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔یہ عصب سے ماخوذ ہے، جسکے معنی لپیٹنا، موڑنا، بٹنا، باندھنا۔

۳۔۔۔ **بَايِعُوْنِي:** مبایعت عہد کرنے اور گرہ باندھنے کو کہتے ہیں۔اسکی اصل بیع ہے بیعت اسکا اسم مرۃ ہے (یعنی ایسا مصدر جو ایک مرتبہ فعل کے واقع ہونے کو ظاہر کرے، ثلاثی مجرد سے اسم مرۃ کا وزن فعلة بفتح الفاء وسکون العین وفتح الام کے وزن پر آتا ہے) اس عہد و پیمان کو بیعت اسلئے کہتے ہیں کہ گویا دو عہد کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے کو دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اسلئے جس طرح وجوب بیع کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی عادت رائج ہے، اسی طرح اس قسم کے عہد و پیمان میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کا معاملہ درج ہے۔

۴۔۔۔ **اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا**۔۔۔الخ: ظاہر یہ ہے کہ یہاں شرک سے مراد ریاء ہے، اسلئے کہ وہ شرک اصغر ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

'اِتَّقُوْا الشِّرْكَ الْاَصْغَرَ قَالُوْا وَمَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الرِّيَاءُ'

'شرک اصغر سے بچو۔عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ یہ شرک اصغر کیا ہے؟ ارشاد فرمایا ریاء'

۔۔۔ سیاق کلام دلالت کر رہا ہے، کہ یہ کلام صحابہ کرام سے ہے۔لہٰذا یہاں شرک سے ریاء ہی مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔اس بات کا بھی احتمال ہے کہ شرک سے عبادت اصنام مراد ہو۔۔۔ای لا ترتدوا بعد الاسلام ۔۔۔اب اسلام قبول کر لینے کے بعد مرتد نہ ہو جانا۔۔۔بلکہ ارتداد سے اپنے کو بچاتے رہنا۔

۵۔۔۔۔ **وَلَا تَاْ تُوْابِبُھْتَانٍ**: بھتہ بھتاً وبُھتاً وبُھتاناً۔کسی پر ایسا الزام رکھنا جس سے وہ بری ہو۔۔۔۔بلفظ دیگر۔۔۔۔کسی کے متعلق ایسی بات کہنی جو اس نے نہ کی ہو۔

۶۔۔۔۔**تَفْتَرُوْنَہٗ**: افتری الکذب اختلقہ۔جھوٹ گڑھنا،افتراء کرنا،تہمت لگانا۔

۷۔۔۔۔**بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَاَرْجُلِکُمْ**: اَیْ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ وَالنَّاسُ بَرَاءٌ ۔یعنی اپنی طبیعت سے،اپنی طرف سے خود ساختہ،درآنحالیکہ لوگ اس سے بری ہوں۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔بہتان وافتراء اسی کو کہیں گے جسے ازخود پیدا کیا جائے اور لوگ اس سے پاک ومبرا ہوں۔یہاں مذکورہ صورت میں ید اور رجل (ہاتھ اور پیر) ذات سے کنایتاً ہوجائیں گے۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔بین ایدیکم وارجلکم سے دل مراد ہو،اسلئے کہ دل انسانی سینے میں ہاتھوں اور پیروں کے درمیان میں ہے۔

اب معنی یہ ہوگا جسے گمان فاسد کی بنیاد پر تمہارے ضمیر اور تمہارے دل نے گڑھا ہے۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔ہاتھ اور پیر کی طرف افتراء کی نسبت اسلئے کی گئی ہے کہ اکثر اور بیشتر کام ہاتھوں اور پیروں کے ذریعے ہوتے ہیں،اگرچہ تمام اعضاء،اس میں کچھ نہ کچھ دخل رکھتے ہیں۔مذکورہ بالا تینوں توجیہات کا حاصل ومآل ایک ہی ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔یہ کہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان معنی پیدا کرنا یہ ہے کہ اسکو لوگوں کے سامنے آشکارا کریں اور بے حیائی اور بے مروتی کو داد دیں۔عورتوں کی مبایعت میں بھی یہ عبارت واقع ہے۔اسکی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔

﴿۱﴾۔۔۔غیر شوہر کے بچوں کو اپنے شوہروں کی طرف منسوب نہ کریں۔

﴿۲﴾۔۔۔ بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَاَرْجُلِکُمْ سے مراد شرمگاہ ہے۔

۸۔۔۔۔ **فِیْ مَعْرُوْفٍ**: معروف ہر وہ امر ہے جسکا چہرہ یعنی جسکا وجود شرع میں پہچانا جا چکا ہو۔یعنی امر مشروع اسکا مقابل منکر ہے،یعنی جسکا وجود شرع میں پہچانا نہ گیا ہو،یعنی امر غیر مشروع تو امر معروف اسی شخص کی طرح ہوگیا جس سے تعارف ہوچکا ہو،اور امر منکر اس شخص کی طرح ہوگیا جو غیر متعارف ہے۔

۹۔۔۔۔ **فَمَنْ وَفٰی**: اس میں اشارہ ہے کہ وجوب اجر اسی صورت میں ہے،جب ان تمام پر عمل کیا جائے۔تو جس نے اس میں سے کسی کو بھی چھوڑا وہ عذاب کا مستحق ہوگیا۔

۱۰۔۔۔۔**وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِکَ شَیْئًا**: کہا گیا کہ من ذلك اشارہ ہے ماسبق کی طرف،مشرک کے سوا،اسلئے کہ شرک معاف نہیں کیا جائے گا،اور قتل سے کوئی کافر نہیں ہوتا۔یہ اس صورت میں ہے جب شرک سے مراد کفر ہو،اور اگر شرک سے مراد ریاء ہو تو عقوبت سے مراد عام

ہوگی، خواہ اس پر حد شرعی ہو یا نہ ہو، اسلئے کہ ریاء کیلئے کوئی حد نہیں۔

۱۱۔۔۔ **فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ:** تو اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا، خواہ وہ اسے معاف کردے خواہ عذاب میں مبتلا فرمائے۔ یہی مذہب اہلسنّت والجماعت ہے۔ معتزلہ کے نزدیک عاصی کو سزا دینا واجب ہے، اسکی عفو ومغفرت نہ ہوگی۔ یہ حدیث ان پر حجت ہے۔۔۔ الغرض۔۔۔ رب تبارک وتعالی نے جس مجرم کے گناہوں کی پردہ پوشی کی، اور اسکا گناہ ظاہر نہیں ہوا اور پھر اسپر حد نہ لگائی جاسکی، اسکا معاملہ خدا کے دست قدرت میں ہے۔ نہ تو اسپر خدا کا عقاب لازم ہے اور نہ اسکی عفو ومغفرت واجب۔

۱۔۔۔ **عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ:** (بضم العين وتخفيف الموحدة) آپ کا اسم شریف عبادۃ اور کنیت ابوالولید انصاری تھی۔ مرقات کی تشریح کے مطابق عقبہء اولیٰ اور ثانیہ کے سوا عقبہء ثالثہ (تیسری بیعت عقبہ) میں بھی آپ شریک تھے۔ یونہی غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات میں آپکی شرکت رہی۔ جب حضرت عمر نے آپکو شام کا قاضی مقرر فرمایا، تو آپکا قیام حمص میں رہا پھر وہاں سے منتقل ہوکر فلسطین آگئے اور مقام رملہ میں قیام فرمایا اور پھر وہیں وصال ہوگیا۔ ایک قول کے مطابق آپکا وصال بیت المقدس میں ہوا۔ سن وصال ۳۴ھ ہے۔ اس وقت آپکی عمر شریف ۷۲ سال کی تھی۔ آپ سے صحابہ وتابعین کی کثیر جماعت نے حدیثیں روایت کیں۔

۲۔۔۔ **بَايِعُوْنِيْ:** طاعت کے مقابلے میں حصول ثواب کی تشبیہ عقد بیع سے دی گئی ہے، جس میں مال کا مقابلہ مال سے ہوتا ہے، اسلئے کہ جس طرح بیع کرنے والا اپنے مال کو خریدنے والے کے سپرد کردیتا ہے، گویا اسی طرح بیعت کرنے والا اپنے نفس کو اور اپنی طاعت کو اپنے خریدار کی بارگاہ میں پیش کردیتا ہے۔۔۔ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

اللہ نے مومنین کی جان ومال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا۔ ﴿سورۃ التوبۃ: ۱۱۱﴾

۔۔۔ اس آیت میں بھی بیع وشراء سے اسی عہد وپیمان کی طرف اشارہ ہے، لفظ بايعونى سے جسکی نشاندہی کی جارہی ہے۔

حدیث شریف میں جس بیعت کا ذکر ہے، وہ بیعت تقوی ہے، یعنی آئندہ شرک، چوری، زنا، بہتان طرازی، وغیرہ سے بچتے رہنے کا عہدو پیمان۔۔۔الغرض۔۔۔اس بیعت سے بیعت اسلام مرادنہیں۔اسلئے کہ صحابہء کرام بیعت اسلام توپہلے ہی کر چکے تھے۔آج کل جومشائخ کے ہاتھوں پر بیعت تقوی کی جاتی ہے، اسکی اصل یہ حدیث ہے۔حضور ﷺ نے صحابہ سے جہاد پر بھی بیعت لی ہے۔

۳۔۔۔۔چوری، زنا، قتل اولاد، بہتان طرازی وغیرہ عیوب، عرب میں زیادہ رواج یافتہ تھے۔ یہاں تک کہ زنا اورلڑکیوں کوزندہ درگور کردینے پر فخر کیا کرتے تھے۔اسی لئے حضور ﷺ نے انکی تاکیدی ممانعت فرمائی۔ بہتان سن کربھی لگایا جاتا ہےاور گڑھ کربھی۔مگر بہتان گڑھنے میں زیادہ گناہ ہے، اسلئے 'تفترونہ' کی قیدلگادی۔

۴۔۔۔۔**تَفۡتَرُوۡنَہٗ:** عہد جاہلیت میں بعض عورتیں نومولود پھینکے ہوئے بچوں کواٹھالیتیں ۔۔۔۔یا۔۔۔۔دوسرے سے بچے حاصل کرلیتیں اوراپنے شوہروں سے یہ کہتیں کہ یہ تمہارا بیٹا ہے، جو میرے بطن سے پیدا ہوا ہے۔اس میں دوافتراء ہیں۔ایک افتراء تواپنے بطن پر ہے کہ اس نے اپنے اندراسے رکھااوردوسراافتراءاپنی شرمگاہ پر ہے کہ اس نے اسے جنا۔ پہلا بہتان جس پر باندھا (بطن) وہ ہاتھوں کے درمیان ہےاوردوسرا بہتان جس پر باندھا (شرمگاہ) وہ پیروں کے درمیان ہے۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔ بین ایدیکم وارجلکم، کی مذکورہ بالاتوجیہ بھی کی جاسکتی ہے۔دوسری توجیہیں جواہر پارے میں گزرچکیں۔ جواہر پارے میں مذکورہ بالاتوجیہ کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، یہاں کسی قدر وضاحت کردی گئی ہے۔

۵۔۔۔۔**فَمَنۡ وَفٰی مِنۡکُمۡ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ** :یہاں اجر سے مراد اجر کامل ہے۔اس صورت میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جن جن امور پرعہدو پیمان لیا گیا ہے، جب تک ان سب پر عمل درآمد نہ ہوگا، اجر کامل نہیں مل سکتا۔ اسکے برعکس ان میں سے کسی ایک کوترک کردینا، عتاب و عذاب کا مستحق بنادیتا ہے۔ یہاں اجر سے مطلق اجر مرادنہیں، اسلئے کہ کسی فرمان کی بجا آوری یا کسی گناہ سے اجتناب کا اجر کسی دوسرے عمل خیر پر موقوف نہیں۔بعض گناہوں سے توبہ کرنا صحیح ہونا ہی مذہب صحیح ہے،جس سے مذکورہ بالاحقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ہاں خوارج بعض گناہوں سے توبہ کرنے کوصحیح نہیں قراردیتے۔فاجر علی اللّٰہ سے اشارۃ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ان اطاعتوں کا بدلہ دنیاہی میں لوگوں سے نہ چاہو، اخلاص اختیار کرو، انشاءاللہ دنیاوآخرت میں اجر پاؤ گے۔

۶۔۔۔۔**وَلَا تَعۡصُوۡا فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ**: یہ ذہن نشین رہے کہ حضور ﷺ جوبھی حکم دیں وہ

اچھا ہے۔ نماز چھوڑنے کا حکم دیں، تو اس وقت نماز حرام ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے احکام کی اطاعت مطلقاً واجب ہے۔ یہاں معروف کی قید حضور ﷺ کیلئے واقعی ہے اور دوسروں کیلئے احترازی، کیونکہ بری بات میں بادشاہ وغیرہ کسی کی اطاعت نہیں۔

۷۔۔۔۔ **کَفَّارَۃٌ لَّہٗ**: ایک نسخہ میں طھور (بفتح الطاء) کا لفظ زائد ہے۔ یعنی وہ حد یا عتاب اس گناہ کو مٹادے گا اور اسکی وجہ سے آخرت میں اسے سزا نہ دی جائیگی۔ اکثر علما نے اسی حدیث سے اس مسئلے کو استخراج کیا ہے کہ حدود کفارہ ہیں۔ وہ حدیث جس میں ارشاد ہے:

'لَا اَدْرِیْ اَلْحُدُوْدُ کَفَّارَاتٌ اَمْ لَا'۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں

۔۔۔ اسکا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث 'لا ادری' زیر شرح حدیث کفارہ سے پہلے کی ہے، اسلئے کہ حدیث 'لَا اَدْرِیْ' میں علم کی نفی ہے، اور اس حدیث میں اسکا اثبات ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ حدود اور تعزیرات گناہ کا کفارہ بن جاتے ہیں، جسکے بعد اس جرم کی سزا انشاء اللہ آخرت میں نہ ملے گی۔ بعض نے فرمایا: یہ سزائیں حق عبد کا کفارہ ہیں۔ رہ گیا حق اللہ، تو وہ توبہ ہی سے معاف ہوگا۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿سورۃ الحجرات:۱۱﴾

۔۔۔۔ مگر یہ حق ہے کہ مجرم کا اپنے کو سزا کیلئے پیش کر دینا ہی توبہ اور کفارہ ہے۔ اس کم فہم ناچیز کا خیال ہے کہ اگر مجرم اپنے کو خود سے برضا و رغبت سزا کیلئے پیش کر دے، پھر تو اسکے اس عمل کو توبہ قرار دینا بالکل ظاہر ہے۔ لیکن اگر مجرم کو بالجبر گرفتار کر کے اسکی مرضی ومنشاء کے خلاف جبراً حد لگائی جائے، تو پھر اسکی اس پیشی کی تعبیر توبہ سے کرنی مناسب نہیں لگتی، اسلئے کہ توبہ خود مجرم کا اپنا ذاتی عمل ہے، جو خشیت و رضا کی پیداوار ہے اور حد جاری کرنا حاکم کا کام ہے، تو یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں بھی حد جاری کرنے سے حقوق العباد معاف ہو جائینگے، مگر حقوق اللہ کا معاف ہونا، بلفظ دیگر اس حد کے جاری ہو جانے ہی کو توبہ قرار دینا، بوجہ کم فہمی میری سمجھ میں ابھی تک نہ آسکا۔ ﴿لعل الله یحدث بعد ذالك امرا﴾

۸۔۔۔۔ **سَتَرَہُ اللّٰہُ**۔۔۔الخ: اس میں اشارہ ہے کہ کوئی شخص اپنے چھپے گناہ کو ظاہر نہ کرے، مگر حق عبد ضرور ادا کرے:

۹۔۔۔۔ **اِنْ شَآءَ عَفَا عَنْہُ**۔۔۔الخ: اس میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴿سورۃ النساء:۴۸﴾

بیشک اللہ نہ بخشے گا اسکے ساتھ کفر کئے جانے کو اور بخش دیگا اس سے کم کو جسے چاہے،

۱۰۔۔۔ **مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ**: ترمذی اور نسائی میں بھی اس حدیث کی روایت کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَضْحٰی اَوْ فِطْرٍ اِلَی الْمُصَلّٰی فَمَرَّعَلَی النِّسَآءِ فَقَالَ یَا مَعْشَرَالنِّسَآ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِفَقُلْنَ وَبِمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعَنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَمَارَأَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰی کُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِیْنِنَا وَعَقْلِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلَیْسَ شَھَادَۃُ الْمَرْأَۃِ مِثْلَ نِصْفِ شَھَادَۃِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِھَا. قَالَ اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِھَا ﴿متفق علیہ﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ عید قرباں ۔۔۔۔یا۔۔۔۔عید فطر کے دن عید گاہ کو تشریف لے چلے اور عورتوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزرتے ہوئے آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا، کہ اے عورتوں کی جماعت تم صدقہ و خیرات کرتی رہو، کیونکہ مجھ کو یہ دکھلایا گیا ہے کہ تم میں سے اکثر دوزخی ہیں۔ عورتوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اسکا سبب؟ آپ نے فرمایا، تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہو، باوجود عقل و دین میں ناقص ہونے کے، ہوشیار اور عقلمند آدمی کا بھیجا اُڑا دینے والی اور اسے بے وقوف بنا دینے والی، تم سے بڑھ کر مجھے کوئی شئے نظر نہیں آئی۔ عورتوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے دین و عقل میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا ایک عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی گواہی نہیں ہے؟ عرض کیا ہاں کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا یہی عورت کی عقل کی کمی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا، کیا یہ درست نہیں کہ عورت حالت حیض میں روزہ نماز نہیں ادا کر سکتی؟ عرض کیا ہاں، کیوں نہیں ۔۔۔۔فرمایا ۔۔۔۔یہ اسکے دین کی کمی ہے۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

۱۔۔۔ **عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ:** آپ مشہور صحابیٔ رسول اور اصحاب شجرہ سے ہیں۔نسل انصار کے قبیلہ ٔخدرہ (بضم فاء معجمہ) سے آپکا تعلق ہے۔سب سے پہلا غزوہ جس میں آپ شریک ہوئے غزوۂ خندق ہے۔بارہ غزوات میں آپ حضور کے ساتھ رہے۔آپ کا اسم شریف سعد بن مالک بن سنان ہے۔آپکے پدر بزرگوار بھی صحابیٔ رسول تھے۔

۲۔۔۔ **فِی اُضْحٰی :** یہ اضحاۃ کی جمع ہے۔ اضحاۃ کے معنی وہی ہے جو اُضحیۃ کا ہے،یعنی قربانی کی ہوئی بکری۔حدیث شریف میں ہے 'اِنَّ عَلٰی کُلِّ اَهْلِ بَیْتٍ اَضْحَاةً' ہر گھر والے پر قربانی لازم ہے۔اس میں چند لغتیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔اُضْحِیَّۃٌ (بضم الاولیٰ وسکون الثانیہ وکسر الثالثہ وتشدیدالرابعۃ المفتوحہ) اِضحِیّۃ (بکسر الاولیٰ۔۔۔الخ) ان دونوں کی جمع ہے اضاحی (بروزن اکابر)۔

﴿۲﴾۔۔۔ اَلضَّحِیَّۃُ اسکی جمع ہے ضحایا۔

﴿۳﴾۔۔۔اَضْحَاۃٌ اسکی جمع ہے اضحی (بفتح الهمزه وسکون الضاد) دراصل اسکے معنی قربانی کی بکری کے ہیں۔مگر یوم نحر پر بھی اسکا اطلاق کیا جاتا ہے۔

۳۔۔۔ **اَوْ فِطْرٍ :** اس بات میں راوی کو شک ہوگیا کہ یہ واقعہ عید قرباں کے دن پیش آیا ۔۔۔یا۔۔۔عید الفطر کے روز۔ایک روایت میں 'یوم عید' کا لفظ اور دوسری روایت میں 'فی فطر' کسی شک کے بغیر مذکور ہے۔

۴۔۔۔ **اِلَی الْمُصَلّٰی :** عیدگاہ کی طرف۔مدینہ مطہرہ کے باہر یہ ایک جگہ ہے جسکے اور مسجد نبوی کے درمیان ایک ہزار ہاتھ کا فاصلہ ہے۔

۵۔۔۔ **یَامَعْشَرَ النِّسَآءِ:** المعشر۔۔(بروزن مسکن) جماعت کے معنی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ خطاب موجود عورتوں سے تھا۔اور حکم انکے سوا کو عام تھا۔۔۔ازروئے دلالت۔۔۔یہ بھی احتمال ہے کہ خطاب عام ہو غائب پر حاضر کی،تغلیب کرتے ہوئے،یعنی غیر موجود پر موجود کو غالب

کرتے ہوئے۔گویا موجود غیر موجود کے قائم مقام قرار دیئے گئے۔

۶۔۔۔۔اِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ: یہ لفظ تین مفعول کی طرف متعدی ہے،جس میں پہلا مفعول فاعل کا قائم مقام ہے۔دوسرا مفعول 'کنّ' ہےاور تیسرا مفعول 'اکثر اھل النّار' ہے۔یہاں اُرِیتُ کا معنی عُلمتُ ہے،یعنی مجھے علم دیا گیا۔اب خواہ بذریعہ وحی یا بذریعہ کشف۔ ﴿واللہ اعلم﴾

۷۔۔۔۔تُکْثِرْنَ اللَّعَنَ:یعنی تم حرف وحکایات اور محاورات ومخاطبات میں لعن طعن، لعنت ونفریں زبان پر بہت لاتی ہو۔اور یہ بڑا ہی مذموم عمل ہے۔لعنت کہتے ہیں دھتکارنے،اور اللہ کا اپنے بندے کو اپنی رحمت سے دور کرنے کو۔ذہن نشین رہے کہ کسی شخص معین پر خواہ وہ مومن ہو۔۔۔۔ یا۔۔۔کافر،لعنت کرنا جائز نہیں،جب تک کفر پر اسکی موت کا علم یقینی طور پر نہ ہو۔اسلئے کہ لعنت بمعنی مذکور اسی کے ساتھ خاص ہے جسکی موت کفر پر ہونیکا یقینی علم ہو چکا ہو۔چونکہ کسی کے کفر پر۔۔۔۔یا۔۔۔۔ ایمان پر مرنے کا علم یقینی شارع علیہ السلام کے سوا کسی کو نہیں ہوتا،اسلئے اس کا یقینی علم صرف شارع علیہ السلام کے خبر دینے ہی سے ہوسکتا ہے۔اسکے سوا موت کی کیفیت سے یقینی طور پر واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں،جس طرح کہ کسی کے ایمان کی سلامتی کے ساتھ اٹھنے کا یقینی علم بھی اپنے طور پر ناممکن ہے۔ایسی صورت میں شخص معین کا نام لے کر لعنت کرنے سے بچنا لازمی ہے۔ہاں وصف کا ذکر کر کے لعنت کر سکتے ہیں۔۔۔۔مثلاً:

لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْکَافِرِیْنَ وَالْعَنَ اللّٰہُ الیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی

۔۔۔۔لعنت کبھی رحمت خاص اور مقام قرب سے دور کر دینے کو کہتے ہیں۔لعنت کی یہ قسم کافروں کے ساتھ مخصوص نہیں،بلکہ غیر کافر پر بھی بقصد تغلیب وتشدید اسکا اطلاق ہوتا ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔لعنت کرنا ایک مذموم صفت ہے اور اگر جس پر لعنت کی جارہی ہو وہ مستحق لعنت نہ ہوا،تو پھر خود لعنت کرنے والے پر وہ لعنت پلٹ آتی ہے۔

۸۔۔۔۔تَکْفُرْنَ: یہ لفظ کفران نعمت سے ہے۔کہا جاتا ہے:

کَفَرَ نَعِمَۃَ اللّٰہِ کَفُوْراً وَکُفْرَانًا

۔۔۔۔یعنی اللہ کی نعمت کا انکار کیا اور اسے چھپایا۔ایسے ہی کہا جاتا ہے:

کَافِرٌ حَقَّہٗ

۔۔۔۔یعنی اس نے حق کا انکار کیا۔

عورت کی یہ فطرت ہے کہ اگر شوہر ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتا رہا ہو اور کبھی بھی اسکی حق تلفی

نہ کی ہو، اسکے باوجود اگر کبھی ایک بار بھی اسکے حق کی ادائیگی میں کمی آجائے، تو وہ بول اٹھتی ہے کہ میں نے تو تجھ میں کبھی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔اسی مضمون کوایک دوسری حدیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۹۔۔۔**اَلْعَشِیْرَ**: عشیر کا معنی اگرچہ قریب، دوست، ساتھ رہنے والا اور شوہر سبھی ہے، مگر حدیث زیرِ شرح میں یہ لفظ شوہر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔اگرچہ عورتیں صرف اپنے شوہروں ہی کی ناشکری نہیں کرتیں، بلکہ وہ اپنی سہیلیوں اور عزیزوں کی بھی ناشکر گزار ہوجایا کرتی ہیں۔

۱۰۔۔۔**مَارَأَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتٍ**: یہاں لفظ من زاید ہے۔۔۔یا۔۔۔تقدیر عبارت یہ ہے مَارَأَیْتُ اَحَدًا مِنْ نَّاقِصَاتٍ۔۔۔الخ۔ یعنی میں نے ناقصات میں سے کسی ایک کو نہیں دیکھا۔۔۔الخ۔

۱۱۔۔۔**اَذْھَبَ لِلُبِّ**: لب کہتے ہیں ہر چیز کے خالص کو۔۔۔اور۔۔۔یہ عقل کے معنی میں بھی ہے۔اسلئے عاقل کو لبیب کہتے ہیں۔حازم وہ ہے جو اپنے معاملات میں ہوشیار و چالاک ہو۔

۱۲۔۔۔**وَمَانُقْصَانُ دِیْنِنَا وَعَقْلِنَا؟**: عورتوں نے اپنے معروضہ میں دین کے نقصان کا ذکر پہلے کیا، تاکہ دین کے نقصان کی اہمیت ظاہر ہوجائے اور اسکے نقصان پر انکی طرف سے حسرت کا مظاہرہ ہوجائے۔۔۔اسکے برخلاف۔۔۔حضور آیۂ رحمت ﷺ نے نقصانِ عقل کو مقدم رکھا۔ شاید اس میں حکمت یہ ہے کہ سرکارِ رسالت ﷺ اپنے کلام کے آغاز میں انکے دین کے نقصان کا ذکر فرما کر انکو وحشت زدہ اور فکر مند نہیں کرنا چاہتے تھے۔اسی حکمت کے پیشِ نظر حضور ﷺ نے جواب میں انکو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا اور غائب کا لفظ استعمال فرما کر ارشاد فرمایا:

فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِھَا

۔۔۔یعنی یہ اسکے دین کے نقصان سے ہے۔

اگرچہ یہ امر خدائے تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہے، خود عورتوں کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ لیکن عورتوں کو اس حالت پر پیدا کرنا اور انھیں عبادات سے منع کرنا، اور مردوں کو منع نہ کرنا ہی، عورتوں کے درجے کو مردوں کے درجے سے کم کرنا ہے۔

۔۔۔الغرض۔۔۔عورت کی گواہی کا مرد کی نصف گواہی کے برابر ہونا عورت کے نقص عقل کی بنا پر ہے، کیونکہ عورت ثقہ ہونے میں ۔۔۔نیز۔۔۔حفظ و تحمل اور ادائے شہادت میں وہ درجہ اور وہ مقام نہیں رکھتی جو مرد رکھتا ہے۔۔۔یونہی۔۔۔ایامِ حیض میں نماز و روزہ کے فرائض ادا نہ کرسکنا، عورت کے نقصان دین کا باعث ہے۔۔۔الحاصل۔۔۔عبادت کا زیادہ ہونا دین کے زیادہ ہونے کا سبب

ہے اور عبادت میں کمی، دین میں کمی اور نقصان کا سبب ہے، اگر چہ وہ نقصان کسی عذر کے باعث ہی کیوں نہ ہو۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ حائضہ کو حیض کے عذر کے باعث اسکی فوت شدہ نمازوں کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ حدیث کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ کو فوت شدہ نمازوں کا ثواب نہیں ملتا ۔۔۔اسکے برخلاف۔۔۔مریض و مسافر کو عذر مرض و سفر کی وجہ سے نوافل عبادات ادا نہ کرنے کی صورت میں بھی انکا ثواب ملتا ہے، کیونکہ مریض و مسافر تو ہر وقت ان عبادات کی ادائیگی کی نیت رکھتے ہیں اور اس نیت کے اہل بھی ہیں، بخلاف حائضہ عورت کے، کہ وہ نیت کی اہلیت ہی نہیں رکھتی، جیسا کہ علامہ طیبی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے:

وَاَخْرَجَهُ اَيْضًا اَلنِّسائِىُ وَابْنُ مَاجَهُ
وَاَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِى هُرَيْرَةَ وَابْنُ عُمَرَ اِيْضًا

۱۔۔۔**عَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِىِّ** : آپ زبردست عالم اور احادیث کے ماہر صحابی ہیں۔ آپ نے چوراسی سال کی عمر پا کر ۷۴ھ میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

۲۔۔۔**اِلَى الْمُصَلّٰى** : مسجد نبوی شریف کے بہترین مسجد ہونے کے باوجود حضور علیہ السلام کا عیدین کی نماز شہر مدینہ سے باہر میدان میں ادا فرمانا ظاہر کر رہا ہے، کہ اگر چہ شہر میں عیدین کی نماز کی ادائیگی جائز ہے۔۔۔مگر۔۔۔شہر سے باہر نکل کر عیدگاہ میں یہ نمازیں ادا کرنی سنت مستحبہ ہے۔

۳۔۔۔**فَمَرَّ عَلَى النِّسَآءِ** :عہد نبوی شریف میں نمازِ عید ادا کرنے، شرعی احکام سننے اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہونے کی غرض سے تمام عورتوں کو عیدگاہ میں حاضری کا حکم تھا۔ چونکہ یہ مردوں سے علیحدہ بیٹھتی تھیں، اسلئے سرکارِ رسالت علیہ السلام انکے قریب جا کر مخصوص وعظ ارشاد فرماتے تھے۔

۴۔۔۔**فَمَرَّ**: اس میں دو احتمال ہیں: ﴿۱﴾۔۔۔حضور ﷺ بالقصد وعظ و نصیحت کیلئے ان کی طرف تشریف لے گئے۔ ﴿۲﴾۔۔۔آپ ادھر سے گزر رہے تھے، کہ عیدگاہ کے ایک حصہ میں ان کو ملاحظہ فرما کر نصیحت فرمانے لگے۔

۵۔۔۔۔تَصَدَّقْنَ : یہاں نفلی صدقات مراد ہیں۔اسلئے کہ صدقۂ فرض میں عورتیں مرد برابر ہیں۔اور یہ صدقہ اپنے مال سے دیں، کیونکہ خاوند کے مال سے اسکی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتیں۔اجازت خواہ صراحۃً ہو۔۔۔۔یا۔۔۔۔عرفاً۔

۶۔۔۔۔تَصَدَّقْنَ : پتہ چلا کہ صدقات نافلہ کفارہ سیئات اور رافع درجات ہیں۔۔۔۔ الحتصر۔۔۔ایصال ثواب کی کوئی بھی شکل ہو، اس سے قبر کی آگ کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔ دوزخ سے بچاؤ کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔

۷۔۔۔۔تَصَدَّقْنَ: قیامت میں ہر انسان کا صدقہ اسکے سر پر سایہ فگن ہوگا، اور اسی سائے کے نیچے اسکا حساب و کتاب ہوگا۔ارشاد ہے:

اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ

آگ سے بچو اگر چہ ایک کھجور کے ٹکڑے ہی کے ذریعہ

۔۔۔۔کسی پر زیادہ لعن طعن کرنا اشارہ کر رہا ہے کہ لعن کرنے والا آخرت کو فراموش کئے ہوئے ہے، اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہے۔ جو جس قدر دنیا کی محبت میں گرفتار ہوگا، اسی قدر زیادہ اسکی زبان لعن طعن دراز ہوگی۔ایسی صورت میں صدقہ کرنے سے دنیا کی محبت کم ہوتی جائے گی، آخرت کا تصور گہرا ہوتا جائے گا، اور لعنت ونفرین کرنے کی عادت ختم ہوتی جائے گی۔صدقہ کرنے سے وہ بخل بھی فنا ہو جائے گا، جو دنیا کی مذموم محبت کی پیداوار ہے۔اسی لئے ارشاد ہے:

اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى

اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے

۔۔۔۔یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے۔

۸۔۔۔۔اِنِّیْ اُرِيْتُكُنَّ : مجھے دکھلایا گیا ہے، یعنی بطور کشف۔۔۔۔یا۔۔۔۔بذریعہ وحی الٰہی مجھے یہ خبر دی گئی ہے۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔وحی الٰہی کے سوا حضور علیہ السلام کو ایسی قوت قدسیہ من جانب اللہ عطا فرمائی گئی ہے جس سے آپ اگلے پچھلے واقعات وحالات کو مشاہدہ فرماتے رہتے ہیں۔

۹۔۔۔۔فَقُلْنَ وَبِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ : بم کی اصل بما ہے۔ما استفہامیہ کے الف کو حرف جر کے دخول کے بعد تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے۔اس میں 'باء' سببیہ ہے جو اپنے بعد والے مقدر سے متعلق ہے۔واؤ اس پر عطف ہے، جو اس سے پہلے مقدر ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے 'فَقُلْنَ كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ وَبِاَيِّ شَيْءٍ نَكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ'، تو انھوں نے عرض کیا کہ 'وہ کیسے ہوگا اور کس چیز سے ہم اکثر اہل نار ہوں گے۔' یہ بھی ممکن ہے کہ واؤ زائدہ ہو، تاکہ دلالت کرے کہ وہ اپنے ماقبل سے منقطع

ہوکر کوئی مستقل سوال نہیں۔

۱۰۔۔۔۔قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعَنَ : خدا کی طرف سے لعنت کا سبب تو یہی ہے کہ وہ اپنے بندے کو اپنی رحمت سے، اپنی ناراضگی کے سبب دور کردے۔لیکن انسان کی طرف سے لعنت کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کیلئے خدائی ناراضگی کی دعاء کرے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ یہ دعاء کرے کہ خدا اسے اپنے سے اور غیروں سے دور رکھے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔رحمت خداوندی اس پر سایہ گستر نہ ہو۔اس طرح کی لعنت و نفریں کی اجازت نہ دینے سے خدا کی اس رحمت کی بے پناہ وسعت کی نشاندہی ہورہی ہے، جو رحمت اسکے غضب پر بھی سبقت لے گئی ہے۔اب اسی پر نام لے کر لعنت کی جاسکتی ہے، جسکا کفر پر مرنے کا علم شارع علیہ السلام سے حاصل ہو۔۔۔۔مثلاً: ابوجہل جو کفر پر مر چکا۔ابلیس جو کفر پر مریگا۔غصہ میں بچوں پر لڑائی میں مقابل پر لعن طعن کرنا بھی دوزخی ہونے کا سبب ہے۔

خیال رہے کہ ان کفار پر جن کا کفر پر مرنا نص میں آچکا۔۔۔۔یا۔۔۔۔غیر معین گنہ گار پر لعنت جائز تو ہے، مگر اس کی عادت بنالینا مناسب نہیں۔اسلئے کہ لوگ عبرت پکڑیں جنکے یہاں صحابہ پر تبرا اور لعنت کی عادت ہے۔جب نمرود، فرعون، ہامان بلکہ شداد کو گالیاں دینا اور تبرا کرنا ثواب نہیں، تو بزرگوں کو گالیاں دینا کہاں کی انسانیت ہے۔حضور نے 'اکثار لعن' (بکثرت لعنت کرنے والے) پر وعید سنائی ہے، شاید اس لئے کہ عام طور پر عورتوں کی عادت ہے کہ وہ لعنت زبان پر جاری کرتی رہتی ہیں، تو حضور نے ازراہِ کرم تخفیف اختیار فرمائی اور اس پر وعید نہیں فرمائی، بلکہ انکو وعید کا مستحق اس وقت قرار دیا جبکہ وہ اسکی کثرت کا شکار ہوجائیں۔

اسکی نظیر وہ ارشاد ہے جو بعض ائمہ کرام نے فرمایا، کہ غیبت گناہِ صغیرہ ہے۔انھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تمام انسان اس میں مبتلا ہیں۔تو اب اگر یہ گناہ کبیرہ ہو، جیسا کہ اکثر علماء کا یہی خیال ہے بلکہ اس پر اجماع کی بھی حکایت کی گئی ہے، تو سارے انسان یا کم از کم انسان کی اکثریت کا فاسق ہو جانا لازم آئے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے۔کبھی کبھی لعن، گالی اور بدکلامی کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس صورت میں حدیث کا معنی یہ ہوگا، کہ تمہاری عادت ہے کہ تم بکثرت گالیاں دیتی ہو اور زبانی بدکلامیوں کے ذریعہ اذیت پہنچاتی ہو۔

۱۱۔۔۔۔تَكْفُرْنَ: (بضم الفاء) العشیر۔شوہر سے کفر، انکی صورت یہ ہے کہ اسکی نعمتوں کا انکار کیا جائے یا اسکا شکریہ ادا نہ کر کے اسکی نعمتوں پر پردہ ڈالا جائے۔حدیث شریف میں ہے:

'مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ۔لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ'

جولوگوں کا شکر گزار نہیں، خدا کا بھی کامل شکر گزار نہیں

۔۔۔۔اسلئے کہ اس نے 'مسبب' کا شکریہ ادا کیا مگر 'سبب' کا شکر گزار نہیں ہوا۔کفران کا استعمال اکثر نعمت میں اور کفر کا استعمال اکثر دین میں ہوتا ہے۔

۱۲۔۔۔۔لِلُبِّ: عقل، قلب مومن میں اللہ تعالیٰ کا نور ہے، جو معانی کا ادراک کرتی ہے اور قبائح سے روکتی ہے۔لب سے مراد 'عقل خالص' ہے، جو شائبہ نفس سے پاک وصاف ہوتی ہے۔۔۔۔اس کلامِ بلاغت نظام سے اشارہ ہے کہ عورتوں کا فتنہ عظیم ہے، کہ جب وہ 'حازمین' یعنی ہوشیار وچالاک اور مضبوط قوت فکریہ رکھنے والے مردوں کی عقل گم کردیتی ہیں، تو پھر جو سیدھے سادھے کم عقل رکھنے والے لوگ ہیں، انکا کیا حشر کرسکتی ہیں۔

۱۳۔۔۔۔قُلْنَ۔۔۔الخ: ان مقدس خواتین کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ جب ہمارا دین اور مردوں کا دین ایک ہے اور ہم دونوں کا شمار عقل والوں میں ہوتا ہے، تو پھر ہمارے دین وعقل میں نقص کی وجہ کیا ہے؟۔۔۔۔حضور کے ارشاد میں عقل کا ذکر پہلے ہے اور دین کا بعد میں، مگر انھوں نے سوال میں دین کے ذکر کو عقل کے ذکر پر مقدم کردیا، اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔یہ اشارہ کرنا مقصود ہوگا کہ دین کا معاملہ زیادہ مہتم بالشان ہے، لہٰذا اس کے نقصان کے تدارک کی کوئی شکل نکلتی ہو، تو اسے نکال کر اپنائی جائے۔

﴿۲﴾۔۔۔یہ بھی ان کے نقصانِ عقل کی وجہ سے ہوا کہ انھوں نے کلامِ نبوت کی رعایت نہیں کی اور نبوی ترتیب کی حکمت کو سمجھنے سے قاصر رہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔نبوی کلامِ بلاغت نظام میں دو حکمتیں تو صاف سمجھ میں آرہی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔نقصانِ عقل ایک امر جبلی، فطری اور پیدائشی ہے، جو وجود میں مقدم ہے۔رہ گیا نقصان دین! تو اسکا معاملہ اسکے برعکس ہے، اسلئے کہ وہ امر حادث ہے، جو بعد کی پیداوار ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔دین کا نقصان بھی اکثر وبیشتر عقل ہی کے نقصان سے پیدا ہوتا ہے۔اسلئے عقل کا ذکر پہلے فرمایا۔

۱۴۔۔۔۔یہ قبیلہ انصار کی خواتین تھیں جو دینی مسائل واحکام سیکھنے میں شرم وحیاء سے کام نہیں لیتی تھیں۔اس بنا پر سرکار علیہ السلام نے انکی تعریف فرمائی ہے کہ:

نِعمَ النِّسَاءُ نِسَاءَ الاَنصارِ لَم یَمنَعُھُنَّ الحَیاءُ اَن یَّتَفَقَّھنَ فِی الدِّینِ

۔۔۔۔یعنی انصاری عورتیں بہترین عورتیں ہیں جو تفقہ فی الدین حاصل کرنے میں بیباک ہیں۔

۱۵۔۔۔۔مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِهَا: یعنی بعض اوقات نمازی اور روزہ دار نہ ہوسکنا فی الجملہ انکے نقصان دین کا باعث ہے۔اسلئے کہ بعض ایام میں نماز نہ پڑھنا اور پھر اسکی قضاء بھی نہ کرسکنا انکو ان نمازوں کے ثواب سے محروم کردیتا ہے۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔روزہ کی فضیلت کے اوقات میں روزہ نہ رکھنا اور اطاعت میں مومنین کا شریک نہ ہونا، روزہ کے کمالِ ثواب سے انھیں محروم کردیتا ہے۔

۱۶۔۔۔۔حدیث زیر شرح سے عورتوں کے تین عیبوں کی نشاندہی ہوتی ہے:

﴿۱﴾۔۔۔ناقص العقل۔

﴿۲﴾۔۔۔ناقص الدین (دین پر عمل میں کوتاہ)۔

﴿۳﴾۔۔۔مردوں کو بیوقوف بنانا۔

۔۔۔یہ باتیں عورتوں کی عام حالت کے پیش نظر فرمائی گئی ہیں، اسلئے کہ بعض پاکباز صاحب فہم وفراست دین دار خواتین کا ان عیبوں سے پاک وصاف رہنا حدیث کے خلاف نہیں۔۔۔۔رہ گیا۔۔۔انکے دینی نقص کا معاملہ، تو بے شمار مخلصانہ اعمال خیر وخیرات کے سبب انکی ذات میں اس کو کالعدم سمجھا جائے گا ۔۔۔۔اس مقام پر یہ خیال رہے کہ مرد کی فضیلت عورت پر اسکی جنس کے لحاظ سے ہے، یعنی 'جنس مرد' 'جنس عورت' سے افضل ہے۔رہ گئی انفرادی خصوصیت، تو بہت ساری مقدس خواتین ایسی ہیں جو ہزاروں لاکھوں مردوں سے افضل ہیں۔

۱۷۔۔۔۔اَلَیْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ: یہ عام حالات کے پیش نظر فرمایا گیا ہے۔عام حالات میں دو مرد گواہ ہوتے ہیں۔۔۔۔یا۔۔۔ایک مرد، دو عورتیں۔۔۔۔رہ گیا حدود وقصاص کا معاملہ تو اس میں عورتوں کی گواہی مطلقاً نہیں مانی جاتی۔۔۔۔اور۔۔۔۔بعض حالات میں صرف ایک عورت کی خبر معتبر، جیسے بحالت غبار، رمضان کی انتیسویں کا چاند اور حیض ونفاس کی مدت۔۔۔۔یا۔۔۔ عدت گزرنے کی خبر۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی كَذَّ بَنِی ابْنُ اٰدَمَ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ ذٰلِكَ فَاَمَّا تَكْذِیْبُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ كَمَابَدَأَنِیْ وَ لَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا وَاَنَاالْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لِّیْ كُفُوًا اَحَدٌ وَفِیْ رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَّاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ لِیْ وَلَدٌ وَّسُبْحَانِیْ اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَةً اَوْوَلَدًا ﴿رواہ البخاری﴾

ترجمہء حدیث

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ یہ اس کیلئے مناسب نہ تھا اور مجھے گالی دیتا ہے، حالانکہ یہ اسے درست نہ تھا۔ اسکا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ کہتا ہے کہ رب مجھے پہلے کی طرح دوبارہ نہ بنا سکے گا حالانکہ پہلی بار پیدا فرمانا دوبارہ بنانے سے آسان تر تو نہیں اور اسکی گالی اسکی یہ بکواس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کی، حالانکہ میں تو اکیلا بے نیاز ہوں، نہ کسی کو جنا اور نہ کسی نے مجھے جنا اور میرا کوئی ہمسر نہیں۔ حضرت ابن عباس کی روایت میں یہ ہے کہ انسان کا مجھے پہلے گالی دینا، اسکی یہ بکواس ہے کہ میں صاحب اولاد ہوں، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ بیوی بچے اختیار کروں۔ ﴿بخاری شریف﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ:انسانوں کا یہ کہنا کہ رب تبارک وتعالیٰ ہماری موت کے بعد ہمیں دوبارہ باحیات نہیں کرسکتا، ان ارشادات واخبار کی تکذیب ہے جوقرآن کریم میں موجود ہیں ۔۔۔۔یا۔۔۔۔یوں کہئے کہ جو کسی شیٔ کوازسرنو پیدا فرمانے پر قادر ہے اس کیلئے اسی شیٔ کا اعادہ عقلاً ممکن اورآسان تر ہے۔لہٰذا ابداء (ازسرنو پیدا کرنا) خود اعادۃ (دوبارہ حیات عطا فرمانا) کے امکان کی خبر کو متضمن ہے۔جیسا کہ حدیث کا یہ ٹکڑا 'لَيْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ' اس پر شاہد ہے۔تو اب یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ باحیات نہیں کرسکتا، یقیناً اعادہ کے جواز کی اس خبر کی تکذیب ہے جو ابداء کو متضمن ہے۔ابن آدم فرمانا انسانوں کو انکی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے، کہ وہ ایک ایسے بشر کا جز ہیں جسکا خمیر مٹی اور پانی سے تیار کیا گیا۔اور یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔یہ ان نعمتوں کا بھی خیال نہ کرسکا، جو اسکے باپ حضرت آدم پر کی گئیں۔حضرت آدم کی سعادت مندیوں، خدا ترسیوں پر بھی نظر نہ رکھ سکا۔اور غضب ہے کہ حضرت آدم کا بیٹا ہونے کے باوجود اپنے خیالات کو ان کے نظریات سے ٹکرا رہا ہے۔

۲۔۔۔لَمْ يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ:یعنی اس کیلئے یہ صحیح نہ تھا، جائز نہ تھا اور مناسب نہ تھا کہ وہ پروردگار عالم کی طرف دروغ کی نسبت کرے، اسلئے کہ یہ دلائل وبراہین اور مرتبہ الوہیت کے مخالف ہے۔

۳۔۔۔شَتَمَنِيْ: شتم کہتے ہیں گالی کو، یعنی کسی کی ایسی صفت بیان کرنا جس میں عیب اور نقص ہو، خاص طور سے اس میں جو نسب سے متعلق ہو۔یقیناً اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹا ثابت کرنا، اسے گالی دینا ہے، اسلئے کہ بیٹے کا اثبات درحقیقت غیر خدا کو خدا کے مماثل قرار دینا ہے، اور خدا کی بے مثلی کا انکار کرنا ہے اور منصب الوہیت تک ایک غیر خدا کو اسے خدا کا قائم مقام بنا کر پہنچانا ہے۔ان خیالات میں عیب ونقص کا ہونا ظاہر ہے، لہٰذا انکا گالی ہونا واضح ہے۔

۴۔۔۔لَنْ يُّعِيْدَنِيْ كَمَا بَدَأَنِيْ: یہ قول ان انسانوں کی طرف سے ہے جو 'ابداء' کے قائل ہیں۔۔۔۔یا۔۔۔۔انکی طرف سے بھی ہے جو 'ابداء' کے قائل نہیں۔اسلئے کہ ایسے لوگ بھی اگر

نظر صحیح سے کام لیں گے تو انکے علم وخبر میں بات آجائیگی کہ پروردگار عالم ہی ساری کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ 'نفی اعادۃ' کا عقیدہ انسانی خطاء کی پیداوار ہے جیسا کہ ارشاد ہے کہ 'لَیۡسَ اَوَّلُ الۡخَلۡقِ بِاَھۡوَنَ۔۔۔الخ' جسکا معنی یہ ہے 'اِنَّ الۡاِعَادَۃَ اَھۡوَنَ' بیشک دوبارہ پیدا کرنا آسان تر ہے، جیسا کہ اس طرح کی ترکیب میں اہل اصول کا کہنا ہے کہ اس طرح کی ترکیب لفظ مِـنۡ کے مدخول میں زیادتی کے افادہ کیلئے ہوا کرتی ہے۔ یہ ارشاد، ارشادِ قرانی۔۔۔۔ **وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ** سے ماخوذ ہے۔ یہ آسان ومشکل کی جو بات کی گئی ہے یہ انسانوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے۔ رہ گیا خدائے تعالیٰ جو قادر مطلق ہے، اس کے نزدیک تمام برابر ہے۔ وہاں آسان ومشکل کا سوال ہی نہیں۔

۵۔۔۔۔ **وَاَمَّا شَتۡمُہٗ**۔۔۔الخ: جیسے کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹی بتاتے ہیں۔ یہ اقوال گالی ہونے کے ساتھ ساتھ ان صفات وکمال کی واضح طور پر نفی کرتے ہیں جنکا ذکر 'وَاَنَا الۡاَحَدُ۔۔۔الخ' سے کیا جارہا ہے اور جو خدائی عظمت وبرتری کی خبر دے رہے ہیں۔

۶۔۔۔۔ **اَنَا الۡاَحَدُ**۔۔۔الخ: احد: ایسا یکتا جو ہمیشہ سے تنہا ہو اور کوئی اسکے ساتھ کسی شے میں بھی اس جیسا نہ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اسکے ساتھ بیٹا ہو، تو وہ اسکے مثل ہوگا۔ ایسی صورت میں وہ اپنی ذات وصفات میں احد ویکتا نہ ہوگا۔

۷۔۔۔۔ **اَلصَّمَدُ**: یعنی سید (تکالیف میں جس کی پناہ لی جائے) دائم، باقی، بلند، ٹھوس (جس میں کوئی شگاف نہ ہو)۔۔۔۔ یا یہ کہ۔۔۔۔ صمد وہ سردار ہے جسکے بغیر امور پورے نہ ہوں، اور سرداری اور بلندیاں اسی کی طرف منتہی ہوں۔۔۔۔ یا یہ کہ۔۔۔۔ صمد وہ ہے ضرورتوں میں جسکا قصد کیا جائے۔ اللہ کے صمد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا سردار، دائم، باقی، بلند اور بے عیب ہے جسکے سب محتاج ہیں۔ اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

۸۔۔۔۔ **لَمۡ اَلِدۡ وَلَمۡ اُوۡلَدۡ**۔۔۔الخ: یہ معنی کا لحاظ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے ورنہ لفظوں کا لحاظ کرتے ہوئے ظاہر یہ تھا کہ فرمایا جاتا لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ۔ اس صورت میں عبارت یوں ہوتی: 'اَلصَّمَدُ الَّذِیۡ لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ'۔ مذکورہ بالا ارشاد بالکل اس قول کی طرح ہوگیا کہ کوئی 'اَنَا الَّذِیۡ سَمَّتۡہٗ اُمُّہٗ حَیۡدَرَۃۡ' میں وہ ہوں جسکا نام اسکی ماں نے شیر رکھا، کی جگہ یہ ہے کہ 'اَنَا الَّذِیۡ سَمَّتۡنِیۡ اُمِّیۡ حَیۡدَرَۃۡ' میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا۔ پہلی صورت

میں لفظ کی رعایت ہے اور دوسری صورت میں معنی کی اور علماء معانی کے نزدیک اسکی گنجائش ہے۔

۹۔۔۔۔ کُفُوًا اَحَدٌ: کفو کہتے ہیں مثل کو۔ یہاں کفو سے مراد عورت ہے، جو اس بات میں شوہر کی مثل ہے کہ بچے کی پیدائش میں دونوں کی شرکت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کفو سے بیوی کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی مراد ہو، اسلئے کہ بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح ہوتا ہے۔

۱۰۔۔۔۔ صَاحِبَةً اَوْ وَلَدًا: بعض روایات میں اَو کی جگہ واو ہے۔ یعنی 'وولدا' ہے۔ اور بعض روایات میں 'ولا ولدا' ہے۔ اس اعتبار سے کہ سبحانی معنی نفی کو متضمن ہے ﴿کذا قال الطیبی﴾

فوائد

۱۔۔۔۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: یہ حدیث قدسی ہے۔ قرآن اور حدیث قدسی میں فرق یہ ہے کہ حدیث قدسی خواب یا الہام یا ملک کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔ ملک کے واسطے کی صورت میں بھی صرف مضمون خدا کی طرف سے ہوتا ہے، الفاظ خود حضور کے ہوتے ہیں، جنھیں وہ اپنے رب کی طرف منسوب کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔ مگر قرآن وہی ہے جسے حضرت جبرئیل الفاظ بعینہٖ کے ساتھ لے کر نازل ہوئے، جسکے الفاظ و معانی سب رب ہی کی طرف سے ہیں۔۔۔۔ نیز۔۔۔ اسکے الفاظ و معانی سب متواتر ہیں۔ حدیث قدسی کا حال اسکے برعکس ہے۔ لہٰذا قرآن اور حدیث قدسی کا علم فروعات میں ایک نہیں۔ خیال رہے کہ ساری حدیثیں برحق ہیں۔ اور شرعی حجت ہیں۔۔۔ صدیق اکبر نے حدیث کی بناء پر حضور کے مال میں تقسیم میراث نہ فرمائی، حالانکہ یہ حکم قرآنی تھا۔۔۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ حدیث قدسی میں قال اللہ کی تصریح ہوتی ہے۔

۲۔۔۔۔ کَذَّبَنِی ابْنُ اٰدَمَ: ابن آدم سے جنس انسان مراد ہے۔ 'متکلم کی خبر واقع کے مطابق نہیں ہے'۔ اسکی خبر دینے کو تکذیب کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ جن وانس کے سوا کسی مخلوق میں کافر نہیں، مگر انسان پر اللہ کے احسانات زیادہ ہیں کہ انہی میں انبیاء اور اولیاء بھیجے۔۔۔ اسلئے خصوصیت کے ساتھ اس کی شکایت فرمائی گئی۔

۳۔۔۔۔ لَنْ یُّعِیْدَ نِیْ: عدم بعد الوجود کے بعد ایجاد کو اعادہ کہتے ہیں۔ اب حاصل کلام

یہ ہوگا کہ 'لَنْ یُّحیِینِیْ بَعْدَ مَوتِیْ' یعنی مرنے کے بعد وہ ہمیں ہرگز زندہ نہ فرمائے گا۔اس قول میں قیامت اوران تمام آیتوں کی تکذیب ہے جن میں قیامت کا ذکر ہے۔رب کیلئے ایجاد اوراعادہ دونوں یکساں آسان ہے۔لوگوں پر ایجاد مشکل ہوتی ہے اور دوبارہ بنانا آسان۔ جب کفار رب تعالیٰ کو کائنات کا موجد مانتے ہیں، تو قیامت ماننے میں انھیں کیوں موت آ گئی؟ حالانکہ قیامت میں اٹھانا اعادۂ خلق ہوگا نہ ایجاد۔اس گفتگو کا روئے سخن ان کافروں کی طرف ہے جو اللہ کی ذات وصفات کے اقراری تھے اور قیامت کے منکر۔

۴۔۔۔ **کَمَابَدَأَنِیْ**: یعنی اس حالت کی طرح جس پر ہم اس وقت تھے جبکہ خدائے تعالیٰ نے ہم کو عدم سے وجود بخشا اور ہمیں ابتداءً پیدا فرمایا۔ لَنْ یُّعِیْدَ نِیْ کَمَابَدَأَنِیْ کی تشریح مختلف عبارتوں میں کی جاسکتی ہے۔

﴿۱﴾۔۔۔ لَنْ یُّعِیْدَ نِیْ کَمَابَدَ أَنِیَ اَیْ اَوْجَدَنِیْ عَنْ عَدَمٍ وَخَلَقْتَنِیْ اِبْتِدَاءً اَیْ کَالْحَالَۃِ الَّتِیْ کُنْتُ عَلَیْھَا حِیْنَ بَدَأَنِیْ۔ ہرگزنہیں لوٹائے گا وہ مجھے جیسا کہ اس نے مجھے عدم سے نکالا اور ابتداءً پیدا فرمایا یعنی اس حالت کی طرح جس پر میں آغاز وجود میں تھا۔

﴿۲﴾۔۔۔لَنْ یُّعِیْدَنِیْ اِعَادَۃً مِثْلَ بَدَأِہٖ اِیَّایَ۔ ہرگزنہیں لوٹائے گا وہ مجھے ایسا لوٹانا جو اسکا مجھے ایجاد کرنے کی طرح ہو۔

﴿۳﴾۔۔۔ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ مُمَاثِلًالِّمَابَدَأَنِیْ عَلَیْہِ ۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ مُمَاثِلًالِبَدْئِہٖ مِنْ تُرَابٍ۔ مجھے ہرگزنہیں لوٹائے گا اسکا مماثل بنا کر جس پر میری ایجاد فرمائی۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ ہرگزنہیں لوٹائے گا مجھے اسکے مثل جیسا کہ اس نے میری مٹی سے تخلیق فرمائی۔سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس پر قادر نہیں۔

﴿۴﴾۔۔۔ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ اَیْ لَایُرِیْدُ الْاِعَادَۃَ مِنْ اَصْلِھَا۔ وہ سرے سے اعادہ کا ارادہ ہی نہیں فرمائے گا۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔لَنْ یُّعِیْدَنِیْ اِعَادَۃَ الْاَجْسَامِ ۔یعنی میرے جسم کا اعادہ نہ فرمائے گا۔ مذکورہ بالا عبارتوں سے جو نظریات سامنے آتے ہیں، وہ سب کفر ہیں اور ان آیات قرآنیہ کی تکذیب کرتے ہیں جو اعادہ جسمانیہ پر دلالت کرتی ہیں۔

۵۔۔۔ **لَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ**: یہاں سے ان احمقوں کا رد کرنا مقصود ہے جو جانوروں سے زیادہ گئے گزرے ہیں۔اگر اس قول میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف مانی جائے، تو تقدیر عبارت یہ ہوگی 'لَیْسَ الْخَلْقُ الْاَوَّلُ الْمَخْلُوْقَاتِ'۔ نہیں ہے مخلوقات کی پہلی تخلیق۔۔۔الخ۔۔۔اور

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ اسکا قائم مقام ہے، تو تقدیر عبارت یہ ہوگی 'لَیسَ اَوَّلُ الخَلقِ'۔ یعنی نہیں ہے مخلوق کی تخلیق کا آغاز۔۔۔الخ اور اگر یہ کہا جائے کہ الخلق میں الف لام مضاف الیہ کا عوض ہے، تو عبارت یہ بنے گی۔ 'اَوَّلُ خَلقِ الشَّئِ' ہر شئے کی تخلیق کی ابتداء۔

۶۔۔۔۔بِاَھوَنَ: باء زائد ہے جو تاکید کیلئے ہے۔ اَھوَنُ اِذَاسَہِلَ (جبکہ آسان ہو) سے مشتق ہے مطلب یہ ہے کہ لَیسَ اَسہَلُ (آسان تر نہیں)۔

۷۔۔۔۔عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِه :یعنی مخلوق کے اعادہ سے۔۔۔۔یا۔۔۔کسی چیز کے اعادہ سے بلکہ دونوں میری قدرت میں برابر ہیں۔ بلکہ اعادہ عادتاً آسان تر ہے۔ اسلئے کہ جس شئے کا اعادہ کرنا ہوتا ہے اسکی اصل بنیاد اور اسکے آثار موجود رہتے ہیں، یعنی اس میں بالکلیہ معدوم کو موجود کرنا نہیں ہوتا۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔وہ تمہارے گمان میں اور تمہاری طرف نسبت کرتے ہوئے آسان تر ہے۔۔۔۔ یا یہ کہ۔۔۔مخلوقات پر آسان تر ہے، اسلئے کہ عود ایک آنی چیز ہے بخلاف ایجاد کے، اسلئے کہ وہ ایک تدریجی معاملہ ہے۔

۸۔۔۔۔اس مقام پر ایک دانشمند اور فہم حق کیلئے یہ مثال کافی ہے جسکا تعلق مشاہدات و تجربات سے ہے۔ غور فرمایئے کہ اگر کوئی انسان کسی ایسی صنعت کا اختراع کرے اور کوئی ایسی چیز بنانا چاہے جسکی اس نے کوئی مثال نہ دیکھی ہو، اسکی کوئی اصل نہ پائی ہو اور اسکے کسی نظیر سے آشنا نہ ہوا ہو، تو اسکے بنانے میں اسے صعوبت و ماندگی کی راہوں سے گزرنا ہوگا، بے پناہ مشقتوں سے دوچار ہونا پڑے گا، دوستوں کی اعانت اور مدت و وقت کی درازی درکار ہوگی۔ اسکے باوجود اکثر ایسا ہوگا کہ وہ اپنے مقصود کے حصول میں ناکام رہے گا۔ اور اسکی کوششیں رائیگاں جائیں گی۔۔۔ مثلاً: صنعت کیمیا کے اکثر طالبین کا حال اس پر گواہ ہے۔ اسکے برخلاف جس نے کسی شکستہ کی اصلاح کا ارادہ کیا اور کسی منہدم کے اعادے کا قصد کیا درآنحالیکہ اسکے پاس اسکی مثال بھی ہے اور اسکے اصول و آثار بھی، تو اس کیلئے یہ عمل آسان تر ہوگا۔ تھوڑی ہی مدت میں اپنے مقصود کو پالیگا۔ اس مثال پر جو غور کرے گا اس پر بخوبی ظاہر ہو جائے گا، کہ ہماری طرف نسبت کرتے ہوئے اعادۃ، بداء ۃ سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ حاصل کلام یہ ہوگا: کفار کا بداء ۃ کا اقرار کرتے ہوئے اعادۃ کا انکار کرنا خدا کی تکذیب کرنا ہے۔

۹۔۔۔۔اِتَّخَذَاللّٰہُ وَلَدًا: اتخاذ ولد نقص ہے، اسلئے کہ وہ دو محال کا مستدعی ہے۔

﴿۱﴾۔۔۔اسکی مماثلت بیٹے سے تمام حقیقت میں، یعنی قومیت و نوعیت و جنسیت میں ہو۔ اس سے خدا کا امکان و حدوث لازم آیا ہے۔

﴿۹﴾۔۔۔تو الد وتناسل بقاءنوع کیلئے ہوا کرتی ہے۔بیٹے کی ضرورت اسی لئے پڑتی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد اسکا قائم مقام ہو۔اسکا نام زندہ رکھے اوراسکی جائداد کا وارث ہو۔۔۔الغرض ۔۔۔خدا کیلئے بیٹا ماننا، خود خدا کیلئے زوال وفنا کا اعتراف کرنا ہے۔

۱۰۔۔۔**اَنَا الْاَحَدُ**:واحد وہ ہے جس کی ذات بے مثال و بے نظیر ہو،اور احد وہ ہے جس کی ذات ہر عیب سے پاک اور تمام صفات کمال سے متصف ہو کر ممتاز ومنفرد ہو۔غور کرو ایسے کو بیٹے کی کیا ضرورت؟

۱۱۔۔۔**اَلَّذِیْ لَمْ اَلِدْ**:اسلئے کہ قدیم حادث کا محل نہیں ہوسکتا، **وَلَمْ اُوْلَدْ**:اسلئے کہ میں اول ہوں،قدیم ہوں،میرا کوئی آغاز نہیں،جس طرح کہ میری کوئی انتہا نہیں۔

۱۲۔۔۔**کُفُوًا اَحَدٌ**:نفی کفر والدیت،ولدیت اور زوجیت سب پر عام ہے۔

۱۳۔۔۔**فَقَوْلُهٗ لِیْ وَلَدٌ**:یعنی جنس ولد جو مذکر مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

۱۴۔۔۔**صَاحِبَةً**:صاحبہ سے مراد زوجہ ہے۔اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی زوجہ بنانے سے پاک ہے۔نفی جنسیت اور عدم احتیاج کے سبب۔

۱۵۔۔۔**وَبِسُبْحَانِیْ**: ایک نسخہ صحیحہ میں فسبحانی یعنی فاء کے ساتھ ہے۔

۱۶۔۔۔**اَوْوَلَدًا**: بقول ابن الملک،راوی کو شک ہوگیا۔ظاہر یہ ہے کہ 'او' نوع کیلئے ہے۔جامع الحمیدی کی روایت 'ولا ولدًا' اس پر دال ہے۔

۱۷۔۔۔حدیث شریف سے رب کریم کے حلم کی بے پناہ وسعتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔غور کرو اگر کوئی شخص کسی ادنیٰ مخلوق پر کوئی عیب لگائے، تو ضعف و عجز کے باوجود اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ لگانے والے کو نیست ونابود کردے۔مگر رب کریم غفور رحیم نے قدرت واختیار کے باوجود ایسا نہیں کیا، بلکہ حق کو دلائل و براہین کی روشنی میں واضح کر کے سامنے رکھ دیا اور اپنے عیب لگانے والوں کو اس حق کی طرف راستہ دکھایا۔

۱۸۔۔۔**رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ**:ایسا ہی احمد ونسائی نے بھی روایت کی ہے جیسا کہ بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے جو روایت کی ہے امام احمد ونسائی نے بھی حضرت ابوہریرہ سے اسکی تخریج کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یُؤْذِیْنِی ابْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ بِیَدِیَ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم زمانہ کو برا کہہ کر مجھے تکلیف دیتا ہے، حالانکہ زمانہ میں ہی ہوں، میرے ہی دست قدرت میں سب کچھ ہے، میں ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہوں۔

﴿بخاری شریف﴾

جواہر پارے

ا۔۔۔۔ **يُؤْذِيْنِي ابْنُ اٰدَمَ:** یعنی ایسا کام کرتا ہے جو مجھے ناپسند ہے اور میں جس سے راضی نہیں۔

۲۔۔۔۔ **يَسُبُّ الدَّهْرُ:** ایک روایت میں 'بِسَبِّ الدهر' ہے۔ اس صورت میں لفظ 'سَبٌّ' مصدر ہے جو یہاں حرف جر سے مجرور ہے۔ دھر کا معنی ہے زمانہ طویل اور لمبی مدت۔ کذافی القاموس۔ بیضاوی میں ہے کہ دھر نام ہے زمانہ ممتد غیر ممدود کا۔ نہایہ میں ہے کہ دھر کہتے ہیں زمانہ طویل کو اور دنیا کی مدت حیات کو۔۔۔۔ عرب کا طریقہ تھا کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی، تو وہ زمانہ کو برا کہتے اور اسے گالی دیتے اور کہتے کہ زمانہ نے ان کو ہلاک کر دیا، تو انھیں اس طرز عمل سے روک دیا گیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ان مصیبتوں کو نازل کرنے والے کو گالی نہ دو۔ اسلئے کہ جب تم اسے گالی دوگے تو یہ خود اللہ تعالیٰ کو گالی دینا ہوگا، اسلئے کہ اللہ ہی **فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ** اپنی مشیت وارادت کے مطابق سب کچھ کرنے والا ہے کیونکہ دھر یعنی 'جالب حوادث'، وہ اللہ ہی ہے۔ یعنی اللہ ہی ہے جو تمام حوادثات کو نازل فرماتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں۔

ارشاد 'وَاَنَا الدَّهْرُ' میں 'جالب الحوادث' کی جگہ دھر کو رکھنا اور اسے اسکا قائم مقام قرار دینا محض اسلئے ہے کہ عرب 'جالب الحوادث' ہی کو دھر کہتے تھے۔ (گویا انکے نزدیک دھر کا معنی 'جالب الحوادث'، 'حادثات کو اکٹھا کرنے والا، انہیں نازل فرمانے والا' ہی ہو گیا تھا)۔

ایک روایت میں ہے فَاِنَّ اللّٰهُ هُوَالدَّهْرُ یعنی اللہ ہی ہے جو دھر ہے۔ یعنی وہی 'جالب الحوادث' ہے۔ لہٰذا دھر بمعنی زمانہ کو 'جالب الحوادث' خیال کرنا غلط اور باطل ہے۔ (کذافی النهاية)

علامہ کرمانی اَنَاالدَّهْرُ کی تفسیر اَنا المُدَهِّرُ یعنی 'مقلب الدهر' فرماتے ہیں، یعنی میں ہوں زمانے کو اُلٹنے پلٹنے والا۔۔۔۔ ایک روایت میں 'اَلدَّهْرَ' منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ 'اَنَا بَاقٍ فِی الدَّهْرِ'، یعنی ابن آدم زمانہ کو گالی دیتا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ میں اس میں موجود وباقی ہوں۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ 'وَاَنَا اُقَلِّبُ فِی الدَّهْرِ' اور حال یہ ہے کہ میں ہی زمانہ میں

اُلٹتا پلٹتا ہوں۔اس صورت میں الدھر ،اُقَلِّبُ کا ظرف ہو جائے گا۔اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ظرفیت سے کوئی فائدہ نہیں،لہٰذا اَلدَّھر کو مرفوع پڑھنا ہی بہتر ہے۔اس صورت میں اسکا معنی یہ ہوگا کہ 'اَنَا الْمُتَصَرِّفُ الْمُدَبِّرُوَانَافَاعِلُ مَایُضَافُ اِلَی الدَّھْرِمِنَ الْمَسَرَّۃِ وَالْمَسَاءَۃِ'یعنی میں ہوں متصرف اور مدبر اور میں ہوں ان اچھائیوں اور برائیوں کا فاعل ،جسکی نسبت دھر کی طرف کی جاتی ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔مضاف محذوف ہے اور تقدیر عبارت یہ ہے 'اَنَا مُقَلِّبَ الدَّھَرُ' میں ہوں زمانہ میں انقلاب لانے والا۔۔۔اور زمانہ میری اطاعت وفرمانبرداری کرنے والا ہے، جسے کوئی اختیار نہیں،تو اب جس نے اسے گالی دی اس نے مجھے گالی دی۔

خطابی نے الدھر کو مرفوع پڑھنے سے انکار کیا ہے اسلئے اس سے لازم آئے گا کہ الدھر اسماء حسنی سے ہو جائے ،حالانکہ ایسا نہیں۔لہٰذا اسے منصوب پڑھا جائے اور اس اُقَلِّب کا ظرف قرار دیا جائے ،جسکا معنی یہ ہوگا۔ 'اُقَلِّبُ اللَّیْلِ وَالنَّھَارَطَوَّالزَّمانِ' میں زمانہ کے وسیع دائرے میں رات و دن کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں۔ (کذافی مجمع البحار)

قاموس میں ہے کہ دہر کو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں شمار کیا گیا ہے۔(فاعل ومتصرف کے معنی میں)۔

۳۔۔۔دھر کو گالی دینے میں اللہ کی ایذا کی دو۲وجہیں ہوسکتی ہے:

﴿۱﴾۔۔۔یہ کہ گالی اللہ کی طرف راجع ہوتی ہے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔دہر کو گالی دینا اشارہ کررہا ہے کہ گالی دینے والا اسے حقیقی طور پر متصرف سمجھ رہا ہے اور حقیقی تصرف کی نسبت دھر کی طرف کررہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ کمال کی نفی ہے۔

ا۔۔۔دہر کو گالی دینے کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ کوئی کہے'ہائے زمانہ تو نے مجھ پر ظلم کیا' میرے فلاں کو ماردیا، ہائے ظالم زمانہ، ہائے ظالم آسمان وغیرہ وغیرہ۔جیسے کہ مولوی محمود حسن دیوبندی نے مرثیہ گنگوہی میں زمانہ کو جی بھر کے کوسا اور گالی دیا ہے، یہ حرام ہے۔غور کرو جب اللہ تعالیٰ کے

محکوموں کو برا کہنا، اسکی ناراضگی کا باعث ہے تو اپنے پیاروں کی توہین اسے کیسے پسند آسکتی ہے۔

۲۔۔۔۔ **یُؤْذِیْنِی ابْنُ اٰدَمَ:** یعنی انسان میرے حق میں وہ کہتا ہے جو مجھے ناپسند ہے ۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔میری طرف ان امور کی نسبت کرتا ہے جو میری شان کے لائق نہیں۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔ میرے حق میں اس طرح کی بات کہتا ہے جس طرح کی بات ایسوں کو اذیت پہنچائے جو صحیح طور پر اذیت اٹھانے کے اہل ہوں۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔اسلئے کہ اللہ کو اذیت پہنچانا اور اسکا اذیت اٹھانا محال ہے۔تو اب یا تو یہ کہئے کہ اپنے اس کلام سے رب تعالیٰ نے کیا مراد لیا ہے، وہی جانے اور اسکے بتانے سے اسکا رسول جانے اور تاویل کی مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی اختیار کر لیجئے۔کبھی ایذاء کا اطلاق ہوتا ہے قول وفعل کے ذریعہ کسی کے ناپسندیدہ کام کے انجام دینے پر، خواہ وہ اس سے متأثر نہ ہوں اس صورت میں ایذاء اللہ تعالیٰ کا معنی ہوگا، ایسا فعل جو اسے ناپسند ہو اور یہی 'ایذاء رسول' کا بھی مطلب ہے۔۔۔۔ارشادِ ربانی:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔۔۔الخ

۔۔۔۔میں اسی اذیت کے پہنچانے کا ذکر ہے۔ ﴿سورۃ الاحزاب:۵۷﴾

۳۔۔۔۔ **اَنَا الدَّھْرُ** (برفع الراء) یہ مضاف الیہ ہے جو مضاف کے قائم مقام ہے۔یعنی اَنَا خَالِقُ الدَّھْرِ ۔۔۔۔یا۔۔۔۔ اَنَا مُصَرِّفُ الدَّھْرِ ۔۔۔۔یا۔۔۔۔ اَنَا مُقَلِّبُ الدَّھْرِ ۔۔۔۔یا۔۔۔۔ اَنَا مُدَبِّرُ الْاُمُوْرِ الَّتِیْ نَسَبُوْھَا اِلَی الدَّھْرِ۔۔۔۔ یعنی میں زمانے کا خالق ہوں، میں زمانے کو گردش دینے والا ہوں، میں زمانے میں انقلاب لانے والا ہوں، اور میں امور کی تدبیر فرمانے والا ہوں، جنکی نسبت زمانے کی طرف کی جاتی ہے۔لہٰذا اب جب کوئی زمانے کو گالی دیگا، یہ سمجھ کر کہ زمانہ ان امور کا فاعل ہے، تو وہ گالی میری طرف لوٹے گی، اسلئے کہ میں ہوں اسکا حقیقی فاعل۔رہ گیا زمانہ، وہ تو صرف ان امور کے واقع ہونے کا ظرف ہے۔اب اپنے کو دھر فرمانا اس مصلحت سے، تاکہ زمانے کو گالی دینے والوں کا رد بلیغ ہو جائے اور اس رد میں مبالغہ کا اظہار ہو جائے۔

۴۔۔۔۔ان گالی دینے والوں کی دو قسمیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔۔دہریہ: جو زمانے کو قدیم مانتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرے گا۔

﴿۲﴾۔۔۔۔جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہلاک کرنے، مصیبت ڈالنے، محتاج کرنے اور محروم کرنے وغیرہ کی نسبت اسکی طرف کرنا معیوب سمجھتے ہیں، اور اسے ان امور سے منزہ تصور کرتے ہیں۔جہالت وغفلت کے سبب بعض مسلمان بھی ایسا کر گزرتے ہیں۔

۵۔۔۔۔ایک قول یہ بھی ہے کہ 'یَسُبُّ الدَّهر' میں دھر سے 'زمانہ' مدت عالم از ابتلاء تکوین تا انتہا' مراد ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔وہ طویل زمانہ مراد ہے، جو لیل ونہار کی گردش وتعاقب پر مشتمل ہے۔اور اَنَّاالدَّهرُ سے مراد 'اَنَّاالدَّهرُ الْمَتصَرِّفُ الْمُدَبِّرُالمُفِيْضُ لِمَايَحْدُثُ' ہے۔یعنی میں ہوں غلبے والا، ہمیشہ رہنے والا اور فیض رساں ان تمام امور کیلئے جو حادث ہیں۔

۶۔۔۔۔ **بِيَدِىَ الْاَمْرُ:** تمام امور کا خیر وشر اور شیرینی وتلخی وغیرہ ہمارے تصرف کے تحت ہے۔

۷۔۔۔۔ **اُقَلِّبُ اللَّيْلَ**۔۔۔الخ: حسب مشیت جب چاہتا ہوں انہیں چھوٹا بڑا، گرم و سرد اور مفید ومضر بناتا رہتا ہوں۔دن لے جاتا ہوں رات لاتا ہوں، اور رات لے جاتا ہوں دن لاتا ہوں، وغیرہ وغیرہ ۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ زمانہ میں رہنے والوں کے قلوب کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں۔

۸۔۔۔۔ **مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ:** امام احمد اور امام ابوداؤد نے بھی اسکی روایت کی ہے۔حضرت امام مسلم نے بھی حضرت ابو ہریرہ ہی سے حدیث روایت کی ہے، لفظوں کے معمولی فرق کے ساتھ۔
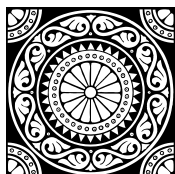
عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَّسْمَعُہٗ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُوْنَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ وَیَرْزُقُھُمْ ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اذیت رساں باتوں کو سنتے ہوئے صبر کرنے والا خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں، کہ لوگ اس کیلئے اولاد کا دعویٰ کرتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں عافیت سے رکھتا اور رزق دیتا ہے۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

۱۔۔۔**مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ**۔۔۔الخ: صبر، حبس (روکنے) کو کہتے ہیں۔اسی سے ہے قُتِلَ صبرًا ۔یہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کو گرفتار کرلیا جائے اور یہاں تک پابند رکھا جائے کہ اسے موت آجائے۔انسان کا صبر یہ ہے کہ وہ جس چیز کو مکروہ سمجھے،اس سے اپنے آپ کو روک دے۔اسکی ضد جزع ہے(بےصبری کرنا) صبر کیلئے لازم ہے کہ صبر کرنے والا گنہگاروں سے انتقام لینے میں عجلت سے کام نہ لے۔بلکہ یا تو معاف کردے یا انتقام کو مؤخر کردے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جس صبر کی نسبت ہے اس سے صبر کا یہی لازمی معنی مراد ہے۔

رب تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک لفظ صَبُورٌ بھی ہے۔ صبور اس حلیم کو کہتے ہیں جو گنہگاروں سے انتقام لینے میں تعجیل نہ فرمائے، بلکہ یا تو عفوودرگزر سے کام لے یا بہ تاخیر انتقام لے۔ (کذافی القاموس) نہایہ میں ہے کہ صبور بالکل حلیم کی طرح ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ گنہگار صبور سے بےخوف نہیں رہتا۔اسلئے کہ اسے بہر حال اسکی طرف سے انتقام کا اندیشہ رہتا ہے،لیکن حلیم سے بےخوف رہتا ہے،اور اسکی طرف سے انتقام کا اندیشہ نہیں رکھتا۔

۲۔۔۔حدیث شریف کا حاصل مراد یہ ہے کہ:

لَا اَشَدُّ حِلْمًا وَصَبْرًا عَنْ فَاعِلِهٖ وَتَرْكًا لِلْمُعَاقَبَةِ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ

بدی کرنے والے سے حلم وصبر فرمانے اور اس پر سے ترک مؤاخذہ کرنے

میں اللہ سبحانہ سے زیادہ کوئی شدید نہیں۔

اس ترکیب سے دراصل غیر خدا سے صبر میں اشدیت کی نفی ہوتی ہے۔اب اسکے بعد معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔۔۔یا تو۔۔۔غیر خدا کا صبر،خداوندی صبر کے مساوی ہو۔۔۔یا۔۔۔اس سے کم ہو۔ اور جب مساوی ہونا محال ہے،تو ناقص ہونا متعین ہو جاتا ہے۔حلم وصبر ان نفوس میں بھی پایا جاتا ہے جنھوں نے اپنے کو اخلاق الٰہیہ سے آراستہ کرلیا ہے اور 'متخلق باخلاق اللہ' ہوگئے ہیں۔لیکن ذات سبحانہ تعالیٰ میں یہ صفتیں اتم واکمل ہیں، جیسا کہ اسکی ہر صفت کا یہی حال ہے کہ وہ کمال کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

۳۔۔۔۔از روئے عرف دیکھا جائے جب بھی ارشاد: 'ما احد اصبر'۔۔۔الخ ذاتِ باری تعالیٰ میں صبر کی اشدیت کا افادہ کرتا ہے۔ جیسا کہ ارباب اصول اس طرح کی ترکیب کے امثال میں کہتے ہیں۔ انکا کہنا یہ ہے کہ دو چیزوں کا کسی ایک صفت میں بالکل مساوی ہونا غیر واقع ہے۔ تو اب اگر ان دونوں میں سے کسی ایک سے افضلیت کی نفی ہو جائے، تو لازمی طور پر وہی افضلیت دوسرے کو ثابت ہو جائے گی۔

۴۔۔۔۔بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ارشاد مذکور میں غیر خدا سے شرفِ صبر کی سرے سے نفی ہے، اور ظاہر یہ کرنا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صبر والا ہی نہیں۔ حدیث کو اس معنی پر محمول کرنا ظاہر یعنی بلکہ محمول نہ کرنا ظاہر ہے۔ اسلئے کہ اس کا ظاہر اور صریح مفہوم یہی ہے کہ صابرین کے وجود کے باوجود خدا کے سوا کسی میں 'اصبریت' نہیں اور ظاہر ہے کہ 'نفیءاصبریت' 'نفیءصبر' کو مستلزم نہیں ۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔ مذکور طرز کلام از روئے عرف، خدائے تعالیٰ کی اصبریت کو مستلزم ہے جس سے بالکلیہ صابرین کی نفی کا گوشہ عرفاً نہیں نکلتا۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ صابرین بکثرت موجود ہیں۔ پھر 'نفیءصابرین' چہ معنی دارد؟

۵۔۔۔۔اس پوری بحث و نظر کا یہ منشاء نہیں کہ غیر خدا میں صبر کے نقصان کو متعین کر دیا جائے بلکہ اسکا مقصود یہ ہے کہ اس اشکال کو دور کر دیا جائے کہ غیر خدا سے اصبریت کی نفی سے لازم آتا ہے کہ صبر میں غیر خدا، خدا کے مساوی ہو جائے، تو اب اس کیلئے ضروری نہیں کہ غیر خدا میں صبر ہی سے بالکل انکار کر دیا جائے، اسلئے کہ اگر غیر خدا میں صبر ہو، مگر ناقص ہو، جب بھی کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ اور مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

۶۔۔۔۔**یُعَافِیْهِمْ:** یعنی اللہ ان سے بلاء وضرر دنیا میں دور فرماتا ہے۔ بلاء اور ضرر (برائی) سے بچانے کو عافیت کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عَافَاهُ اللّٰهُ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی اللہ اسے برائی سے بچائے۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔اللہ نے اسے برائی سے بچا لیا۔

۷۔۔۔۔**وَيَرْزُقُهُمْ:** یعنی دنیا میں انھیں رزق عطا فرماتا ہے اور اموال واولاد اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اور سزا دینے میں تعجیل نہیں فرماتا۔ بلکہ دنیا کے حال کا اعتبار کیجئے، تو پھر وہ اپنے حلم کا مظاہرہ فرما رہا ہے اور بالکل سزا نہیں دے رہا ہے اور اگر آخرت کا اعتبار کیجئے، جب بھی اسکے صبر کا مظاہرہ ہوگا، کہ دنیا کے گنہگاروں کے مؤاخذہ میں تعجیل نہیں فرمائی۔ اور سارا معاملہ آخرت پر ٹال دیا۔

۱۔۔۔صرف مکروہات سے اپنے نفس کو روکنے کا نام صبر نہیں، بلکہ ان امور سے بھی اپنے نفس کو روک لینا صبر ہے، جنکی طرف نفس کا میلان ہو اور نفس جسکی خواہش کرے۔ مستحق عذاب سے عذاب مؤخر کرنا یہی وہ صبر ہے جو صفت باری تعالیٰ ہے۔

۲۔۔۔**عَلٰی اَذًی**: ایک قول کے مطابق یہ لفظ اذی، یوذی کا اسم مصدر ہے اور ایک محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے:

کَلَامٌ مُؤذٍ قَبِیحٌ صَادِرٌ مِنَ الْکُفَّار

ایسا کلام جو اذیت رساں ہو برا ہے، اور کافروں ہی سے صادر ہوتا ہے

۳۔۔۔**یَّسْمَعُهٗ**: یہ اذیً کی صفت ہے اور اذیت کو کامل کرنے والی ہے، اسلئے کہ خود اذیت پہنچانے والے کی زبان سے اذیت رساں کلام کو سننے کی صورت میں اذیت کی تاثیر شدید ہو جاتی ہے۔ یہ ساری گفتگو ہماری طرف نسبت کرتے ہوئے ہے، ورنہ رب تعالیٰ کیلئے مسموع وغیر مسموع سب برابر ہیں اور سبھی معلوم ہیں۔

۴۔۔۔**مِنَ اللّٰهِ**: اصبر سے متعلق ہے 'یسمعه' سے نہیں۔

۵۔۔۔**یَدْعُوْنَ**۔۔۔الخ: (بسکون الدال) ایک قول کے مطابق دال پر تشدید ہے۔ جملہ مستانفہ ہے جس سے اذی کی تشریح مقصود ہے۔

۶۔۔۔اللہ کے فضل وانعام پر غور کیجئے کہ خود اسکو اذیت پہنچانے والوں پر کیسی کیسی اس کی کرم نوازیاں ہیں، پھر اس پر اسکی کس قدر نوازشیں ہونگی جو اپنے غیروں کی اذیت برداشت کرتا ہے اور خدائے تعالیٰ کے اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب میں کوتاہی نہیں برتتا۔ اس حدیث شریف میں ہمارے لئے واضح ہدایت ہے کہ ہم تکلیفوں کو برداشت کریں۔ تکلیف پہنچانے والوں سے بدلہ نہ لیں اور اپنے کو اخلاق الٰہی سے آراستہ کریں۔

۷۔۔۔**مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ**: نسائی نے بھی اسکی روایت کی ہے۔

عَنْ مَعَاذٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ اِلَّا مُؤَخِّرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّحَقَّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا ﴿مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ﴾

حضرت معاذ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں ایک دراز گوش پر حضور کے ساتھ اور آپ کے پیچھے اسطرح سوار تھا، کہ میرے اور آپ کے درمیان صرف ایک زین کی لکڑی تھی۔ حضور نے دریافت کیا کہ اے معاذ کیا جانتا ہے کہ بندوں پر خدا اور خدا پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ ورسول جانیں۔ آپ نے فرمایا کہ بندوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اسکا شریک نہ ٹھہرائیں اور خدا پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جو شخص اسکی ذات میں کسی کو اسکا شریک نہ ٹھہرائے، وہ اسکو عذاب نہ دے۔ اسپر میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، تو کیا میں لوگوں کو اسکی بشارت نہ دے دوں؟ فرمایا! انھیں بشارت نہ دو، ورنہ لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔ **كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ:** الردف (بالکسر) پیچھے سوار ہونے والا، پیروی کرنے والا، سوار کے پیچھے سوار ہونے والے کو، 'ردیف' اور 'مرتدف' بھی کہتے ہیں۔

۲۔۔۔ **اِلَّا مُؤَخَرَةُ الرَّحْلِ:** (بضم المیم سکون الہمزہ وکسر الخاء) یا یہ کہ (بضم المیم و فتح الہمزہ وفتح الخاء المشددة) یہ وہ لکڑی ہے جو سوار کے پیچھے ہوتی ہے۔ جس سے سوار ٹیک لگائے رہتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ 'مُوخِرُ الرَّحل' اور 'مُوخِرَةُ الرَّحل' ان دونوں کی 'خاء' پر زیر اور زبر دونوں جائز ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ دونوں کو خواہ بلا تشدید پڑھا جائے یا تشدید کے ساتھ، دونوں درست ہیں۔ صحاح میں ہے کہ 'مُوخَرَةُ الرَّحل' خاء کے زبر کے ساتھ قلیل الاستعمال لغت ہے۔ اس میں دوسری لغت بھی ہے اور وہ ہے 'آخِرَةُ الرحل' (کجاوہ کا پچھلا حصہ) جو 'قادِمَةُ الرَّحل' کی ضد ہے جسکا معنی ہے کجاوہ کا اگلا حصہ۔ (الرحل۔۔۔ بفتح الراء وسکون الحاء)۔

۳۔۔۔ **لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ**۔۔۔ الخ: اس کلام سے حضرت معاذ کا مقصود یہ ہے کہ مذکورہ گفتگو کے وقت حضرت معاذ کا نبی کریم سے قرب ظاہر ہو جائے اور آپ کے کلام شریف کے فہم و ضبط کی وضاحت ہو جائے۔

۴۔۔۔ **هَلْ تَدْرِيْ:** دریٰ درایة: زیادہ تر جاننے کے معنی میں مستعمل ہے اور کبھی کبھی کسی 'حیلہ سے جاننے' کو بھی درایت کہتے ہیں۔

۵۔۔۔ **مَا حَقُّ اللّٰهِ**۔۔۔ الخ: سچائی، فیصل شدہ معاملہ، امر واجب، ثابت شدہ حصہ وغیرہ حق کے معانی ہیں۔ یہاں حق سے مراد وہ ہے، جو خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنی شریعت میں بحکم عبودیت لازم وواجب قرار دیا ہے۔

۶۔۔۔ **وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ**۔۔۔ الخ: یہاں حق سے مراد وہ ہے، جو رب کریم نے اپنے ذمہ کرم میں رکھ لیا ہے۔ اسکا نام 'حق وواجب' محض اسکے وعدہ کے مضبوط ہونے کے سبب رکھ دیا ہے۔

۷۔۔۔ **لَا يُشْرِكُوا بِهٖ**۔۔۔ الخ: یعنی اسکو پوجیں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں

یعنی بت پرستی نہ کریں ۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔اسکی عبادت کریں اور ریاء نہ کریں، بلکہ عبادت میں اخلاص اختیار کریں۔

۸۔۔۔۔ **اَنْ لَّا یُعَذِّبَ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِه**۔۔۔الخ: اگر مراد شرک سے کفر ہے، تو لا یعذب کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کافروں کے عذاب کی طرح عذاب نہ فرمائے، یعنی دائمی عذاب نہ فرمائے۔ اور اگر شرک سے ریاء مراد ہے، تو پھر اخلاص سے عبادت کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اس پر اصلاً کوئی عذاب نہ ہو۔

۹۔۔۔۔ **اَفَلَا اُبَشِّرُ** : بشارۃ جسکی 'باء' کو زبر زیر پیش سبھی پڑھ سکتے ہیں۔ اسکا معنی خوشخبری ہے۔ چونکہ اکثر انسانی بُشرہ سے بشارت کا اثر ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے اسکو بشارت کہتے ہیں، یہ بُشرہ ہی سے مشتق ہے۔

۱۰۔۔۔۔ **فَيَتَّكِلُوا** : یعنی کسی پر اعتماد کر کے عمل سے رُک جائیں۔ ایک روایت میں فیتّکلوا (بضم الکاف) آیا ہے، جو فکول سے ماخوذ ہے، جسکا معنی ہے کسی چیز سے باز رہنا۔ فیتکلوا (بتشدید التاء وکسر الکاف) اتّکال سے مشتق ہے۔

۱۱۔۔۔۔ اس سوال کے جواب میں کہ جب حضرت معاذ کو روک دیا گیا تھا، تو انھوں نے یہ حدیث کیوں روایت کی اور کیوں لوگوں کو اسکی بشارت دی؟ چند باتیں پیش کی گئی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔ حضرت معاذ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ نہی زمانے کے لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے، اسلئے کہ وہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ تکالیف شرعیہ کے عادی نہ تھے، چنانچہ جب اسکی عادت ہوگئی اور امر و نہی کے قضیئے نے انکے دلوں میں استقامت پکڑ لی، تو اب انھیں بشارت دینے میں کوئی مضائقہ نہ رہا۔

﴿۲﴾۔۔۔ حضرت معاذ نے اس وقت روایت کی، جب وجوب تبلیغ کا امر آگیا۔ اور علم کو چھپانے پر وعید وارد کر دی گئی، جیسا کہ آنے والی حدیث میں اشارہ ملتا ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ صرف ایسوں کو بشارت دینے سے روکا گیا تھا، جو اسی بشارت پر بھروسہ کر کے عمل سے اعراض کرلیں۔ لہٰذا جن سے اسطرح کے اعتقاد اور اعراض وامتناع کا اندیشہ نہیں تھا، انھیں سنانے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔

فوائد

ا۔۔۔معاذ ابن جبل انصاری خزرجی۔آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ بیعت عقبہ کرنے والے ستر انصار میں آپ بھی تھے۔ بدراور تمام غزوات میں حضور کے ساتھ رہے۔حضور نے آپ کو یمن کا گورنر بنایا۔فاروق اعظم نے شام کا گورنر مقرر کیا۔آپکی وفات ۸۳سال کی عمر شریف میں ہوئی۔ شام میں قبر شریف ہے۔آپ کے فضائل بے حدو بے شمار ہیں۔آپ سے حضرت عمر،حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور بے شمار لوگوں نے روایت کی ہے۔

۲۔۔۔**عَلٰی حِمَارٍ** : حضرت معاذ کے قصے کے ہر پہلو کی یادداشت کے ساتھ ساتھ تاجدار کائنات ﷺ کے ہر پہلو کی نشاندہی ہورہی ہے۔اللہ اللہ! سرورِکائنات عرش نشیں محبوب اور دراز گوش کونوازے۔۔۔ خیال رہے کہ دوآدمیوں کا ایک جانور پر سوار ہونا اس وقت منع ہے،جبکہ جانور کمزورہو،دوکا بوجھ نہ اٹھاسکے۔لہٰذا یہ حدیث،ممانعت کی حدیث کی مخالف ہے۔

۳۔۔۔**هَلْ تَدْرِیْ**: زمخشری کا کہنا ہے کہ چونکہ درایت اس معرفت کو کہتے ہیں جوکسی حیلے سے حاصل ہو،اسلئے کہ اسے رب تعالیٰ کی صفت نہیں قرار دیا جاتا۔ایسے ہی معرفت کوبھی خدا کی صفت نہیں بتاسکتے۔اسلئے کہ معرفت جہالت کی سبقت چاہتی ہے۔بخلاف علم کے۔۔۔۔یایہ کہ۔۔۔۔معرفت کاتعلق صرف جزئیات سے ہےاورعلم،کلیات وجزئیات دونوں کوحاوی ہے،اوراللہ دونوں کاعالم ہے۔

۴۔۔۔**مَا حَقُّ الْعِبَادِ**۔۔۔الخ:حق اللہ واجب ولازم کے معنی میں ہےاورحق العباد جدیرولائق کے معنی میں ہے،اسلئے کہ جس نے خدا کے سواکسی کورب نہیں بنایا،اس پراحسان کرنا حکمت خداوندی کے لائق ہے،اس پرواجب نہیں۔معتزلہ کا خیال ہے کہ واجب ہے۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بندوں کاحق خداپروہ ہے،جسکا خدانےان سے وعدہ فرمالیا ہے، اورخدائی وعدہ کی صفت یہ ہے کہ وہ لازمی طور پر پوراہو،پس وہ حق ہے،اسکے وعدۂ حق کی بناپر۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ بطور مشاکلہ ومقابلہ یعنی مشابہت وموافقت کےطور پرحق اللہ کے مقابلے میں حق العباد کالفظ لایا گیاہے۔اورجائز ہے کہ حق العباد میں حق کے معنی وہ ہوجو'حقّك علیّ واجب' تیراحق مجھ پرواجب ہے۔یعنی میراقیام اسکے ساتھ ثابت ہے۔بلفظ دیگر میں اس پرمضبوطی

سے قائم ہوں۔۔۔۔یا۔۔۔۔ارشاد نبوی 'حَقٌّ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ اَنْ یَّغْتَسِلَ فِیْ کُلِّ سَبْعَةِ اَیَّامٍ' (ہر مسلمان پر ہر ہفتے غسل کرنا لازم ہے) میں حق سے مراد ہے۔

۵۔۔۔۔ اَنْ یَّعْبُدُوْہُ: یعنی اسکی الٰہیت و ربوبیت کے مقتضا کے مطابق اسکی عبدیت و عبادت پر قائم ہو جائے۔۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔۔اسکی توحید کا اعتراف کر لے۔ پہلے معنی کے اعتبار سے 'لا یشر کوا'۔۔۔الخ تخصیص ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے تاکید۔

۶۔۔۔۔ اَنْ لَّا یُعَذِّبَ۔۔۔الخ: ارشاد ربانی ہے:

وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

'کفر کے سوا اللہ، جس گناہ کو، جس کیلئے بھی چاہے گا معاف فرما دے گا'

۔۔۔۔اس طرح کے ارشاد کے عموم سے اس بات کا امکان ظاہر ہوتا ہے کہ افراد امت میں سے ایک فرد بھی جہنم میں داخل نہ ہو۔

۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔ اسطرح کے ارشاد کے پیش نظر، یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ امت محمدیہ کا کوئی فرد جہنم میں داخل ہوگا۔ مگر چونکہ حضور نبیء کریم ﷺ نے یہ خبر دی ہے کہ آپکی امت کے گنہگاروں کی ایک جماعت بہر صورت جہنم میں داخل ہو جائے گی۔ اور انھیں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ انکے بدن کوئلے کی طرح سیاہ فام ہو جائیں گے۔ اسلئے ان حقائق کو تسلیم کر لینا ہم پر لازمی ہے ۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔عموم وعدے کے اعتبار سے تمام افراد امت کے جس عفو خداوندی کا ازراہِ عدل بعض افراد کیلئے نہ ہونا ارشاد رسول سے ثابت ہے، تو ارشاد خداوندی کے عموم کے پیش نظر جو بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی، وہ نبوت رسول کریم کے خبر دینے اور حقائق سے آگاہ کر دینے کے سبب یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ متقدمین و متاخرین میں سے تمام اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ جس کی موت ایمان پر ہوئی ہے، وہ بہر حال یقینی طور پر جنت میں داخل ہوگا۔ اب اگر وہ گناہوں سے محفوظ ہے جیسے نابالغ بچہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔وہ مجنون جو بالغ ہوتے ہی مجنون ہو گیا۔۔۔۔یا۔۔۔۔جس نے تمام گناہوں سے توبہ کر لی اور پھر توبہ کے بعد کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔۔۔۔یا۔۔۔۔وہ توفیق یافتہ جس سے پوری حیات میں کوئی گناہ صادر ہی نہیں ہوا، تو یہ سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور جہنم میں بالکل نہ جائیں گے۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔جہنم کے قریب لائے جائیں گے، اسکی صورت کیا ہوگی اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ 'جہنم پر ورود' سے مراد، پل صراط سے گزرنا ہے، جو پشت جہنم پر ہے۔

اب رہ گیا وہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اور بغیر توبہ مرگیا، تو اسکا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہے۔رب کریم چاہے تو معاف کر کے جنت میں داخل فرمادے، اور اگر چاہے تو اپنی مرضی کے مطابق عذاب میں مبتلا فرمائے اور پھر جنت میں داخل کردے۔۔۔۔الحاصل۔۔۔۔ایمان پر مرنے والا ہمیشہ جہنم میں نہیں رکھا جائے گا، چاہے اسکا عمل کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو۔ایسے ہی کفر پر مرنے والا کبھی جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ بظاہر کتنے ہی اچھے اعمال کیوں نہ انجام دیتا ہو۔یہی وہ مذہب ہے جو کتاب وسنت کے دلائل اور معتد بہ قابل اعتبار ائمہ کبار اور علماء ربانیین کے اجماع سے ثابت ہے۔

ان دلائل نے اہل حق کے مذہب کی صحت کا یقینی علم دیدیا ہے، تو اب اگر کسی حدیث کا ظاہر اسکے خلاف ہو، تو اسکی تاویل واجب ہے، تاکہ تمام دلیلوں میں موافقت ہوجائے۔ ﴿مرقات جزا، صفحہ ۸۴﴾

مذکورہ بالا تحریر سے ابوالاعلیٰ مودودی کے مذہب کا باطل ہونا ظاہر ہوجاتا ہے جس نے تارکین صوم وصلوٰۃ۔۔۔۔نیز۔۔۔۔تارکین حج وزکوٰۃ کو اپنے خطبات ومضامین میں کھلے لفظوں میں کافر کہا ہے، اور اپنی اعتزال پسندی اور خارجیت نوازی کا ثبوت دیا ہے۔

۷۔۔۔۔**اَفَلَا اُبَشِّرُ:** کسی کو ایسی خبر دینا جسے سن کر اسکے چہرے پر مسرت کے آثار ظاہر ہوجائیں 'بشارت ہے'۔ارشاد ربانی: **فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ** میں بشارت کا لفظ یا تو از راہ تحکم اختیار کیا گیا ہے۔۔۔یا۔۔۔بہ اصول تجرید اسکا معنی اچھی خبر دینے کی بجائے، صرف خبر دینا قرار دیا گیا ہے۔

۸۔۔۔۔**لَا تُبَشِّرْهُمْ:** بعض کے نزدیک نہی بعض کے ساتھ مخصوص ہے۔اسی کو دلیل بناتے ہوئے امام بخاری نے فرمایا ہے، کہ علماء کو چاہئے کہ ہر بات ہر ایک پر ظاہر نہ کیا کریں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ کا کچھ سمجھ لے۔غور کرو اسی طرح کی حدیثوں کو گمراہوں اور مباحیوں نے ترک تکالیف اور رفع احکام، کا ذریعہ بنالیا ہے اور اپنی دنیا وآخرت کو خراب کرلیا ہے۔

نہی کے بعد روایت حدیث کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے، کہ حضرت معاذ کو بشارت دینے سے روکا گیا اور پھر جب مناسب وقت میں نبی کریم نے مومنین کو خود ہی بشارت دے دی، اب اسکے بعد حضرت معاذ کا حدیث روایت کرنا بشارت دینا نہیں ہے، بلکہ صرف ایک واقعہ کی خبر دینا ہے اور اس خبر دینے سے انھیں روکا نہیں گیا۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ: ترمذی، نسائی اور ابوداؤد نے بھی اس کی روایت کی ہے۔

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِیْفُہٗ عَلَی الرَّحْلِ قَالَ یَامَعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ قَالَ یَامَعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ قَالَ یَامَعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ ثَلٰثًا قَالَ مَامِنْ اَحَدٍ یَّشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًارَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقًا مِّنْ قَلْبِہٖ اِلَّاحَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِہِ النَّاسَ فَیَسْتَبْشِرُوْا قَالَ اِذًا یَّتَّکِلُوْا فَاَخْبَرَ بِھَا مَعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِہٖ تَاثُّمًا ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ﴾

حضرت انس راوی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ سواری پر رونق افروز تھےاور حضرت معاذ آپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ آپ نے (حضرت معاذ کومخاطب کرکے) فرمایا معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا یارسول اللہ میں آپکی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ نے (پھر) فرمایا معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا یارسول اللہ میں آپکی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ نے (پھر) فرمایا معاذ! حضرت معاذ نے عرض کیا یارسول اللہ میں آپکی خدمت میں حاضر ہوں۔۔۔ الغرض۔۔۔ نبی کریم ﷺ نے یونہی (تین مرتبہ خطاب فرمایا اور پھر) ارشاد فرمایا، جوشخص دل کی سچائی کے ساتھ اس امر کی شہادت دے، کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد خدا کے رسول ہیں، خداوند تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ پر حرام فرمادے گا۔ (حضرت معاذ نے یہ سن کر) بارگاہِ رسالت میں عرض کیا، کہ یا رسول اللہ کیا میں اس سے لوگوں کو خبردار کردوں، کہ وہ اس بشارت کو سن کرخوش ہوجائیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا (نہیں) یہ سن کر وہ اسی پر بھروسہ کرلینگے۔ مرنے کے وقت حضرت معاذ نے اس حدیث کو بیان فرمادیا تاکہ وہ گنہ گار نہ ہوں۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔بعض نسخوں میں 'لَبَّیْکَ رَسُوْلَ اللّٰہِ' کالفظ ہے، یعنی حرف ندا محذوف ہے۔اب اگر روایت کے الفاظ یہی رہے ہوں، تو شاید حرف ندا کے حذف کی وجہ غایت قرب ہو۔۔۔نیز۔۔۔سرکار رسالت ﷺ کے ارشاد کی تعمیل اور آپ کی خدمت کی بجا آوری میں سرعت اور تیزی کا اظہار مقصود ہے۔

۲۔۔۔ثَلٰثًا: حضور ﷺ نے اپنے اس خطاب میں تاکید ومبالغہ سے کام لیا ہے، تاکہ حضرت معاذ آپ کا کلام بلاغت نظام سننے کیلئے کافی ہوشیار و چوکنا ہو جائیں۔

۳۔۔۔لَبَّیْکَ: لبیک کا معنی قبول کرنا اور اطاعت کرنا ہے۔اب لبیک وسعدیک کا معنی یہ ہوا کہ میں آپکی خدمت وطاعت وموافقت کیلئے حاضر ہوں، فرمائیے آپ کیا فرماتے ہیں۔

۴۔۔۔صِدْقًامِّنْ قَلْبِہٖ: یعنی ایسی سچائی اور ایسا اخلاص ہو جو دل سے پیدا ہوا ہو اور جو کذب ونفاق کے شائبہ سے بالکل خالی ہو۔

۵۔۔۔اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ: اس ارشاد کے کئی معنی ہوسکتے ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔اللہ تعالی اسے جہنم کی اس آگ پر حرام فرمادے گا، جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔اللہ تعالی اس پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوزخ میں رہنا حرام فرمادیتا ہے۔

۶۔۔۔حضرت ابن مسیّب کا ارشاد ہے، کہ یہ حکم فرائض واوامر ونواہی کے نزول کے پہلے کا ہے۔حضرت حسن بصری فرماتے ہیں، کہ اسلامی فرائض وحقوق کی ادائیگی کے ساتھ اس کلمہ کا ادا کرنا اس ارشاد میں مقصود ہے۔بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ حکم خاص کر کے اس کیلئے ہے، جو توبہ وندامت کے بعد یہ کہے اور پھر مر جائے۔

۷۔۔۔تَاَثُّمًا: تاثم کہتے ہیں گناہ سے بچنے کو۔حدیث شریف میں ہے 'تاثموامن التجارۃ'' یعنی اس گناہ سے بچو جو تجارت سے حاصل ہو۔

۸۔۔۔تَاَثُّمًا: اس لفظ سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مذکورہ ارشاد کی لوگوں کو خبر دینے کی ممانعت، علم کے کتمان وپوشیدگی کی ممانعت سے پہلے کی چیز تھی۔

۱۔۔۔ **لَبَّیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْكَ**: اَیْ اَجَبْتُ لَكَ اِجَابَةً بَعْدَ اِجَابَةٍ اَوْاَقَمْتُ عَلٰی طَاعَتِكَ اِقَامَةً بَعْدَ اِقَامَةٍ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَ سَاعَدْتُّ طَاعَتَكَ مُسَاعَدَةً بَعْدَ مُسَاعَدَةٍ: ۔۔۔یعنی۔۔۔اے اللہ کے رسول میں آپ کے حکم کی تعمیل کیلئے مسلسل کمر بستہ ہوں۔اور میں نے آپ کی فرمانبرداری کی، موافقت کی، دائمی موافقت۔

۲۔۔۔**لَبَّیْكَ**۔۔الخ: معلوم ہوا کہ چھوٹے پر لازمی ہے کہ وہ بڑے کا ادب بہرصورت کرے۔

۳۔۔۔ **ثَلٰثًا**: یعنی یہ سوال وجواب تین مرتبہ واقع ہوا۔حضور ﷺ جو ارشاد فرمانا چاہ رہے ہیں وہ بہت ہی مہتم بالشان امر ہے۔اسکی تفہیم کیلئے تاکیداً سرکار نے تین بار خطاب ارشاد فرمایا۔ اس طرح حضرت معاذ کا اشتیاق بھی بڑھ گیا اور ظاہر ہے کہ جوبات انتظار کے بعد سنی جاتی ہے، وہ خوب یاد رہتی ہے اور دل میں اسکی اثر اندازی کی کیفیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

۴۔۔۔ **صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهٖ**: یہاں سے اشارہ ہوگیا کہ صدق کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ صدق ہوتا ہے، جو قلب سے ہو اور دوسرا وہ صدق جو قلب سے نہ ہو۔دوسرے صدق کی مثال منافقوں کا یہ قول ہے کہ: اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں) بات بالکل سچی ہے، مگر چونکہ منافقین کے قلب واختیار سے باہر ہے، اسلئے لائق اعتبار نہیں۔

۵۔۔۔ **صِدْقًا**: اس لفظ کو صادقا کے معنی میں لے کر یشھد کے فاعل کا حال بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔قلب کی سچائی کی صورت یہ ہے کہ 'دل سے مانے زبان سے اقرار کرے'۔لہٰذا منافق اس بشارت سے علیحدہ ہے اور ساتر 'یعنی دل کا مومن اور زبان کا خاموش'، اس پر شریعت میں اسلامی احکام جاری نہ ہوں گے۔خیال رہے کہ عمر میں ایک بار زبان سے کلمۂ شہادت پڑھنا فرض ہے، اور مطالبہ کے وقت بھی ضروری۔

۶۔۔۔ **اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَی النَّارِ**: یہاں تحریم سے مراد منع ہے، نہ کہ اصطلاح شرعی والی حرمت۔۔۔اس ارشاد کی توجیہہ میں اقوال ملتے ہیں۔ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے، کہ آگ

اسکے دل وزبان کو جلا نہ سکے گی، کیونکہ یہ ایمان وشہادت کے مقام ہیں۔ رہ گئے کافر تو ان کا قلب و سینہ سب جہنم اور اسکی آگ کا ایندھن ہیں۔

ارشاد ربانی ہے: **تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ** یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مرتے وقت ایمان لائیں اور کسی عمل کا موقع نہ پائیں۔ مگر اقرب یہی ہے کہ تحریم خلود مراد لی جائے یعنی جو دل کی سچائی کے ساتھ کلمہ شہادت پڑھے گا، وہ آگ میں ہمیشہ نہ رہے گا۔

۷۔۔۔۔**اَفَلَا اُخۡبِرُ بِهِ النَّاسَ**: حضرت معاذ نے اس بشارت کی تبلیغ کی اجازت مانگی تاکہ ظاہر ہو جائے کہ یہ حکم تبلیغی امور سے ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسرار الٰہیہ سے۔

۸۔۔۔۔**فَيَسۡتَبۡشِرُوۡا**: یعنی جب میں انہیں یہ خبر دوں گا تو وہ خوش ہو جائیں گے اور خوشی کے اثرات انکے چہروں سے ظاہر ہوں گے، اسلئے کہ اس خبر میں عفو عظیم کی بشارت ہے ۔۔۔نیز۔۔۔ اس سے پہلے انھوں نے اسے سنا بھی نہیں۔

۹۔۔۔۔**اِذًا يَّتَّكِلُوۡا**: یعنی تم انھیں خبر نہ دو، اسلئے کہ یہ بشارت پاکر وہ 'الطاف ربوبیت' پر اعتماد کر کے 'حق عبودیت' کے تارک ہو جائیں گے، جسکے نتیجے میں انکے حالات کمتر ہو جائینگے اور درجات نزول پذیر ہو جائیں گے۔ یہ حکم اکثر عوام کے خیال سے ہے، ورنہ خواص کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ بشارت سن کر انکی عبادت اور بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ نیکیاں کرنے لگتے ہیں۔ حضرات عشرہ مبشرہ کے حالات جس پر شاہد عدل ہیں۔ حضور ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ رات میں اتنا قیام فرماتے ہیں کہ آپکے پائے مبارک پر ورم آ جاتا ہے اور حال یہ ہے کہ: قَدۡ غَفَرَ **لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ**۔۔ تو حضور نے ارشاد فرمایا: 'اَفَلَا اَكُوۡنَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا' کیا میں شکر گزار بندہ نہ رہوں۔

۱۰۔۔۔۔**تَاَثُّمًا**: یعنی کتمان علم کے گناہ سے بچنے کیلئے، اسلئے کہ حدیث شریف میں ہے:

مَنۡ كَتَمَ عِلۡمًا اُلۡجِمَ بِلُجَامٍ مِنَ النَّارِ

جو علم کو چھپائے گا، اسے آگ کی لگام دی جائے گی

۱۱۔۔۔۔ **عِنۡدَ مَوۡتِهٖ**: یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے حضور نے اس بشارت سے اس وقت منع کیا تھا، جب اکثر لوگ نومسلم تھے اور حدیث دانی کا ملکہ کم رکھتے تھے۔ اب حالات بدل چکے ہیں، لوگ ذی شعور اور سمجھدار ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ہے اجتہاد صحیح۔

۱۲۔۔۔۔بخاری نے کتاب العلم کے اواخر میں اور مسلم نے کتاب الایمان میں اس روایت کو بیان فرمایا ہے۔ امام احمد نے بھی حضرت جابر ابن عبد اللہ انصاری سے سند صحیح کے ساتھ اسکی روایت کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْهِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَهُوَ نَآئِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُهٗ وَقَدِاسْتَیْقَظَ فَقَالَ مَامِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّادَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَاِن زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ اِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ وَکَانَ اَبُوْ ذَرٍّ اِذَاحَدَّثَ بِهٰذَا قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ ﴿متفق علیه﴾

حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ ایک روز میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ اس وقت سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے (میں واپس چلا گیا اور کچھ دیر بعد) دوبارہ حاضر ہوا، تو آپ جاگ رہے تھے۔ آپ نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا، جس شخص نے (سچے دل) سے لاالہ الا اللہ کہا اور اسی پر اسکا خاتمہ ہوا (یعنی زندگی کے اخیر لمحے تک اس عقیدہ میں تبدیلی نہ ہوئی) تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر، حضور سے عرض کیا کہ خواہ وہ شخص زانی اور چور ہو، میں نے دوبارہ عرض کیا خواہ وہ شخص زنا کرے اور چوری کرے، آپ نے پھر فرمایا خواہ وہ شخص زنا کرے اور چوری کرے، میں نے پھر (تیسری بار) عرض کیا کہ خواہ وہ شخص زنا اور چوری کرے۔ آپ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ شخص زانی و چور ہو۔ ابوذر کی ناک رگڑنے کے باوجود حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان فرماتے تھے تو رسول کریم ﷺ کا یہ جملہ بھی کہ 'ابوذر کی ناک خاک آلود ہو' بیان فرمادیا کرتے تھے۔

﴿بخاری ومسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ: آپ زہاد صحابہ میں سے تھے، مال جمع نہ کرنا آپکا مذہب تھا، خواہ اسکا حق ادا کر دیا گیا ہو۔آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔

۲۔۔۔عَلَیْهِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ ۔۔۔الخ: نبی کریم ﷺ کے احوال شریف پر اپنی اطلاع کو دلائل سے موکد ومحقق کرنے کیلئے یہ ارشاد فرمایا، تاکہ واضح ہو جائے کہ روایت کا ہوش وگوش کی کامل بیداری اور حقائق کی جستجو کے جذبہ ءفراواں کے ساتھ کامل ربط ہے۔۔۔ اس سے قطع نظر، یہ بات بھی تو ہے کہ محبوب کے احوال شریف کا ذکر ایک محبِّ صادق کیلئے بے حد لذیذ وشیریں ہوتا ہے۔۔۔۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وحی اسی خواب میں نازل کی گئی ہو۔لہٰذا اس خواب کوخصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا۔

۳۔۔۔وَاِنْ زَنٰی ۔۔۔الخ: حضرت ابوذر کو یہ حکم بظاہر بعید از قیاس اور نادر محسوس ہوا، لہٰذا آپ نے حیرت واستعجاب کے عالم میں بار بار اسکو دہرایا۔۔۔۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد سن کر رحمت حق اور نعمت الٰہی کی بے پناہ نوازشات کو دیکھ کرخوشی، مسرت اور شکر گزاری کے جذبہء فراواں کے تحت بار بار اس فقرے کو دہراتے رہے۔

۴۔۔۔ عَلٰی رَغَمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ: الرغم والرغام بالفتح: مٹی۔رغم۔رغما۔ مثلثہ الراء۔من سمع وفتح۔کہاجاتا ہے ارغم اللہ انفہ یعنی انفہ بالرغام یعنی اللہ اسکی ناک کوخاک آلود کرے۔پھر اسکا استعمال ذلت، مجبوری اور ناپسندیدگی کے معنی میں ہونے لگا۔حدیث میں ہے:

اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ فَیلْزِمْ جَبْهَتَهٗ وَاَنْفَهٗ عَلٰی الْاَرْضِ
حَتّٰی یَخْرُجَ مِنْهُ الرَّغْمُ اَیْ حَتّٰی یَظْهُرَ ذُلَّهٗ وَخُضُوْعَهٗ
جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنی پیشانی اور ناک کوزمین سے ٹیک دے،
تاکہ اسکے اس عمل سے اسکی عاجزی اور فروتنی کا اظہار ہو۔

۔۔۔۔دوسری حدیث میں ہے:

سَجدَتَیِ السَّهْوِ کَانَتَا تَرْغِیْمًا لِلشَّیْطَانِ اَیْ اِغَاظَةً وَاِذْلَالًا

یعنی میرے سہو کے دونوں سجدے پر برانگیختہ کرنا ہے
۔۔۔الحاصل۔۔۔عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذرٍ کا معنی یہ ہوا کہ وَاِنْ ذَلَّ وَکَرِہَ اَبُوْذَرٍ اگرچہ یہ ابی ذر کو پسند نہ ہو۔حضرت ابوذر نے وجودِ زنا اور وجودِ سرقہ کے ساتھ، دخولِ جنت کو مستعبد تصور فرمالیا تھا، تو گویا انھوں نے اسکی نفی کی کوشش فرمائی۔اب ان کی خواہش کے خلاف حکم صادر فرمانا، گویا ان پر ایک طرح کا جبر واکراہ ہے۔

۵۔۔۔وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ : حضرت ابوذر نے اپنے بارے میں حضور ﷺ سے جو سنا اور ہر بار روایت حدیث کے وقت بیان فرمانا، جہاں اس واقعہ کی یاد ہے۔۔۔نیز۔۔۔اسکی تاکید وتحقیق ہے، وہیں یہ بھی اشارہ ہے کہ محبوب کی طرف سے محب کو اگر کوئی سخت بات بھی ملتی ہے، تو وہ اس کیلئے سخت نہیں ہوتی، بلکہ محب اسے ایک عظیم تحفہ سمجھتا ہے اور اسکی بار بار یاد سے اسے لذت ملتی ہے۔

۶۔۔۔یہ حدیث اور اس کی امثال دوسری حدیثیں، اس بات پر شاہد عدل ہیں، کہ مومن اگر فاسق ومرتکب کبیرہ ہو، بہشت میں ضرور داخل کیا جائے گا۔۔۔اب اس کا یہ دخول خواہ ابتداء ہی میں رب تعالیٰ کی عفو ومغفرت یا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے ہو، یا بقدر گناہ دوزخ کے عذاب کاٹ لینے کے بعد ہو۔

رہ گئی 'حدیث تحریم علی النار' تو اسکی تاویل وہی ہے، جو 'حدیث معاذ' میں ذکر کی گئی ہے۔سبب دخولِ جنت یہ ہے، کہ فاسق مومن ہے اور مومن کا انجام کار بہشت ہے۔اس باب میں حدیث صحیحہ بکثرت ہیں اور اس پر صحابہ وتابعین اور تمام سلف صالحین کا اجماع ہے، اور معتزلہ وغیرہ کے ظہور سے پہلے ساری امت کا یہی عقیدہ تھا۔معتزلہ کا خیال ہے کہ فاسق مومن نہیں ہے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔اور عمل ایمان کی حقیقت میں داخل ہے۔انکا کہنا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں گے کہ صرف لاالہ الا اللہ کہہ دینے سے انسان جنت میں داخل ہوجائے گا، تو لوگ اسی پر اعتماد کرکے مغرور ہوجائینگے اور پھر فسق وفجور اور گناہوں کا ارتکاب کرتے رہیں گے۔ان کا خیال ہے کہ اس طرح سے لوگ شریعت کی قید سے آزاد ہوجائینگے۔۔۔حالانکہ انکا یہ سب کچھ گمان کرنا باطل ہے۔اسلئے کہ گنہگاروں کیلئے جو وعیدات و تہدیدات وارد ہوئی ہیں، وہ بے شمار ہیں جو زجر وتوبیخ اور انذار وانزجار کیلئے کافی ہیں۔اگر اب رب تبارک وتعالیٰ چاہے، تو صرف ایک گناہ پر ایسا عذاب فرمالے جسکی کوئی انتہا نہ ہو۔گنہگار مسلمان کے عذاب کی ادنیٰ مدت وہی ہے، جو پوری دنیا کی عمر کی مدت ہے۔اور دنیا کی عمر سات ہزار سال کی ہے اور ایک روایت میں کچھ زائد آیا ہے۔

۷۔۔۔۔ذہن نشین رہے کہ ثابت ودائم رہنے والے صدق اخلاص کے ساتھ کہ کسی منافی و مخالف صدق واخلاص۔۔۔۔مثلاً: شک وتردد کا عروض نہ ہوسکے۔اس کلمہ شریفہ کا صدور کوئی آسان کام نہیں، خصوصاً فاسقین وفاجرین سے، جوظلمات وشبہات میں گھرے ہوئے ہیں اور جہالت وبے راہ روی کے دریا میں غوطہ زن ہیں۔۔۔۔اب اگر بالفرض باوجوداس فسق کے تصدیق یقینی حاصل ہواور نفس وشہوت کے غلبہ سے کوئی معصیت صادر ہوجائے،اورخوف وجزع وفزع اورعزم توبہ اسکے مقارن و متصل ہو، توبہ مقتضائے وعدۂ کرم، امید ہے کہ وہ بخش دیا جائیگا اور جزاوسزااورعذاب وعتاب کے بعد بالآخراسے بہشت عطا کی جائے گی۔

يَحكُمُ اللّٰهُ مَايَشَاءُ يَفْعَلُ مَايُرِيْدُ وَهُوَ العَزِيْزُ الحَكِيْمُ

۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔عمل اصل ایمان میں داخل نہیں، ہاں کمال ایمان میں ضرور داخل ہے، لہٰذا بداعمالی، اصل ایمان میں خلل انداز نہیں، بلکہ کمال ایمان میں نقصان پہنچاتی ہے۔

عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ اِبْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتِهٖ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَاكَانَ مِنَ الْعَمَلِ. ﴿متفق علیہ﴾

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اس امر کی گواہی دے، کہ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسکا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ محمد خدا کے بندے ہیں، اور خدا کے رسول ہیں، اور یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بندے، خدا کے رسول، خدا کی لونڈی کے بیٹے اور خدا کا کلمہ ہیں، جن کو خدا نے مریم کی جانب ڈالا، اور خدا کی بھیجی ہوئی روح ہیں، اور یہ کہ بہشت و دوزخ حق ہیں۔ خدا اس شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا، خواہ اسکے اعمال کیسے ہی ہوں۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔اَنَّ عِیۡسٰی عَبۡدُ اللّٰہِ وَرَسُوۡلُہٗ: حضرت عیسیٰ کیلئے عبدیت وبندگی کا اثبات فرما کرنصاریٰ کی تردید فرمادی، جوحضرت عیسیٰ کواللہ ۔۔۔یا۔۔۔ ابن اللہ کہتے ہیں اور رسولہ فرما کر یہودیوں کا بھی رد فرمادیا، جوحضرت عیسیٰ کی رسالت کے منکر ہیں۔

۲۔۔۔اِبۡنُ اَمَتِہٖ: جس طرح مرد کو عبداللہ کہتے ہیں، اسی طرح عورت کو امۃ اللّٰہ کہتے ہیں۔۔۔الحاصل۔۔۔تمام مرد خدا کے بندے اور عورتیں اسکی کنیزیں ہیں۔۔۔حضرت عیسیٰ کو فرزند کنیز فرما کر نصاریٰ کا دوبارہ رد فرمایا گیا، اوران پر پہلی تردید کی تاکید فرمادی۔۔۔طیبی کا کہنا ہے کہ اس میں یہودیوں کا بھی رد ہے۔ جنھوں نے حضرت مریم پر تہمت باندھی۔ اس ارشاد سے حضرت مریم کی برأت ظاہر ہوتی ہے، اس قذف وشتم سے جسکا اختراع یہودیوں نے کیا تھا۔

۳۔۔۔وَکَلِمَتہ: حضرت عیسیٰ کو کَلِمَۃُ اللّٰہِ فرمایا اسلئے کہ آپ صرف لفظ کن سے پیدا کئے گئے۔ اور آپ کی پیدائش میں باپ اور اسباب عادی کی وساطت نہیں اختیار کی گئی۔۔۔یا۔۔۔ اسلئے کہ آپ نے بوقت صغر سنی گہوارہ میں تکلم فرمایا، پس آپ اسم المتکلم کے مظہر کامل ہوئے۔

۴۔۔۔وَرُوۡحٌ مِّنۡہُ: آپ کو روح اللہ اسلئے کہتے ہیں، کہ آپ نے مردوں کو زندہ فرمایا ۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ مردہ دلوں کو زندگی بخشی۔۔۔یا روح سے مراد ایسی روح والا ہے، جسکا صدور وظہور اصل ومادہ کی وساطت کے بغیر حق تعالیٰ کی قدرت سے ہوا ہو۔

۵۔۔۔وَالۡجَنَّۃُ وَالنَّارُ حَقٌّ:۔۔ مَنۡ شَہِدَ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فرما کر مبدء کا ذکر فرمایا اور والجنۃ والنار کہہ کر معاد کا تذکرہ کردیا۔

۶۔۔۔حق سے مراد اگر موجود ثابت ہے، تو یہ صفت مشبہ ہے اور اگر حق صدق کے معنی میں ہے، تو یہ زید عدل کے قبیل سے ہے اور صدق بمعنی صادق ہے۔

۷۔۔۔اَدۡخَلَہُ اللّٰہُ الۡجَنَّۃَ: یا تو ابتداءً اپنے عفو وکرم سے یا شفاعت رسول سے۔

اور یا اپنی مشیت کے مطابق عذاب وعتاب کے بعد۔

۸۔۔۔۔ **عَلٰی مَا کَانَ مِنَ الْعَمَلِ**: بعض نسخوں میں ہے۔ عَلٰی مَا کَانَ عَلَیْہِ مِنَ الْعَمَلِ اَیْ کَائِنًا عَلٰی اَیِّ عَمَلٍ کَانَ عَلَیْہِ مِنْ صَغِیْرَۃٍ اَوْ کَبِیْرَۃٍ یعنی اس کا عمل کیسا ہی ہو، خواہ وہ صغیرہ کا مرتکب ہو یا کبیرہ کا۔ معلوم ہوا کہ زیر شرح روایت میں یا تو علیہ محذوف ہے۔۔۔۔ یا ۔۔۔۔اس میں کان تامہ ہے۔

فوائد

۱۔۔۔۔ **عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ**: نصوص میں رسول کریم کی عبدیت پر اصرار صرف ابنیت کی نفی کیلئے ہے، جو عبداللہ ہوگا وہ ابن اللہ نہیں ہوسکتا، اور چونکہ صرف عبداللہ کے ذکر سے بظاہر دوسرے عام بندوں سے اشتراک ومساوات کا واہمہ ہوسکتا تھا، اسلئے عبداللہ کے ساتھ رسول اللہ کی بھی قید لگا دی، تاکہ جہاں آپ کو عبداللہ کہنے والا ابن اللہ نہ کہہ سکے، وہیں رسول اللہ کہنے والا اپنا جیسا نہ سمجھ سکے ۔۔۔۔امام العارفین شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ:

> 'مقام عبدیت جو آنحضرت ﷺ کا خاص مقام ہے، ایک دفعہ مجھ پر سوئی کے ناکہ کے برابر منکشف ہوا تھا، تو میں اسکی بھی تاب نہ لاسکا اور قریب تھا کہ جل گیا ہوتا۔'
>
> ﴿ترجمان السنۃ، جلد سوم، ص ۲۳۵، مرتبہ بدر عالم میرٹھی﴾

اللہ اکبر! کیا شان عبدیت ہے۔ بھلا کیا نسبت اس رفیع المنزلت عبدیت کاملہ سے، ہم جیسوں کی عبدیت کو۔۔۔۔ بعض اولیاء کاملین نے غیر مبہم لفظوں میں رسول عربی کی عبدیت کو آپ کی رسالت پر افضل قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر روح البیان اور الحقیقۃ المحمدیہ، وجیہ الدین علوی گجراتی)

یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ اگر ساری کائنات کے غیر نبی افراد مل جائیں، پھر بھی وہ اپنی ذات وصفات اور جملہ کمالات کے ساتھ، رسول کریم کے مقام رسالت تک نہیں پہنچ سکتے۔ یعنی کسی غیر نبی کی ذات یا اسکی کوئی صفت، کمال رسالت کی طرح نہیں ہوسکتی، پھر کسی غیر نبی کی عبدیت اس نبی کی اس عبدیت کی طرح کیسے ہوسکتی ہے، جو عبدیت خود اسکی رسالت پر افضل ہے۔

تو اب ہمارا اپنے آپ کو عبد کہنا اور رسول کریم کو عبد کہنا، ایسا ہی ہے کہ جیسے ہم اپنے کو بھی موجود کہتے ہیں اور خدا کو بھی موجود کہتے ہیں۔ جس طرح ہماری موجودیت کو خدائی موجودیت سے کوئی نسبت نہیں، یونہی ہماری عبدیت کو رسول کریم کی عبدیت سے کوئی نسبت نہیں۔ حدیث میں پہلے عبدہ اور پھر رسولہ فرمانے میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے، کہ نبی کریم کی عبدیت کا کمال آپ کے کمالِ رسالت پر افضل واقدم واول ہے۔۔۔۔الختصر۔۔۔۔حدیث میں عبد سے مراد 'عبدِ کامل' اور رسول سے مراد 'رسولِ اکمل' ہے۔

۲۔۔۔۔**اِبْنُ اَمَتِہٖ**: اس میں موجودہ زمانے کے قادیانیوں کی بھی اعلیٰ تردید ہے، جو حضرت عیسیٰ کو یوسف نجار کا بیٹا کہتے ہیں اور حضرت مریم کا نکاح ان سے ثابت کرتے ہیں۔ اسلئے کہ اگر حضرت مسیح کسی باپ کے بیٹے ہوتے، تو اسی کی طرف آپ کی نسبت ہوتی۔ قرآن کریم نے بھی انھیں عیسیٰ ابن مریم فرمایا۔ حالانکہ ارشاد ہے: **اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ**۔۔۔امتہ کی اضافت تشریف کیلئے ہے۔

۳۔۔۔۔**وَكَلِمَتِہٖ**: حضرت عیسیٰ کے جسم وروح دونوں کی پیدائش لفظ کن سے ہوئی اور حضرت آدم کا جسم مٹی سے بنایا گیا اور پھر اس میں روح پھونکی گئی، اسی لئے حضرت آدم کو کَلِمَۃُ اللّٰہ کا خطاب نہیں دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہنے کی ذکر کردہ وجوہات کے سوا، یہ وجہیں بھی ہوسکتی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔آپ سرتاپا اللہ کی حجت ہیں: گویا سراپا کلمہ ہیں، جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور عالم شیر خوارگی میں کلام فرمایا۔

﴿۲﴾۔۔۔کلمۃ اللہ کی ترکیب سیف اللہ اور اسد اللہ کی طرح ہے: خدا کی راہ کا مجاہد اللہ کی تلوار ہے۔ خدا کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے والا اللہ کا شیر ہے۔ اور صغرسنی کے عالم ہی میں خدا کی الٰہیت و الوہیت کو سمجھانے کیلئے انی عبد اللّٰہ فرما کر، اپنی عبدیت کو ظاہر کرنے والا، اللہ کا کلمہ ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔آپ ایک کلمہ 'دم' فرما کر مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست فرما دیا کرتے تھے (پتہ چلا کہ بزرگوں کی 'جھاڑ پھونک' غیر اسلامی عمل نہیں)۔

۴۔۔۔۔**رُوْحٌ مِّنْهُ**: یعنی جسکی پیدائش صرف ارادۂ الٰہی سے ہوئی ہو۔ اسلئے کہ دوسری ارواح بشریہ، گویا اپنے آباء کی ارواح سے متولد ہیں ۔۔۔۔بالخصوص۔۔۔۔انکے مذہب پر، جنکے نزدیک یہ ارواح بھی اجسام ہیں۔۔۔۔جو بدن میں رواں دواں ہیں، جیسے کہ گلاب کا پانی گلاب کے پھول میں ۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسلئے روح کہا کہ حضرت جبرائیل نے باذن الٰہی 'کن' کہہ کر حضرت مریم کے سینے پر پھونکا جس سے آپ حاملہ ہوگئیں اور لوث نطفہ سے پاک رہیں۔۔۔۔علقہ و مضغہ کے منازل پیش

نہیں آئے۔باقی توجیہیں جواہر پارے میں گزریں۔

۵۔۔۔۔ایک عیسائی نے جب ایک قاری کو یہ پڑھتے ہوئے سنا۔ رُوْحٌ مِّنْهُ تواس نے کہا کہ یہی تو نصاریٰ بھی کہتے ہیں۔یعنی نصاریٰ کا یہ کہنا ہے،کہ حضرت عیسیٰ اللہ کا بعض ہیں۔اس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے،اسلئے کہ اس میں رُوْحٌ مِّنْهُ ہیں،جسکے معنی ہی یہ ہونگے 'کہ مسیح خدا کا ٹکڑا ہیں'۔ عیسائی کے اس اعتراض کا جواب،علی بن حسین بن واقد نے برجستہ یہ دیا،کہ ارشاد ربانی ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴿سورة الجاثية:۱۳﴾

اور قابو میں کردیا تمہارے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے،سب اپنی طرف سے۔

۔۔۔تواب اگر رُوْحٌ مِّنْهُ کا ترجمہ یہ کیا جائے گا کہ اسکا بعض،اسکا جزء،توپھر جَمِيْعًا مِّنْهُ کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ تمام کائنات خدا کا بعض اور خدا کا جزء ہے۔۔۔۔یہ سن کر نصرانی مسلمان ہوگیا اور اس پر واضح ہوگیا کہ مِنْهُ میں مِنْ تبعیض کیلئے نہیں ہے۔بلکہ صرف بیان کیلئے ہے،کہ ان اشیاء کی تسخیر کی قوت بارگاہ خداوندی ہی سے حاصل ہے اور وہی انکا موجد ومکون ہے۔اسی طرح رُوْحٌ مِّنْهُ کا معنی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کی جانب سے ہیں۔

۶۔۔۔۔جنت کی دو قسمیں ہیں،ایک:'جنت حسی'،دوسری:'جنت معنوی'۔۔۔۔'جنت حسی'، معروف ومتعارف ہے۔۔۔'جنت معنوی'،اللہ کی ذات وصفات،اس کے افعال، ملائکہ کروبیہ،عالم روحانیت،طبقات ارواح اور عالم سماوات کی کامل معرفت تک پہنچنے کا نام ہے۔اس حیثیت سے کہ سالک کی روح اس آئینہ کی طرح ہوجائے،جو عالم قدس کے مقابل ہو۔اس جنت کے درخت،ملکات حمیدہ اور اخلاق سعیدہ ہیں۔جسکا تعلق کسب واختیار سے ہے،اور اس کے پھل مکاشفات ومشاہدات و اشارات والہامات وغیرہ ہیں،جنکا تعلق اللہ تعالیٰ کے فضل وعطا سے ہے۔۔۔اس 'معنوی جنت' سے جسے وہ مقام مل گیا،تووہ اسی طرح کا مقام 'جنت حسی' میں بھی پائے گا۔

اسکے برخلاف،جس نے حق سے اعراض کیا،روح محبت وقرب سے ہٹ کر قہر وبعد کی سیاست میں جا پڑا اور 'جنت علویہ' سے گر کر 'عالم نار' میں جا پہنچا،اسے آتش روحانی سے عذاب وعتاب میں مبتلا کیا جائے گا،جسکی پیدائش صفت قہر الٰہی کے غلبہ واستیلا سے ہوئی ہے،اور جو آتش جسمانی سے زیادہ شدت ودوام رکھتی ہے۔اسلئے کہ آتش جسمانی کی حرارت آتش روحانیہ ملکوتیہ کی تابع ہوتی ہے اور آتش روحانیہ،آتش غضب الٰہی کی چنگاریاں ہیں۔۔۔جو بے شمار تنزلات کے بعد اس درجہ کو پہنچی ہیں۔۔۔۔ یہی مطلب ہے اس ارشاد کا جس میں فرمایا گیا ہے،کہ جہنم کی آگ کو ستر مرتبہ پانی سے دھوکر دنیا کی

طرف نازل کیا گیا تاکہ اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو۔

۷۔۔۔۔**اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ** : اعلیٰ درجہ کے متقی کو جنت کا اعلیٰ درجہ دیا جائے گا اور ادنیٰ درجہ کے متقی کو وہاں کا ادنیٰ مقام۔ یہ ان لوگوں کیلئے جنھیں جنت کسب سے ملے۔ اور جو دوسروں کے طفیل جنت میں جائیں گے، وہ ان کے ساتھ رہیں گے، جیسے مسلمانوں کے شیر خوار بچے اور بیویاں۔ لہٰذا حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ اور ازواج پاک جنت میں حضور کے ساتھ ہونگے۔

خیال رہے کہ جنت میں داخلہ ایمان کی بنا پر ہوگا۔ لیکن وہاں کے مراتب اعمال کے مطابق ملیں گے۔ جنت کا داخلہ تین طرح کا ہے: کسبی، وہبی، عطائی۔ یہاں کسبی کا ذکر ہے۔

۸۔۔۔۔**مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ** : نسائی نے بھی اسکی روایت کی ہے۔امام احمد نے بھی اپنی مسند میں اسکی تخریج فرمائی ہے۔واخرجه البخاری فی الانبیاء و مسلم فی الایمان۔

عَنْ عَـمْـرِو بْـنِ الْـعَـاصِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَـلَّـمَ فَـقُـلْـتُ اُبْسُـطْ يَـمِيْنَکَ فَلِاُبَايِعْکَ فَبَسَطَ يَمِيْنَهٗ فَقَبَضْتُ يَدِیَّ فَقَالَ مَالَکَ يَاعَمْرُو قُلْتُ اَرَدْتُّ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا قُلْتُ اَنْ يُّغْفَرَ لِیْ قَالَ اَمَاعَلِمْتُ يَاعَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ يَهْـدِمُ مَـاكَانَ قَبْلَهٗ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْـدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهَا وَاَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ ﴿رواه مسلم﴾

-- - ,جمہء حدی $ - --

حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، یارسول اللہ آپ اپنا ہاتھ پھیلا یئے تا کہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کروں۔ (یعنی اسلام لے آؤں) آپ نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ معًا: میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے فرمایا عمرو! کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا، میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کہو کیا شرط کرنا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا، میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے (سابقہ) گناہوں کو بخش دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ عمرو! کیا تجھ کو معلوم نہیں، کہ اسلام ان تمام باتوں (گناہوں) کو مٹا دیتا ہے جو اسلام لانے سے پہلے کی ہوں اور ہجرت ان تمام چیزوں کو دور کر دیتی ہے، جو اس سے پہلے کی ہو اور حج ان تمام معاصی کو مٹا دیتا ہے جو حج سے پہلے کے ہوں ﴿مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔عَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ: آپ مشاہیر صحابہ سے ہیں۔آپ کا شمار عقلائے قریش میں ہوتا ہے۔

۲۔۔۔ فَلاُبَا يِعُكَ : اِمَّـا بِكَسْرِ اللَّامِ وَ نَصْبِ النَّحل عَلٰى اَنَّ اللَّامِ بمعنی کی وان مقدرة فالفاء زائده اواللام مقحمة للتاكيد۔

التفهيم: کسی کلمے کو دو متلازم کلموں کے درمیان داخل کرنا۔۔۔مثلاً:مضاف،مضاف الیہ کے درمیان جیسے رجل کا لفظ من کے درمیان۔اس قول میں قَطَعَ اللّٰهُ يَدَوَرِ جُلَ مَنْ قَالَهَا اسلئے کہ اصل ترکیب یوں ہے قَطَعَ اللّٰهُ يَدَ مَنْ قَالَهَا وَرِجْلَهَ وَالفَاءُ هِيَ الَّتِىْ يُقَدَّرُ بَعْدَهَا اَنْ اَوْبِفَتْحِ اللَّامِ الْاِبْتِدَائِيةِ وَالفِعْلُ مَرْفُوْعٌ۔۔۔المختصر۔۔۔فلا بايعك کو لام کے زیر اور عین کے زبر۔۔۔ نیز۔۔۔لام کے زبر اور عین کے پیش دونوں طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔

۳۔۔۔ تَشْتَرِطُ مَاذَا: ما حرف استفہام ہے اور حرف استفہام سے آغازِ کلام ہونا چاہئے اور اس سوال کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے:

﴿۱﴾۔۔۔ تَشْتَرِطُ سے پہلے مَاذَا مقدر ہے اور مذکور ماذا اسی کی تفسیر ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ جب حرف استفہام ماذا کے ساتھ مرکب ہو، تو اب اسے شروع کلام میں لانا ضروری نہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔ تَشْتَرِطُ سے پہلے حرف استفہام مقدر ہے اور ماذا اپنے فعل محذوف کے ساتھ کلام کی ابتداء ہے۔ان وجوہ میں وجہ ثالث اوجه الطف ہے۔

۴۔۔۔اَنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ: مظالم اور غیر مظالم، ہر طرح کے گناہ سے اسلام قبول کرتے ہی انسان پاک وصاف ہوجاتا ہے۔رہ گئی ہجرت اور حج، تو ان دونوں سے مظالم کے سوا جو دوسرے گناہ ہیں، وہ منہدم ہوجاتے ہیں۔یہی جمہور کا مسلک ہے۔ایک قول کے مطابق حج سے بھی مظالم منہدم ہوجاتے ہیں۔اس باب میں حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔

۵۔۔۔۔**وَاَنَّ الْھِجْرَۃَ**۔۔۔الخ: حضرت عمرو کو سرکار نے جو جواب ارشاد فرمایا اس میں صرف ہدم اسلام کا ذکر کافی تھا۔ مگر سرکارِ رسالت نے حج وہجرت کا ذکر جواب میں زیادہ فرما کر ظاہر فرمادیا، کہ حج وہجرت جن کا شمار فروع میں ہے، جب انکا یہ حال ہے، کہ وہ اپنے ماقبل گناہوں کو منہدم کردیتے ہیں، تو پھر اسلام جو اصل الاصول ہے، اسکا اپنے ماقبل کے کرتوتوں کو منہدم کرنا، کس طرح بعید از قیاس ہوسکتا ہے۔

۶۔۔۔۔**اَمَا عَلِمْتَ**: یہ اِعْلَمْ کے معنی میں ہے۔ اعلم کی جگہ اماعلمت فرما کر تنبیہ فرمادی کہ یہ تو بہت اہم امر ہے، یہ تو ہر ایک کو معلوم ہونا چاہئے۔ ﴿فافھم﴾

۷۔۔۔۔مسلم شریف کی حدیث ہے کہ حضرت عمرو بن العاص بوقتِ وصال، بڑے ہی قلق و اضطراب میں تھے اور بڑی ہی بیتابی کا مظاہرہ فرمارہے تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرو نے دریافت کیا کہ آپ اسقدر مضطرب کیوں ہیں پدر بزرگوار! آپ امید رکھیں، اسلئے کہ آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ اور آپ نے حضور کی خدمت میں نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ حضرت عمرو نے فرمایا کہ مجھے زندگی میں تین طرح کی حالت پیش آئی ہے۔ اب خدا جانے آخر میں کیا پیش آتا ہے۔ پہلی حالت تو یہ تھی کہ میں اللہ کے رسول کو بہت بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ آپ سے جنگیں لڑیں اور آپ کی عداوت میں کمربستہ رہا۔ دوسری حالت یہ ہوئی کہ آنخضرت ﷺ میرے نزدیک ترین ہوگئے اور آپ کی خدمت اور فرمانبرداری میں لگا رہا۔ آپ ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد امارت وحکومت اور چند عجیب وغریب حالات پیش آئے، جن میں افراط وتفریط دونوں کا گزر ہو گیا اور کچھ ایسی چیزیں واقع ہوگئیں کہ خدا ہی جانے کہ اب آخرت میں اس کا انجام کیا ہو۔

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے۔ کبھی ارشاد ہوا رب کی خوشنودی، باپ کی خوشنودی میں ہے۔ کبھی فرمایا ہے کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے، فرمایا تیری ماں۔ دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ گزارش کی پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا تیرا باپ، اور اسکے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ مجلس قدس میں تشریف فرما تھے۔ جاں نثار حاضر تھے۔ فرمایا وہ خوار ہوا۔ وہ خوار ہوا۔ وہ خوار ہوا۔ صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا، وہ جس نے اپنے ماں باپ کو، یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر (انکی خدمت کرکے) جنت نہ حاصل کرلی۔

ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے۔ فرمایا، وقت پر نماز پڑھنا، عرض کیا، پھر کون ہے؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ دریافت کیا پھر کون ہے؟ ارشاد ہوا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت کے بعد رکھا۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آ کر حضور ﷺ کی خدمت میں شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ فرمایا تمہارے والدین ابھی ہیں۔ عرض کیا جی ہاں، ارشاد ہوا۔ پھر ان کی خدمت کا فریضہء جہاد ادا کرو۔

ایک دفعہ صحابہ جو خدمت میں حاضر تھے حضور نے دریافت فرمایا: کیا تم کو میں بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں، یارسول اللہ! فرمایا خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں و باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے اور جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی۔ ﴿بخاری و کتاب الآداب﴾

۱۔۔۔ **عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ** : آپ عمرو ابن عاص سہمی قرشی ہیں۔ ۵ھ میں حضرت خالد ابن ولید اور عثمان ابن طلحہ کے ساتھ مدینہ میں آکر اسلام لائے، حضور نے انھیں عمان کا گورنر مقرر فرمایا۔ آپ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عامل رہے۔ آپ فاتح مصر ہیں۔ مصر ہی میں نوے ۹۰ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ ﴿مرات بحوالہ اکمال﴾

۲۔۔۔ **الْعَاصِ** : یہ لفظ عصی کا اسم فاعل نہیں ہے۔ لہٰذا اسکو معتل لام نہیں قرار دینا چاہئے، اور اسکے آخر میں یاء کے اثبات۔۔۔ نیز۔۔۔ حالت وقف و وصل میں اسکا حذف جائز نہیں سمجھنا چاہئے۔۔۔ المختصر۔۔۔ العاص کی کتابت و قرأت یاء کے ساتھ جائز نہیں، نہ وقفاً نہ وصلاً۔۔۔ اسلئے یہ معتل عین ہے۔۔۔ اسکے جوف ہونے پر قاموس کی یہ عبارت شاہد ہے:

الاَعُيَاسُ مِنَ الْقُرَيْشِ اَوْلَادُ اُمَيَّةَ بِنْ عَبْدِ شَمْسٍ

الاَ كُبَرِ وَهُمَ العَاصُ وَاَبُو العَاصُ وَالُعَيُصُ وَاَبُو الُعِيُصُ

۳۔۔۔**فَلِاُبَايِعُكَ**: یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں لام امر ہو، لہٰذا فعل کا آخر (یعنی کلمہ ع) مجزوم ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لام مفتوح ہو اور عین مضموم اور تقدیر عبارت یہ ہو 'فَـاِنّـي لِاُبَـايِعَكَ' فاء جزا کیلئے ہوگی، جیسے کہ کہا جاتا ہے 'ايتني فاني اكرمك'۔۔۔یا۔۔۔ یہ لام قسم کیلئے۔ایک قول پر تقدیر عبارت یہ ہے 'فلاجل ان ابايعك طلبتُ بسط يمينك'۔

۴۔۔۔**فَقَبَضُتُ يَدِيَّ**: بےادبی کیلئے نہیں، بلکہ بندہ نواز آقا پر ناز غلامانہ کرتے ہوئے بسكون الياء وتفتح اى الى جهتى و قال ابن مالك اى نفسى وهو غير طاهر۔

۵۔۔۔**مَالَكَ يَاعَمُرُوُ**: یعنی تمہارے دل میں کون سی بات مانع آگئی، جو بیعت سے مانع ہوئی۔

۶۔۔۔**قُلُتُ اَرَدُتُّ اَنُ اَشُتَرِطَ**: شرطًا او شيئًا پس اسکا مفعول محذوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ چاہتا ہوں کہ اس امتناع کے ذریعہ، میں اپنی ذات کے فائدے کیلئے کوئی شرط پیش کروں۔

۷۔۔۔**قُلُتُ اَنُ يُّغُفَرَلِيُ**: یہ مبنی للمفعول ہے۔ایک نسخہ میں ان يغفر الله کا لفظ ہے جس سے اس قول کی تائید ہوتی ہے جس میں اسے مبنی للفاعل قرار دیا گیا ہے۔

۸۔۔۔**اَمَاعَلِمُتَ يَاعَمَرُو**: یعنی تمہاری پختہ عقل، جودت رائے اور کمال حذاقت کا تقاضہ تو یہ تھا، کہ تم سے اس کا علم مخفی نہ ہو۔

۹۔۔۔**اَنَّ الُاِسُلَامَ**: یہاں مراد 'حربی' کا اسلام ہے، اسلئے کہ 'ذمی' کا اسلام 'حقوق العباد' میں سے کسی حق کو بھی ساقط نہیں کرتا۔

۱۰۔۔۔**مَاكَانَ قَبُلَهُ**: اَیُ مِنَ السَّيِّئَاتِ وَاِنَّ الُهِجُرَةَ۔۔۔یعنی میری ظاہری حیات میں میری طرف، اور میری وفات کے بعد دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف۔حدیث میں جو 'لَاهِجُرَةَ بَعُدَ الُفَتُحِ' آیا ہے، تو اسکا معنی یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد مکہ سے ہجرت نہیں کی جاسکتی، اسلئے کہ سارے مکہ والے اسلام قبول کر چکے تھے۔

۱۱۔۔۔**تَهُدِمُ مَاكَانَ قَبُلَهَا**: یعنی مظالم کے سوا وہ خطائیں جو اسلام لانے کے بعد، مگر قبل ہجرت واقع ہوئیں۔

ہمارے ائمہ میں شیخ تورپشتی فرماتے ہیں، کہ اسلام اپنے قبل کے جملہ مظالم و غیر مظالم اور کبائر وصغائر کو محو کر دیتا ہے۔۔۔مگر۔۔۔حج و ہجرت مظالم کو محو نہیں کرتے، اور عبد و مولیٰ کے درمیان کے

کبائر کی مغفرت ان سے بالیقین نہیں ہوتی۔۔۔۔لہٰذا۔۔۔۔حدیث کو ان صغائر کے محو کر دینے پر محمول کیا جائے گا، جو ہجرت وحج سے پہلے واقع ہوئے۔یہ بھی احتمال ہے کہ کہا جائے، کہ ہجرت وحج سے وہ کبائر محو ہوتے ہیں جو حقوق العباد سے متعلق ہوں، بشرطیکہ توبہ کرلی گئی ہو۔اس شرط کا عرفان اصولِ دین سے ہوا ہے، اسی لئے ہم نے مجمل کو مفصل کی طرف پلٹا دیا اور اس پر تمام شارحین کا اتفاق ہے۔

بعض علماء کا ارشاد ہے کہ اسلام اپنے قبل کے کفر وعصیان اور ان پر مرتب ہونے والے عقوبات، جنکا تعلق حقوق اللہ سے ہے، ان سب کو محو کر دیتا ہے۔رہ گئے بندوں کے حقوق، تو وہ حج وہجرت سے اجماعًا ساقط نہیں ہوتے۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔اسلام سے بھی حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، اگر ذمی مسلمان ہوا ہو، اس پر مالی حق ہو۔۔۔۔یا۔۔۔۔غیر مالی (یعنی قصاص وغیرہ) ہو۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔اگر حربی مسلمان ہوا ہو، اس پر کوئی مالی حق ہو۔۔۔۔مثلاً: وہ مقروض ہو۔۔۔۔یا۔۔۔۔کسی سے کچھ خرید لیا ہو، لیکن قیمت نہ ادا کی ہو۔۔۔۔نیز۔۔۔۔اس پر جو مال ادا کرنا ہو، وہ شراب کے سوا ہو، تو حق اسے ادا ہی کرنا ہوگا، اسلام اسے نہیں مٹاتا۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد اور حج سے پہلے مظالم کے سوا جو گناہ صادر ہوئے، حج ان سب کو محو کر دیتا ہے بشرطیکہ ان امور کا لحاظ کیا جائے جو اس حدیث میں مذکور ہے:

مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهٗ

جس نے حج کیا اور فحش گوئی نہ کی۔۔۔نیز۔۔۔حق وصلاح کے راستے سے نہ ہٹا،

تو وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہوگیا، گویا آج اس کی ماں نے اسے جنا

۔۔۔۔بایں ہمہ۔۔۔۔اہلسنّت کا جو مذہب ہے بے شمار علماء۔۔۔۔مثلاً: امام نووی، قاضی عیاض وغیرہم سے منقول ہے وہ یہی ہے، کہ اس حدیث مذکور کا محل وہی ہے جو کبائر وتبعات (تاوان) کے سوا ہو۔اسلئے کہ کبائر وغیرہ بغیر توبہ محو نہیں ہوتے۔

بعض شارحین کا کہنا یہ ہے کہ حقوق مالیہ ہجرت وحج سے محو نہیں ہوتے۔اسلام کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن ہجرت وحج سے حقوق العباد کے ساقط نہ ہونے پر اجماع ہے۔ہاں یہ ممکن ہے بلکہ واقع ہے، جیسا کہ اس پر بعض احادیث شاہد ہیں، کہ اگر رب کریم کسی گنہگار بندہ کو معاف کرنا چاہے اور ایسا گنہگار بندہ جس پر تاوان ہو، تو وہ تاوان لینے والے کو اسکے بدلے بہت بڑے اجر وثواب سے سرفراز فرمائے، جو اسکی عفو ومغفرت اور اس سے رضائے خداوندی کا سبب ہو جائے۔

بعض حضرات شوافع وغیرہم کا کہنا ہے، کہ حج تاوان کو بھی محو کر دیتا ہے۔ابن ماجہ کی حدیث

سے وہ استدلال لاتے ہیں، جس میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے عرفہ کی شام کو امت کیلئے دعا فرمائی، تو مظالم کے سارے گناہ معاف کردیئے گئے۔اس عموم مغفرت کو دیکھ کر شیطان چیخ پڑا اور شیطان کے اضطراب کو دیکھ کر حضور ہنس پڑے۔اس حدیث کا جواب یہ دیا گیا ہے، کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے ۔۔۔۔بالفرض۔۔۔۔اگر صحیح تسلیم کرلیں، جب بھی مندرجہ ذیل توجیہہ کا امکان ہے:

﴿۱﴾۔۔۔حدیث میں ان مظالم کو معاف کردینے کا ذکر ہے جسکا تدارک ممکن ہی نہ ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔حدیث میں توبہ کی قید مخفی ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔یہ حکم خاص ہے ان افراد کیلئے جنھوں نے سرکار رسالت ﷺ کی معیت میں حج کیا، اسلئے کہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو معصیت پر مصر ہو۔اسی لئے جمہور کا فیصلہ ہے کہ 'الصحابة کلھم عدول' سارے صحابہ عادل ہیں۔ ﴿واللہ تعالیٰ علم﴾

اس حدیث میں بیعت کا ذکر ہے، وہ بیعت اسلام ہے۔بیعت توبہ، بیعت تقویٰ، بیعت جہاد، بیعت شہادت، کسی خاص مسئلے پر بیعت، اسکے علاوہ ہیں۔آج کل علی العموم مشائخ سے بیعت توبہ ۔۔۔۔یا۔۔۔۔بیعت تقویٰ ہوتی ہے۔اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ بیعت کے وقت شیخ کے ہاتھ میں ہاتھ دینا سنت ہے۔

بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور حضرت عمرو شرط حضور سے لگا رہے ہیں اور سرکارِ رسالت اس شرط لگانے کو جائز قرار دے رہے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ خدا کے بندۂ مختار ہیں اور جب وہ مختار ٹھہرے، تو پھر آپ سے جنت کا دخول اور جہنم سے نجات، دونوں طلب کی جاسکتی ہیں۔
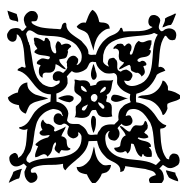
عَنْ مَعَاذٍ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُّدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَ
یُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَاَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ
یَسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَّتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْ
تِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَیْتَ ثُمَّ قَالَ اَلَآ اَدُلُّکَ عَلٰی
اَبْوَابِ الْخَیْرِ اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ وَّالصَّدَقَۃُ تُطْفِئُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَاتُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ
وَصَلٰوۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ ثُمَّ تَلَا تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حَتّٰی
بَلَغَ یَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّکَ بِرَاْسِ الْاَمْرِ وَعُمُوْدِہٖ وَذَرْوَۃِ سَنَامِہٖ قُلْتُ
بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ رَاْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعُمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ وَذَرْوَۃُ سَنَامِہٖ
الْجِھَادُ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُکَ بِمِلَاکِ ذٰلِکَ کُلِّہٖ قُلْتُ بَلٰی یَانَبِیَّ اللّٰہِ فَاَخَذَ
بِلِسَانِہٖ فَقَالَ کُفَّ عَلَیْکَ ھٰذَا فَقُلْتُ یَانَبِیَّ اللّٰہِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ
بِہٖ قَالَ ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا مَعَاذُ وَھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ
اَوْعَلٰی مَنَاخِرِھِمْ اِلَّا حَصَآئِدُ اَلْسِنَتِھِمْ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ

ترجمۂ حدیث

حضرت معاذ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، کہ آپ مجھے کوئی ایسا عمل (کام) بتادیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور دوزخ کی آگ سے دور رکھے۔ آپ نے فرمایا (معاذ) تونے ایک بڑی بات پوچھی ہے، لیکن یہ (امر اہم) اس شخص پر آسان ہے جسکو خدا اسکی توفیق دے اور اس پر اسکو آسان کردے۔ تو (صرف) خدا کی عبادت کر، کسی کو اسکا شریک نہ ٹھہرا، نماز پڑھ، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھ اور خانہ ءکعبہ کا حج کر۔ معاذ کہتے ہیں کہ اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تجھ کو نیکی کے دروازے (طریقے) بھی بتلادوں (سن!) روزہ ڈھال ہے (جو دوزخ کے آگ کے حملوں سے بچاتی ہے) اور صدقہ (خیرات) گناہوں کو اسطرح بجھا دیتا ہے جسطرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے (اور اسی طرح) رات میں انسان کا نماز پڑھنا (یعنی تہجد ادا کرنا گناہوں کو مٹا دیتا ہے)۔ معاذ کہتے ہیں اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیۃ مبارکہ: **تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ** ۔۔۔۔سے۔۔۔ **يَعْمَلُوْنَ** تک پڑھی جس میں تہجد کی نماز پڑھنے والوں کی خوبیاں بیان کی گئیں ہیں (اور اسکے بعد فرمایا) (معاذ) کیا میں تجھے اس امر اہم کا سر وستون اور کوہان کی بلندی بھی بتادوں۔ میں نے عرض کیا ہاں، یارسول اللہ! (ضرور بتلایئے) آپ نے فرمایا (اس) امر (اہم) کا سر (یعنی اصل و بنیاد) اسلام ہے اور ستون نماز ہے اور کوہان کی بلندی جہاد ہے۔۔۔۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا (معاذ) کیا میں تجھ کو ان تمام باتوں کی جڑ (اصل و بنیاد) نہ بتلادوں۔ میں نے عرض کیا ہاں، یارسول اللہ! آپ نے اپنی زبانِ مبارک پکڑی اور فرمایا تو اسکو قابو میں رکھ۔ میں نے عرض کیا یا نبی اللہ! کیا ہم (ان الفاظ) کے بھی جوابدہ ہونگے جو اپنی زبان سے بولتے ہیں۔ آپ نے فرمایا معاذ، تجھ کو تیری ماں گم کردے، لوگوں کو نہیں ڈالا جائے گا دوزخ کے اندر منہ کے بل۔۔۔۔یا۔۔۔۔ناک کے بل، مگر انکی بدزبانی کی وجہ سے۔ ﴿مسند امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔**اَبْوَابُ الْخَیْرِ**: یعنی نیکیوں کے دروازے جن سے نیکیاں اندر داخل ہوتی ہیں۔

۲۔۔۔**اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ**: روزہ رکھنا ڈھال اور سپر کا حکم رکھتا ہے جو معصیت کے تیر کو روزے دار تک پہنچنے نہیں دیتا، اسلئے کہ حالت روزہ میں روزہ دار اپنی خواہشات وشہوات کو روکے رکھتا ہے، جس سے شیطان کی مداخلت کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔

۳۔۔۔**وَالصَّدَقَۃُ**۔۔۔الخ: اگرچہ ہر نیکی بدی کو مٹا دیتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ﴿سورۂ ھود:۱۱۴﴾

۔۔۔مگر۔۔۔صدقہ بدی کو کچھ زیادہ ہی مٹا دیتا ہے۔۔۔اسکی دو وجہ ہے:

﴿۱﴾۔۔۔صدقہ غیر کے نفع کا سبب ہے، تو صدقہ دینے والا اپنے عمل صدقہ کا اجر تو حاصل ہی کر لیتا ہے، اسکے سوا غیر کی حاجت روائی کے ثواب کے سوا، اس غیر کی مخلصانہ دلی دعاؤں سے بھی فیضیاب ہو جاتا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔صدقہ مولیٰ تعالیٰ کی محبت اور سچے ایمان کے دعویٰ کی صداقت پر ایک قوی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۴۔۔۔**تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ**: اس ارشادِ قرآنی کا حاصل معنی یہ ہے کہ پروردگارِ عالم ان خوش بختوں کی تعریف کر رہا ہے جو شب زندہ دار ہیں۔ رات کو بستر استراحت سے دور رہ کر اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور جو کچھ رب کریم نے انکو نعمتیں عطا فرمائیں ہیں اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور ارشاد فرماتا ہے کہ کسی کو کیا اندازہ لگ سکتا ہے کہ انکو آخرت میں کیا کچھ ملنے والا ہے۔ بہشت کی نعمتیں، مولیٰ تعالیٰ کا دیدار جو انکے دلوں کے قرار وآرام اور انکی آنکھوں کیلئے لذت وسرور کا سبب ہیں، اور یہ سب کچھ انکے انہی اعمال کا ثمرہ ہے کہ وہ تہجد پڑھنے والے اور فی سبیل اللہ خیرات کرنے والے ہیں۔ مرد کو شرافت، سخاوت سے اور کرامت، عبادت سے حاصل ہوتی ہے، اور جن میں یہ دو خوبیاں نہ ہوں، ان کا عدم انکے وجود سے بہتر ہے۔

۵۔۔۔۔بِرَاْسِ الْاَمْرِ: دین کے تمام کاموں کی اصل اور اسکا 'سر' جسکے بغیر دین کا وجود ہی نہ ہو، اسکا تعلق دین سے ایسا ہی ہو، جیسا 'سر' کا تعلق 'جسم' سے ہوتا ہے۔
۶۔۔۔۔عُمُوْدِہٖ: جس پر دین کی عمارت کھڑی ہو اور دین کو قوت وکمال حاصل ہو، جیسے کہ مکان کیلئے ستون۔
۷۔۔۔۔ وذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ: ذروۃ کی ذال پر زیر اور پیش، دونوں صحیح ہے۔ سنام کی سین پر زبر ہے۔ اونٹ کے کوہان کو 'سنام' کہتے ہیں۔ ذروۂ جبل، پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ دین کو جس سے علو وارتقاع اور سربلندی وسرفرازی حاصل ہو، اسکو 'ذروہ سنام دین' کہیں گے۔
۸۔۔۔۔رَاْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ: اسلام سے مراد شہادتین ہے، اسلئے کہ اصل دین اسی سے حاصل ہو جاتا ہے۔
۹۔۔۔۔عَمُوْدُہٗ الصَّلٰوۃُ: دین مسلمانی کی بنیاد، نماز ہی سے قوت پاتی ہے۔
۱۰۔۔۔۔ ذُرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِھَادُ: دشمنانِ اسلام جو دین کے فروغ وارتقاء میں روڑے بنتے ہیں، امن وامان کی فضاء کو برباد کرنے کے درپے ہوتے ہیں، زمین پر فساد پھیلانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں، ان سے جنگ کرنا اور انکی جارحیت کو نیست ونابود کردینا، اور دین کی تبلیغ واشاعت کیلئے پرامن ماحول بنادینا، یہ سب دین کے فروغ وارتقاء اور اسکی سربلندی اور سرفرازی کے اسباب ہیں۔
۱۱۔۔۔۔بِمَلَاکِ ذٰلِکَ کُلِّہٖ: یعنی ایسی چیز جن سے اوپر ذکر کردہ جملہ امور کا قوام و نظام ہو یا ذالک سے اشارہ اسلام کی طرف ہو، یعنی جس سے اسلام قوام پزیر ونظام گیر ہو۔ اس صورت میں کلہ سے تاکید اس کے اجزاء وارکان کے اعتبار سے ہوگی۔ ہر شئے کا ملاک اسے کہیں گے جس سے وہ شئے قوام پزیر اور نظام گیر ہو۔ اہل لغت نے ملاک کی میم کو زیر اور زبر دونوں طرح سے پڑھا ہے، لیکن اس حدیث کی روایت میم کے زیر ہی کے ساتھ ہے۔
۱۲۔۔۔۔فَقُلْتُ: یعنی میں نے بطریق تعجب واستفہام عرض کیا۔
۱۳۔۔۔۔ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ: تیری ماں تجھ پر روئے یا تجھے گم کردے۔ ثکل (بالضم) کہتے ہیں 'دوست' اور 'فرزند' کی موت وہلاکت اور انکے فقدان کو۔ دراصل یہ موت وہلاکت کی دعا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ تجھے موت آجائے، تاکہ تو جس فکر میں پڑ گیا ہے اس سے تجھے چھٹکارا مل جائے۔ یہ الفاظ عرف عرب میں عادتاً زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، اسکے معنی مراد نہیں ہوتے، صرف مخاطب کے تعجب وانکار کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔۔۔۔موت چونکہ سبھی کو آنی ہے، جو اپنے وقت پر لازمی طور

پر آئے گی، تو اسکے لئے دعا کرنا، دعا نہ کرنے جیسا ہے۔۔۔عرب کا طریقہ تھا کہ وہ عادتاً اس طرح کے فقرہ استعمال کرتے تھے۔۔۔مثلاً: ثکلته امه ، قاتله الله اسکی ماں اس پر روئے، اللہ اسے موت دے۔۔۔یونہی کسی کو مخاطب کرکے کہتے تربت یداك تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، وغیرہ، وغیرہ۔۔۔مگر۔۔۔اس کلام سے اسکے وقوع۔۔۔یا۔۔۔دعا کا انکا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تھا۔

۱۴۔۔۔**اَوْعَلٰی مَنَاخِرِهِمْ**: یہاں راوی کو سہو ہوگیا کہ سرکار نے عَلٰی وُجُوهِهِمْ ارشاد فرمایا ہے۔۔۔یا۔۔۔عَلٰی مَنَاخِرِهِمْ، لہٰذا اس نے دونوں کلمات کی روایت کردی اور انکے درمیان میں۔۔۔یا۔۔۔لگا کر واضح کردیا کہ سرکار نے اس میں سے کوئی ایک کلمہ ارشاد فرمایا ہے۔۔۔مقصد دونوں ہی سے منہ کے بل جہنم میں گرنا اور اس میں داخل ہونا ہے۔۔۔عَلٰی مَنَاخِرِهِمْ کی صورت میں بھی گرنے والا منہ کے بل ہی گرتا ہے، لیکن چونکہ ناک چہروں کے اجزاء میں سب سے بلند ہے۔اسلئے اولاً سقوط ناک کے بل ہی ہوگا، اسی لئے گرنے کی نسبت ناک کی طرف کردی گئی ہے۔

۱۵۔۔۔**حَصَآئِدُ اَلْسِنَتِهِمْ**: وہ باتیں جو دوسروں کے بارے میں خیر وشر، 'یعنی' و 'لایعنی' کی تمیز کئے بغیر کہی جائیں۔ایسی باتیں کرنے والے کی مثال اس کاشتکار جیسی ہے، جو کانٹے اور نازک ٹہنیوں میں فرق نہیں کر پارہا ہے۔۔۔المختصر۔۔۔ارشادِ مبارک میں 'حصائدالسنه' سے انسان کی اپنی بدزبانی مراد ہے۔بیشک آدمی کو جو نقصان پہنچتا ہے، وہ اسی کی زبان کی آفت کا نتیجہ ہے۔اسکی زبان پر جو کچھ آتا ہے، وہ بول دیتا ہے۔یہ تو ایسا ہی ہے کہ منہ میں جو کچھ اچھا برا آئے اسے کھالے۔اس میں دوسروں کا قصور کیا ہے۔اس نے تو خود ہی اپنے کو جہنم رسید کردیا ہے۔
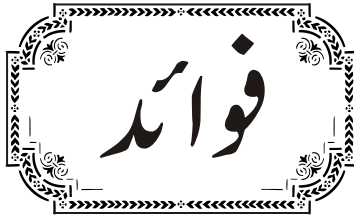
۱۔۔۔**قَالَ قُلْتُ**: ایک روایت میں ہے کہ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ ہم (صحابہء کرام) غزوۂ تبوک میں حضور کی معیت میں تھے۔گرمی کی شدت کی وجہ سے لوگ اِدھر اُدھر سایہ میں بیٹھ گئے۔میں ان میں حضور سے زیادہ قریب تھا۔چنانچہ میں نے حضور کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ، اے اللہ کے رسول ہمیں ایک ایسے عمل کی خبر دیجئے جو عظیم ہو، یا شرع میں معتبر ہو۔

۲۔۔۔**یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ** : یہ عمل کی صفت ہے۔ خواہ صفت مخصصۃ، یعنی ایسا عمل جو جنت میں داخل کرنے والا ہی ہو۔۔۔یا۔۔۔صفت مادحۃ ہو، یعنی ایسا عمل جسکی خوبی یہ ہو کہ جنت میں داخل کرنے والا ہو۔۔۔یا۔۔۔صفت شاقۃ ہو، جو واضح کردے کہ اسکا موصوف جنت میں داخل کرنے والا ہے ۔۔۔یہ تمام توجیہات اس صورت میں ہیں جب یدخلنی کو مرفوع (لام پر پیش) پڑھا جائے۔

۳۔۔۔اگر یدخلنی کو مجزوم (لام ساکن) پڑھا جائے، وہ یہ ایک شرط محذوف کی جزاء ہوگی۔ وہی شرط محذوف عمل کی صفت قرار پائے گی۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ حضور آپ مجھے ایک ایسے عمل سے باخبر فرمائیں کہ اگر میں وہ کروں، تو وہ مجھے جنت میں داخل کردے۔

۴۔۔۔ایک قول یہ بھی ہے کہ مجزوم پڑھنے کی صورت میں یہ جواب امر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا: آپ مجھے ایک ایسے عمل سے باخبر فرمائیں کہ اگر آپ مجھے اس سے خبردار کردیں، تو وہ مجھے جنت میں داخل کردے۔ اس صورت میں خبر وسیلہ ہوگی عمل کا اور عمل وسیلہ بنے گا دخول جنت کا ۔۔۔ظاہری نظر سے تو یہ پتہ چلتا ہے، صرف خبر دینا دخول جنت کا سبب نہیں ہے، بلکہ دخول جنت کا سبب عمل ہے، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے، تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ سرکار کا خبر دینا اس عمل کے کرنے کا وسیلہ ہے، وہ عمل دخول جنت کا ذریعہ ہے، تو یہ خبر دینا بھی بوجہ مّا (کسی نہ کسی معنی میں) ادخال جنت کا سبب ہو ہی جاتا ہے۔

۵۔۔۔**یُدْخِلُنِیْ** : جنت میں داخل کرنے۔۔۔یا۔۔۔جہنم سے دور رکھنے کی نسبت عمل کی طرف اسناد مجازی ہے اور مسبب الاسباب رب تبارک وتعالیٰ کی طرف کرنا اسناد حقیقی ہے۔ اس صورت میں اس ارشاد کا حاصل وخلاصہ یہ ہوا، کہ وہ عمل بذات خود نہیں، بلکہ اللہ کے فضل سے ہم کو جنت میں داخل کردے اور جہنم سے دور رکھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسکو دخول جنت اور جہنم سے دوری کا سبب بنادے۔

۶۔۔۔**یُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارَ** : یعنی دخول جنت کسی سابقہ عذاب کے بغیر ہی حاصل ہوجائے۔

۷۔۔۔**لَقَدْ سَاَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ** : یعنی تم نے سوال ایک عظیم شے کے تعلق سے کیا ہے، اسلئے کہ جنت میں دخول اور جہنم سے دوری ان دونوں باتوں کا سبب تمام محظورات شرعیہ سے کامل اجتناب اور تمام مامورات شرعیہ کی مخلصانہ بجا آوری ہے اور یہ اجتناب وامتثال بھی ایک امر عظیم ہے۔۔۔اسکا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے جس چیز کے تعلق سے سوال کیا ہے، اس پر عمل عام نفوس

پر بہت عظیم یعنی بہت گراں اور بھاری ہے۔

۸۔۔۔۔ عَنْ عَظِيْمٍ : یعنی یہ سوال اتنا عظیم ہے کہ اسکا جواب بہت مشکل ہے، اسلئے کہ وہ عمل جو جنت میں داخل کرنے والا ہو، اسکا علم غیب کا علم ہے۔ یہ وہی بتا سکتا ہے جسکو رب تعالیٰ نے غیب کا علم عطا فرمایا ہو اور چونکہ میں نبی ہوں اور اللہ نے مجھے غیب کا علم عطا فرمایا ہے، اسلئے میرے لئے اسکا جواب بفضلہٖ تعالیٰ آسان ہے۔

۹۔۔۔۔ عظیم، حقیر کی ضد ہے جسطرح کبیر، صغیر کی نقیض ہے اور جس طرح حقیر، صغیر کے نیچے کا درجہ رکھتا ہے، اسی طرح عظیم، کبیر بلند مقام کا حامل ہوتا ہے۔ ویسے عظیم و کبیر، دونوں کا اطلاق صور و معانی دونوں پر ہوتا ہے، یعنی اسے بھی عظیم و کبیر کہا جاتا ہے، جو جسم کے لحاظ سے زیادہ ہو اور اسے بھی کہا جاتا ہے جو قدر و منزلت کے لحاظ سے زیادہ ہو۔

۱۰۔۔۔۔ وإِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى : یعنی یہ ذریعہ بتانا مجھ پر آسان ہے، کہ رب تعالیٰ نے مجھے ہر شئے پر مطلع کیا ہے۔۔۔۔یا۔۔۔۔ وہ اعمال اسی پر آسان ہونگے جس پر اللہ کرم کر دے۔

۱۱۔۔۔۔ تَعْبُدُ اللّٰهَ : عبادت انتہائی درجہ کی فروتنی کا نام ہے۔ یہاں عبادت سے مراد توحید ہے۔ لاتشرك به شيئًا سے اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔۔۔یا۔۔۔ عبادت سے مراد ایک ایسا معنی ہے، جو توحید اور ہر مامور کے امتثال اور ہر ممنوع سے اجتناب کو عام ہے۔ یہاں تعبد مضارع ہے جو امر کے معنی میں ہے۔ صیغہء امر سے عدول کرنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ مامور بجا آوری کی طرف، گویا مسارع اور سبقت کرنے والا ہے۔ اسکے اس وقوع میں رغبت کے اظہار کی نشاندہی ہوتی ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ یہ ایک مبتداء محذوف کی خبر ہے اور اس سے پہلے 'ان' محذوف ہے۔

تقدیر عبارت یہ ہوئی۔ هُوَ اَنْ تَعْبُدَ (یعنی وہ عمل جو تجھے جنت میں داخل کرنے والا ہے، وہ تیری خدا کی عبادت ہے)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تعبد سے پہلے 'ان' محذوف نہ قرار دیا جائے بلکہ فعل کو مصدر کی منزل میں اتار کر اسکا قائم مقام کر دیا جائے، اسکے مابعد کو اسی پر قیاس کریں گے۔

۱۲۔۔۔۔ يُدْخِلُنِى الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِىْ مِنَ النَّارِ :۔۔۔اور۔۔۔ تعبد الله کے فصل لانے میں کوئی مضائقہ نہیں، اسلئے کہ یہ جملہ ثانیہ اس جملہ اولیٰ کی وضاحت اور اسکا بیان ہے، اسکا جز نہیں۔۔۔یا اسلئے کہ۔۔۔ یہ الگ سے ایک نیا کلام ہے، تَعْبُدُ اللّٰهَ میں براعة استهلال بھی ہے، اسلئے کہ مضمون کلام پر یہ اجمالاً دلالت بھی کرتا ہے، جس طرح کہ كف عليك حسن قطع پر دلالت کرتا ہے۔

۱۳۔۔۔لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا: 'به' کی ضمیر یا تو اللہ کی طرف لوٹتی ہے یا عبادت کی طرف۔ دوسری صورت مراد لینی بہتر ہے، اسلئے کہ جو خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے گا، وہ بدرجہ اولیٰ خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہیں کرسکتا۔

۱۴۔۔۔شَيْئًا میں تنوین افراد شخصی کیلئے ہے، جس طرح 'عظیمٍ' میں تنوین عظیم کیلئے اور یسیرٌ میں تنوین تقلیل کیلئے ہے۔

۱۵۔۔۔وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ : یعنی روزانہ پانچ وقت۔۔۔الغرض۔۔۔یہاں نماز سے مراد فرض نمازیں ہیں۔ اگر تعبدؔ میں عبادت سے ایک عام معنی مراد لے لیا جائے، تو وتقیم الصلٰوۃ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہوگا، ان فرائض کی اہمیت اور بلندی پر تنبیہ جسکا مقصود ہے۔

۱۶۔۔۔یہ حکم کچھ حضرت معاذ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر مومن کو عام ہے۔ اسلئے کہ 'عمومِ لفظ' کا اعتبار کیا جاتا ہے، نہ کہ 'خصوصِ سبب' کا، بلکہ عبادت کو توحید اور ایمان کے معنی میں لینے کی صورت میں، یہ تمام انسان کو عام ہے۔ جو انسان بھی ایسا ہوگا، اسے جنت کا دخول یقیناً نصیب ہوگا۔

۱۷۔۔۔ پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ حدیث میں دخولِ جنت سے جنت کا دخول اولیٰ مراد ہے، جو بغیر عذاب وعتاب کے ہو۔ لہٰذا جنت کا دخولِ ثانوی جو عذاب وعتاب کے بعد کی چیز ہے، وہ یہاں خارج از بحث ہے۔۔۔الغرض۔۔۔معتزلہ اور خوارج کیلئے یہ حدیث مفید نہیں۔

۱۸۔۔۔تُؤْتِي الزَّكٰوةَ : یعنی مفروضہ صاحب نصاب ہونے کی صورت میں ہر سال ایک بار۔

۱۹۔۔۔تَصُوْمُ رَمَضَانَ: یعنی فرض روزے ہر سال رمضان کے مہینے کی ہر ہر تاریخ میں۔

۲۰۔۔۔وَتُحِجُّ الْبَيْتَ : یعنی استطاعت کی صورت میں عمر میں ایک بار مکہ شریف جا کر افعالِ معلومہ کو ادا کرنا۔۔۔الغرض۔۔۔جنتی ہونا، موقوف ہے فرائض کی ادائیگی پر۔

۲۱۔۔۔ثُمَّ قَالَ : بات تو مکمل ہو چکی تھی۔ مگر حضور نے نوافل پر برانگیختہ کرنے کیلئے اپنے مزید ارشادات سے سرفراز فرمایا، تاکہ لوگ نوافل کو اپنا کر درجات عالیہ کی تحصیل اور عبادات بدنیہ ومالیہ کی تکمیل کرسکیں۔

۲۲۔۔۔اَلَا اَدُلُّكَ: 'ہمزہ' استفہام انکاری کا ہے اور 'لا' نفی کا اور یہ اپنے مابعد کی تحقیق کیلئے آتا ہے۔۔۔یہاں الا ادلك کے جواب میں بلٰی مروی نہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں کی گئی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔قُلْتُ بَلٰی : یہاں بھی تھا، جیسا کہ اسکے بعد دو جگہوں میں موجود ہے، مگر راوی روایت کرنا بھول گیا۔

﴿۲﴾۔۔۔اس ارشاد کے معنی یہ ہے کہ میرے لئے مناسب نہیں کہ مرشد کامل ہونے کے باوجود، میں تمہیں اس کی خبر نہ دوں۔۔۔الغرض۔۔۔یہ کسی جواب کا طالب نہیں۔

۲۳۔۔۔**وَعُمُوْدُہٗ الصَّلٰوۃُ** : یعنی اسلام اگرچہ اصل دین ہے، مگر صرف اس قدر سے دین کو قوۃ و کمال حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ نماز کی اقامت نہ ہو اور اسے کما حقہ دائمی طور پر ادا نہ کیا جائے۔۔۔الغرض۔۔۔دین بغیر نماز کے ایسا ہے جیسا گھر بغیر ستون کے، وہ گھر پائیدار مضبوط نہیں ہوسکتا جو مضبوط ستونوں پر قائم نہ ہو۔۔۔مگر۔۔۔اسی قدر سے دین کو اور کلمہءحق کو سرفرازی حاصل نہیں ہوسکتی، اسکے لئے جہاد کی ضرورت ہے۔ اسلئے جہاد کو دین کے کوہان کی چوٹی قرار دیا گیا ہے۔

۲۴۔۔۔**ذَرْوَۃُ سَنَامِہٖ الْجِھَادُ** : یہاں دین کو اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر اسکے لئے سر، پاؤں، کوہان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ استعارۃ بالکنایہ اور تخییل میں ہوتا ہے۔ جہاد کو کوہان کی چوٹی قرار دیکر جملہ اعمال پر اسکے تفوق و برتری۔۔۔نیز۔۔۔اسکی صعوبت و دشواری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔۔۔جہاد گر جہد (بالفتح) سے مشتق ہے، اسکا معنی مشقت سے اولاً جہد (بالضم) مشتق ہے، تو اسکا معنی طاقت ہے۔۔۔۔ جہاد میں جب دشمن مجاہد کے قتل کے درپے ہوتا ہے، تو مجاہد بھی اسے قتل کر دینے کیلئے اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے۔ اسی قوت کے صرف کرنے کا نام جہاد ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔دین الٰہی کی نصرت کیلئے مجاہد اپنی طاقت کو اپنے بھائی کی طاقت سے ملا دیتا ہے مساعدت کی طرح، تاکہ ایک عظیم طاقت ظہور میں آئے۔۔۔مساعدت کہتے ہیں اپنے بازو کو بھائی کے بازو میں ملا دینے کو، تحصیل قوت کیلئے۔

۲۵۔۔۔جہاد کی کئی قسمیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔**جِھَادُ الْاَعْدَاء** : دشمنوں سے لڑنا تاکہ دین سارے کا سارا خالص اللہ کیلئے ہو جائے۔

﴿۲﴾۔۔۔**جِھَادُ النَّفْسِ** : اتباع احکام شرعیہ، ترک لذات اور نفسانی خواہشات کے خلاف عمل پر مجبور کرنا، یہ جہاد بالنفس ہے۔ حلم و غضب، شہوت اور عدل کی قوتوں کا متعدل و منظم ہو جانا، اس جہاد کے اثرات ہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔**جِھَادُ الْقَلْبِ** : قلب کا تزکیہ و تصفیہ کر دینا اور خدا کے سوا تمام اغیار سے تعلق

منقطع کر لینا۔

﴿۴﴾۔۔۔**جِهَادُ الرُّوحِ**: واحد قہار کے وجود میں اپنے وجود کو فنا کر دینا۔

۲۶۔۔۔**جِهَادَ النَّفسِ**: جہاد الاعداء سے زیادہ سخت اور دشوار ہے۔اسلئے ایک بار جہاد الاعداء سے واپس ہوتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الاَصْغَرِ اِلَى الاَكْبَرِ

ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے

۔۔۔اس ارشاد میں 'جہاد بالنفس' کو جہاد اکبر قرار دیا گیا ہے۔۔۔اسلئے کہ نفس، انسان کے اندرونی حصے میں ایک بادشاہ کے مثل ہے، روحِ حیوانی وطبعی، بے جا آرزوئیں اور خواہشات اسکا لشکر ہیں اور وہ خود فی نفسہٖ اندھا ہے، جو ہلاک کر دینے والے امور کو نہیں دیکھ پاتا اور خیر وشر کی تمیز سے عاری ہے ۔۔۔یہاں تک کہ رب کریم اپنی حکمت لطیف کے ذریعہ اسکی بصیرت کو نور بخش دیتا ہے، تو اسکے سامنے جملہ اعداء اور سارے معارف روشن ہو جاتے ہیں اور پھر وہ انسانی ڈھانچے کو حرص کے خنازیر، کتے کی دیوانگی، غصے کے چیتوں، گدھے کی شہوت، اور شیطنت کے سانپوں سے بھرا ہوا دیکھتا ہے، پھر وہ انسانی مجسمہ کو رذائل سے پاک وصاف اور فضائل سے مزین وآراستہ کرتا ہے۔

۲۷۔۔۔**قُلْتُ بَلٰى يَا نَبِيَّ اللّٰهِ** : نبی اللہ کے مناسبت دلالت سے بالکل ظاہر ہے، اسلئے نبی کہتے ہیں خبر دینے والے کو اور رسالت نام ہے رہنمائی کا۔حضرت معاذ کی فصاحت وبلاغت اور انکی بصیرت اس سے واضح ہو جاتی ہے کہ جب سرکار نے 'ادلك' کا لفظ اختیار فرمایا، تو آپ نے یا رسول اللہ سے نداء فرمائی اور جب سرکار نے اخبرك کا لفظ استعمال فرمایا، تو آپ نے یا نبی اللہ سے نداء کی، جس نے واضح کر دیا کہ رسالت کا کام دلالت ورہنمائی ہے اور نبی کی ذمہ داری غیب کی خبر دینا ہے۔

۲۸۔۔۔**فَاَخَذَ بِلِسَانِه** : اپنی زبان پکڑی اور پھر ارشاد فرمایا۔۔۔اب یا تو زبان پکڑی اور پھر فوراً چھوڑ کر ارشاد فرمایا۔پکڑنا محض اس طرف توجہ کرانے کیلئے تھا۔۔۔اور یا تو۔۔۔انہیں زبان کی طرف اشارہ فرما کر 'كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا' فرما دیا۔اسلئے کہ زبان پکڑ کر گفتگو کرنا غیر متصور ہے۔ ﴿واللہ اعلم﴾

۲۹۔۔۔**عَلَيْكَ هٰذَا** : هذا سے اشارہ خود سرکار کی زبان کی طرف نہیں، بلکہ مخاطب کی زبان کی طرف ہے جو سرکار کی زبان کے سامنے ہے۔۔۔الغرض۔۔۔پیکر رسالت مآب میں گویائی کیلئے جو چیز ودیعت فرمائی گئی ہے، اشارہ اُدھر کیا، مگر مراد یہ لی کہ مخاطب اپنی اس چیز کو قابو میں رکھے

جواسے گویائی کیلئے عطافرمائی گئی ہے۔

۳۰۔۔۔۔عَلَيْكَ هٰذَا: آنحضرت ﷺ نے صرف قول پراکتفاء نہیں، فرمایا بلکہ اپنی زبان کو پکڑا۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسکی طرف اشارہ فرمایا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہوجائے کہ زبان کا معاملہ بہت سخت ہے۔ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ غیر ضروری اور 'لایعنی' باتیں نہ کیا کرو۔اسلئے کہ جو زیادہ بولنے کا عادی ہے، اس سے غلطیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور جسکی غلطیاں زیادہ ہونگی، اسکے گناہ بھی اسی حساب سے زیادہ ہونگے۔احیاء العلوم میں کثرت کلام کے بے شمار مفاسد شمار کرائے گئے ہیں۔صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کلام بلاغت نظام، اس راز کی طرف اشارہ کررہاہے، فرماتے ہیں:

لَيْتَنِيْ كُنْتُ اَخْرَسَ اِلَّا عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ

کاش کہ ذکرالٰہی کے سوامیں کچھ نہ بول سکتا

۔۔۔۔یعنی ایسا گونگا ہوتا، جوصرف ذکرالٰہی کرتااوربس۔

۳۱۔۔۔۔بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ: یعنی اپنے جملہ کلام پر(اپنی ہر ہر بات پر)۔اسلئے کہ بعض کلام پرمواخذہ ہوناخودحضرت معاذ پر پوشیدہ نہیں تھا۔۔۔۔الحتصر۔۔۔۔انھیں اس بات کا توعلم تھا کہ بعض کلام ایسے ہیں جن پرمواخذہ ہوگا، مگراپنے ہر ہر کلام پرمواخذہ ہونا، ان کیلئے بھی وضاحت طلب تھا،اسلئے انھوں نے اسکے تعلق سے سوال عرض کردیا۔

۳۲۔۔۔۔اس کلام نبوی میں انسانی کلام کواس کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے جودرانتی سے کاٹی جاتی ہے(درانتی کوہمارے علاقے میں ھنسیا کہتے ہیں، یہ ایک گھانس کاٹنے کااوزارہے)اس تشبیہ میں بھی بڑی بلاغت ہے۔اسلئے کہ جس طرح درانتی (ھنسیا) جب کھیت کاٹنے پرآتی ہے، توخشک وتر اوراچھے برے کی تمیزنہیں کرتی۔اس طرح بعض انسانوں کی زبانیں جب بولنے پرآتی ہیں، توجومنہ میں آتاہے، اچھابرا، سب بول جاتی ہیں۔ارشادمبارک کا حاصل یہ ہوا کہ انسان اپنے برے کلام ۔۔۔۔مثلاً:کفری بات، تہمت، گالی گلوچ، غیبت، چغل خوری، بہتان طرازی وغیرہا کی وجہ سے ہی جہنم رسید ہوگا۔یہ حکم اکثریت کے پیش نظر ہے، یعنی اکثرلوگوں کا یہی حال ہوگا، اسلئے کہ تجربہ شاہد ہے کہ شاذونادرہی ایسے لوگ ہونگے، جنھوں نے بدگوئیوں سے اپنی زبان کی حفاظت کررکھی ہواورانکی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی ہو، جودخول نارکی موجب ہو۔

۳۳۔۔۔۔کف لسان اوراپنی زبان پرقابورکھنا، یہ ایک ایسی نعمتِ عظمیٰ ہے، جس سے سعادت کبریٰ کے دروازے کھل جاتے ہیں اورکرامت عظمیٰ کی ٹھنڈی ہوائیں مہک اٹھتی ہیں۔شریعت کی

روح سے دیکھئے، تو کف لسان زبان کی حفاظت کیلئے بہترین مدد ہے۔۔۔۔اور اگر طریقت کے لحاظ سے دیکھئے۔۔۔۔تو وہ ایک ایسا رکن ہے، جو طریقت کا مطلوب ومقصود ہے اور ایسا مرکز ہے، جس پر طریقت کا دارومدار ہے۔ اسلئے کہ جب زبان خاموش ہوتی ہے، تو دل بولنے لگتا ہے، تو اسکورات کی تنہائی میں رب کے ساتھ باطنی ہم کلامی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسکے اوپر رحمت کے بادل نور کے قطرات گرانے لگتے ہیں اور اسکا وجود خوشی ومسرت اور خیرات وحسنات سے لبریز ہوجاتا ہے۔۔۔۔اور اگر حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے۔۔۔۔تو یہ سالکین کے مراتب کی انتہا ہے اور عارفین کی آخری منزل ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

مَن عَرَفَ اللّٰہَ کَلَّ لِسَانُہٗ

جس نے اللہ کو پہچان لیا، اسکی زبان تھک گئی

۔۔۔۔یعنی غیر اللہ کے ذکر سے اسکا کوئی سروکار نہ رہا، یہ اسکا مقامِ مراقبہ ہے۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔کسی طرح کا کوئی دعویٰ کرنے سے بھی، اسکی زبان کو کوئی یارانہ رہا، یہ اسکا مقامِ ہیبت ہے۔۔۔۔اسی طرح وہ زبان خود اپنے احوال ومقام کے بیان کے لائق نہ رہی۔ یہ اسکا مقامِ غلبہء محبت ہے۔ یہاں تک کہ وہ زبان خود رب تعالیٰ کی تعریف وتوصیف سے رک گئی۔ یہ اسکا مقام حیرت فی المعرفۃ ہے۔۔۔۔جیسا کہ خود آنخضرت ﷺ نے فرمایا، اس وقت جبکہ آپ مقامِ دنیٰ فتدلیٰ میں تھے۔ حق کو حق کے ذریعہ دیکھا، ذاتِ الٰہی میں اپنی صفات کو فناء کرکے بقاء کے معنیٰ کو پالیا، پھر اس مقام پر بھی جو ارشاد فرمایا، اسکا حاصل یہ تھا کہ اے رب کریم، میں تیری تعریف شمار کرنے اور سمجھنے سے عاجز ہوں۔۔۔۔اسلئے کہ آپ جو ثناء فرماتے، عالم حدوث سے صادر ہوتی اور مخلوق، مخلوق ہی کی تعریف کرے، یہ زیادہ مناسب ہے، اسلئے مقراض تنزیہہ سے ثناء کی زبان کاٹ لی گئی اور جلال ابدی کے سامنے اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا پڑا اور اللہ کی تعریف وثناء کی نسبت، خود خدا ہی کی طرف کردی کیونکہ اللہ کو اللہ کے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا۔ اسلئے سرکار نے فرمادیا:

اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ

اے اللہ تو ایسا ہی ہے، جیسا کہ تو نے خود اپنی ثناء فرمائی ہے

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ عَنْ مَعَاذِابْنِ اَنَسٍ مَعَ تَقْدِيْمٍ وَّتَاخِيْرٍ وَّفِيْهِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانُهٗ.

حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ جس شخص نے (کسی سے) محبت کی خدا کے واسطے اور بغض رکھا خدا کے واسطے اور (کسی کو کچھ) دیا خدا کے واسطے اور منع کیا خدا کے واسطے (یعنی جو کام بھی کیا، خدا کیلئے کیا)، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا (رواہ ابوداوٗد) اور ترمذی شریف میں (یہی حدیث) جو معاذ بن انس سے مروی ہے، اسکے الفاظ میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے اور اسکے آخری الفاظ یہ ہیں، بس یقیناً اس نے کامل کرلیا اپنے ایمان کو۔

جواہر پارے

۱۔۔۔عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ :آپ کا اسم شریف صُدَیّ (بضم صاد وفتح دال وتشدید یاء) ہے۔آپ باہلی صحابی ہیں۔آپکے نسب وآباء میں اختلاف ہے۔۔ہاں۔۔آپکی کنیت میں سب کا اتفاق ہے۔آپ اولاً مصر میں رہے، بعد میں حمص منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔وہاں کثیر الرویہ صحابی آپ ہیں۔آپکی روایت کردہ اکثر حدیثیں اہل شام کے پاس ہیں۔آپکی وفات ۸۶ھ۔۔یا۔۔ ۸۱ھ میں ہوئی۔ عمر شریف اکیانوے ۹۱ سال تھی، بقول اکثر، شام میں وصال فرمانیوالے آخری صحابی آپ ہی ہیں۔

۲۔۔۔مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ : یعنی جسکا ہر کام لوجہ اللہ ہو۔نہ اس میں نفس کا کوئی دخل ہو اور نہ ماسوا اللہ کی خواہش۔ جو کچھ کیا جائے وہ صرف خدائے سبحانہ وتعالیٰ کی رضا ہی کیلئے کیا جائے۔اسکی حالت ایسی ہو جائے کہ اسکی زبانِ حال بول اٹھے۔اے اللہ، میں کہیں ٹھہرتا ہوں، تو تیری ہی رضا کیلئے ٹھہرتا ہوں اور اگر سفر کرتا ہوں، تو تیری ہی رضا کیلئے سفر کرتا ہوں۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔میرا بولنا بھی تیری رضا کیلئے ہے اور میری خاموشی بھی تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ہے۔

۳۔۔۔فَقَدِ اسْتَکْمَلَ: یعنی اس نے اپنے ایمان کو کامل واکمل بنالیا اور اپنے ایمان کو جمالِ اخلاص سے خوبصورت واجمل کرلیا۔ یہ توحید اخلاص اور ماسوا اللہ سے کامل کنارہ کشی کا وہ مقام ہے، جہاں تک پہنچنا صدیقین کے سوا کسی پر آسان نہیں۔

فوائد

۱۔۔۔مَنْ اَحَبَّ: یعنی جو کسی چیز سے یا کسی شخص سے محبت کرتا ہے اللہ کی رضا کیلئے جس میں خواہشاتِ نفسانیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور کوئی کام ماسوا اللہ کیلئے نہیں ہوتا، یہاں تک کہ، لوگوں سے ملنا اوران سے کنارہ کش ہو جانا، یہ سب بھی خدا کی رضا کیلئے ہو، ایسا کہ محبت کرنیوالا اس مقام پر آجائے کہ وہ بجاطور پر کہہ سکے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿سورۃ الانعام:۱۶۲﴾

بیشک میری نماز، میری قربانیاں، میری زندگی، اور میری موت سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے

۲۔۔۔حدیث شریف میں صرف چار افعال کا خصوصیت کے ساتھ ذکر صرف اسلئے ہے کہ یہی چار تو حظوظ نفسانیہ ہیں۔ یہ چار کام اکثر نفس کیلئے ہوتے ہیں، اسلئے انکو خالصاً لوجہ اللہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ پس اگر کوئی انکو اللہ کیلئے خالص کرلے تو وہ بطریق اولیٰ اپنے دوسرے ہر کام کو خالصاً لوجہ اللہ بہ آسانی کریگا۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہ ﴿رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗد﴾

ـــ ـ ü ̃ ,ترجمہء حد ی $ û ـ ـــ

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ خدا کیلئے محبت کرنا اور خدا کی راہ میں بغض رکھنا، بہترین اعمال میں سے ہیں۔

جواہر پارے

ا۔۔۔حدیث ابی امامۃ (جو ابھی اس سے پہلے گزری ہے) کا جو معنی ومطلب ہے، اس حدیث کا بھی وہی مفہوم ہے۔

۲۔۔۔**فِی اللّٰهِ** : 'فی' اجلیہ ہے۔'لام' کے معنی میں 'فی اللہ' یعنی 'للہ'۔۔۔اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہا جاتا ہے عُذِّبَتْ اِمْرَأَةٌ فِیْ هِرَّةٍ ایک بلی کی وجہ سے عورت عذاب دی گئی۔۔۔یا۔۔۔المتفکر فی معرفة الله۔۔۔اللہ کی معرفت کیلئے تفکر کرنے والا۔

۳۔۔۔**اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ** : حضور ﷺ کے اسطرح کے ارشادات ازقسم جوامع الکلم ہیں، جو ایمان، اسلام، احسان، احکام شریعت، آداب طریقت اور اسرار حقیقت سبھی کو شامل ہیں اور انکے مفہوم ومعنی میں سبھی داخل ہیں۔

۴۔۔۔ان اعمال کا افضل ترین اعمال ہونا اسلئے ہے، کہ ساری نیکیوں اور سارے خیرات و حسنات کا منبع و باعث خدا کی محبت ہے۔ پھر اب اگر کسی پر خدا کی محبت ایسی غالب ہو کہ وہ کسی شخص کو ۔۔۔یا۔۔۔کسی چیز کو صرف خدا کی رضا ہی کیلئے چاہے، ایسے ہی کسی سے دشمنی کرے تو خدا ہی کیلئے دشمنی کرے، تو اسکی یہ محبت اسکو اس بات کیلئے برانگیختہ کرے گی اور اس کام کیلئے مجبور کردے گی کہ وہ تمام احکاماتِ شرعیہ کی بجا آوری کرتا رہے اور تمام محرمات ومنہیاتِ شرعیہ سے اپنے کو بچاتا رہے۔

۵۔۔۔امام غزالی فرماتے ہیں، کہ اگر کوئی شخص ایک باورچی کو اسلئے دوست رکھتا ہے کہ کھانا تیار کرا کر فقراء وصلحا کو کھلائے، تو یہ دوستی اللہ کے واسطے کہی جائے گی۔ اسکے برخلاف اگر کوئی شخص اپنے استاد کو اسلئے دوست رکھے، کہ اس سے علم سیکھ کر اس علم کو حصولِ دنیا کا ذریعہ بنائے گا، تو اب اسکی یہ دوستی خدا کے واسطے نہ ہوئی۔

فوائد

۱۔۔۔محبت وعداوت کا تعلق قلب سے ہے اور دوسرے اعمال کا تعلق قالب سے۔اور ظاہر ہے کہ خدا کیلئے کسی کو چاہنے کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، جب تک خود خدا سے محبت نہ ہو اور جسکو خدا سے محبت ہو جائے گی، اسکو خدا کے احکامات۔۔۔بلکہ۔۔۔ذات خدا کی طرف منسوب ہر چیز سے لازمی طور پر محبت ہو جائے گی۔۔۔الغرض۔۔۔رسول اللہ، نبی اللہ، ولی اللہ، کتاب اللہ، بیت اللہ، شعائر اللہ وغیرہ وغیرہ کی محبتیں دراصل خدا ہی کی محبت کا ثمرہ ونتیجہ ہیں۔

۲۔۔۔اَفۡضَلُ الۡاَعۡمَال : یہاں اعمال سے مراد وہ باطنی اعمال ہیں جنکے ذریعہ معارفت وشہود کے حقائق تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔بقول بعض، اگر اعمال سے قلب وقالب، دونوں کے اعمال مراد ہوں، تو اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہوگی: مِنۡ اَفۡضَلُ الۡاَعۡمَالِ، اسلئے کہ شہادتین کی ادائیگی کے بعد نماز مطلقاً سب سے افضل عمل ہے۔۔۔۔

خاکسار کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں توجیہوں میں پہلی توجیہہ زیادہ مناسب اور لائق ترجیح ہے۔اسلئے کہ ہوش وحواس کی بیداری کے ساتھ شہادتین کی ادائیگی وہی کرسکتا ہے جو اسیر محبت الٰہی ہو چکا ہو۔۔۔نیز۔۔۔اسی کی نماز صحیح طور پر نماز کہے جانے کے لائق ہوگی، جو نشہء محبت الٰہی میں چور ہو کر نماز پڑھتا ہو۔

۳۔۔۔بعض روایت میں اَلۡمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالۡمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ (اللہ ہی کیلئے دوستی اور اللہ ہی کیلئے دشمنی) کا اضافہ ہے۔'موالات' اور 'حب' میں فرق یہ ہے، کہ 'موالات' دو کے بیچ میں ہوتی ہے، اور 'محبت' عام ہے۔وہ یکطرفہ بھی ہوسکتی ہے اور دوطرفہ بھی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَیَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَآئِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَآئِیُّ وَزَادَ الْبَیْهِقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ بِرِوَایَةِ فُضَالَةَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوْبَ

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ سرکار رسالت کا ارشاد ہے، کہ مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون و مال میں مطمئن رہیں۔ اسے ترمذی ونسائی سے روایت کیا اور بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں فضالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں اور مجاہد وہ ہے جس نے خدا کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے چھوٹے بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔

جواہر پارے

۱۔۔۔اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ ۔۔۔الخ: فصل اول میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی حدیث کے تحت اسکی مکمل شرح کی جاچکی ہے۔

۲۔۔۔وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ ۔۔۔الخ: اَمِنَ کفَرِحَ اَمَنَةً ۔۔۔اسکی صفت آمن (مطمئن ہونا)۔۔۔یعنی مومن کامل وہ ہے جس سے کسی کی جان ومال اور عزت وآبرو کو کوئی خطرہ نہ ہو۔۔۔ہاں اگر کسی کے جان ومال سے حق شرعی وابستہ ہو، تو اسکا حکم الگ ہے۔

حدیث شریف میں خون اور مال کا ذکر واضح طور پر کیا گیا ہے۔لیکن صاف لفظوں میں عزت وآبرو کا تذکرہ نہیں، اسلئے کہ اعراض یعنی عزت وآبرو کا نفس انسانی کے ساتھ ایسا کامل تعلق ہے، گویا یہ خود جزو انسانی ہے۔تو معنوی طور پر یہ دماء میں داخل ہے۔۔۔بظاہر سیاق کلام سے وہم ہوتا ہے کہ ایمان اور ہے اور اسلام اور۔۔۔یونہی۔۔۔مومن اور ہے اور مسلم اور۔۔۔نیز۔۔۔ان دونوں کے احکام جداگانہ ہیں۔۔۔حالانکہ۔۔۔دونوں ایک ہی ہیں اور فقرۂ ثانیہ محض فقرۂ اولیٰ کی تاکید وتقریر کیلئے ہے۔اب المسلم کے ساتھ من سلم اور المومن کے ساتھ من امنه کا لفظ استعمال کرنا محض مادۂ اشتقاق میں مطابقت کی رعایت کرتے ہوئے تبعاً ہے۔

۳۔۔۔اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ ۔۔۔الخ: اس دوسرے حصے میں بظاہر صرف ہاتھ کے گناہوں کے ذکر پر اقتصار کیا ہے، تو اس سے کچھ حصر مقصود نہیں، بلکہ اکتفاءً ایسا کیا ہے۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔زبان کا ذکر اسلئے نہیں کیا، کہ زبان کی اذیت ظاہر اور مشہور ومعروف ہے۔اسکی تکرار کی ضرورت نہیں بخلاف ہاتھوں کی اذیت کے، اسلئے کہ وہ وضاحت اور تشریح کی محتاج ہے۔هکذا وجهه الطیبی۔
جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے، کہ ایمان فعل قلب ہونے کی حیثیت سے اسلام سے زیادہ کامل ہے۔ اسلئے اسلام بظاہر انقیاد کا نام ہے۔۔۔یونہی۔۔۔امن بھی سلامتی سے زیادہ مکمل اور قوی ہے۔اسلئے کہ سلامتی یہ ہے کہ کوئی ضرر وآفت اس سے نہ پہنچے۔۔۔بایں ہمہ۔۔۔ضرر کے پہنچنے کا توہم واحتمال اس میں رہتا ہے۔اسکے برعکس امن یہ ہے کہ ضرر وآفت کا احتمال واندیشہ بھی باقی نہ رہے۔﴿فافہم﴾

اس دوسرے ممہ میں زبان کے عدم ذکر کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، کہ جان و مال میں امن وخوف کچھ ہاتھ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ زبان کو بھی اس میں دخل ہوسکتا ہے ۔۔۔مثلاً: چغل خوری وغیرہ جو زبان کا کام ہے، مگر اس سے جان و مال دونوں کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ اب جب ضمناً دونوں کا ذکر ہوگیا تو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا، کہ اس ارشاد میں صرف ہاتھ کے گناہوں پر اقتصار کیا گیا ہے۔

۴۔۔۔بِرِوَایَةِ فُضَالَةَ: بفتح فا۔۔ آپ حضور ﷺ کے غلام تھے۔

۵۔۔۔اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ: یعنی حقیقی مجاہد جسے صحیح معنوں میں مجاہد کہا جاسکے وہ ہے، جو خود اپنے نفس سے جنگ کرے، اپنے کو ہر حال میں اسکی اطاعت سے باز رکھے، اسلئے کہ نفس اسکے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن ہے جو اسکے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور ہمیشہ اسے فریب ہی دینا چاہتا ہے، جس پر قابو پانا اور اسے درست رکھنا نہایت دشوار کام ہے۔

۶۔۔۔اَلْمُهَاجِرُ۔۔۔الخ: یعنی مہاجر حقیقی۔ وہ ہے جو تمام گناہوں کو ترک کردے، خواہ وہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ عمداً اصادر ہوں یا خطاءً ۔۔۔اسلئے کہ۔۔۔ ہجرت سے مقصود یہی ہے کہ مہاجر ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں وہ پوری قوت وتوانائی اور سکون واطمینان کے ساتھ خدا کی عبادت کرسکے، وہاں نہ تو اغیار کی مزاحمت ہو اور نہ اشرار کی مصاحبت سے قلب کو تشویش ہو۔۔۔۔پس درحقیقت ہجرت نام ہے گناہوں اور خطاؤں کو ترک کردینے کا۔۔۔۔تو اب اگر کوئی اپنے وطن میں رہ کر گناہوں اور خطاؤں کا تارک ہو، تو درحقیقت مہاجر ہے۔۔۔بخلاف اس شخص کے، جس نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا مگر گناہوں کو نہ ترک کرسکا، تو وہ وطن سے دور رہ کر بھی مہاجر نہ ہوگا۔ یعنی اسکی ہجرت اس کیلئے نفع بخش نہ ہوسکی، اور وہ حقیقی معنوں میں مہاجر نہ بن سکا۔

۷۔۔۔حضرت عبداللہ ابن عمر کی حدیث کے تحت اسکی بھی وضاحت ہوچکی ہے۔

۱۔۔۔اَلْمُسْلِمُ۔۔۔الخ: یعنی نہ کسی کو بلاوجہ مارے پیٹے اور نہ انکی چغلی اور غیبت کرے۔ رہ گیا حق پر مارنا، تو یہ عین دین ہے، جیسے شرعی ضرورت کی بنا پر مجرم سے قصاص۔۔۔۔ یونہی۔۔۔

ضرورت شرعی کی بنا پر غیبت کرنا عین عبادت ہے، جیسے راویان حدیث کے عیوب بیان کرنا حدیث کی تحقیق کیلئے۔۔۔۔الغرض۔۔۔۔اس طرح کے اموراس حدیث سے خارج ہیں۔

۲۔۔۔۔**اَلْمُؤْمِنُ**۔۔۔الخ: یعنی اسکا برتاؤ ایسا اچھا ہو کہ لوگوں کو قدرتی طور پر اسکی طرف سے اطمینان ہو، کہ یہ نہ ہمارے مال مارے گا اور نہ تکلیف دے گا۔

۳۔۔۔۔**بِرِوَایَةِ فُضَالَةَ**: آپ فضالہ بن عبید الانصار الاوسی ہیں۔آپ اُحد اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں حضور کے ساتھ رہے۔ بیت رضوان میں شریک تھے۔حضور کے بعد شام کے جہادوں میں شریک رہے۔دمشق میں قیام کیا۔حضرت امیر معاویہ کے عہد میں وہاں کے قاضی رہے ۵۳ھ میں وہیں وصال فرمایا۔آپ سے آپ کے غلام میسرہ اور دوسروں نے روایت کی۔

۴۔۔۔۔**مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوبَ**: ذنب (گناہ) خطا سے عام ہے۔اسلئے کہ گناہ بالقصد اور بلا قصد دونوں طریقے سے صادر ہوسکتے ہیں، لیکن خطا بالقصد نہیں صادر ہوتی۔یا یہ کہ یہاں خطا سے مراد چھوٹے گناہ ہیں اور ذنوب سے مراد بڑے۔

۵۔۔۔۔حدیث زیر بحث میں مسلم کی تشریح سلامت سے اور مومن کی تشریح امن سے کر کے دونوں کے مادّہ اشتقاق کی وضاحت فرمادی اور تنبیہ فرمادی کہ اب اسلام وایمان کے دعویٰ کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکی ذات میں ان دونوں کا مادہ اشتقاق بطور صفت موجود ہے کہ نہیں۔ اگر موجود نہیں، تو پھر اسکا دعویٰ اس شخص کے دعویٰ کی طرح ہوگیا، جو خود کو کریم گمان کرتا ہے مگر اسکی ذات صفت کرم سے متصف نہیں۔
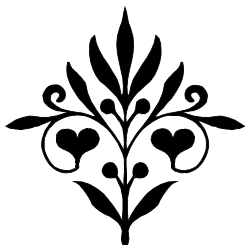
عَـنْ اَنَسٍ قَال قَلَّمَاخَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَـلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّاقَالَ لَااِیْـمَانَ لِمَنْ لَّااَمَا نَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَہْدَلَہٗ رَوَاہُ الْبَیْہِقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ.

-- - ü ˜, جمہء حدی $ û - --

حضرت انس سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ حضور ہم سے کوئی خطاب فرماتے اور یہ نہ فرماتے کہ جو امین نہیں اسکا ایمان نہیں، جو پابند وعدہ نہیں اسکا دین نہیں۔ یہ حدیث بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے۔

جواہر پارے

۱۔۔۔۔**قَلَّمَا خَطَبَنَا** : ما مصدریہ ہے اور فعل بتاویل مصدر، قل کا فاعل ہے یعنی قَلَّ خَطَبْتُهٗ خَطَبَنَا۔۔۔۔یا۔۔۔ما کافّہ ہے۔اس صورت میں قلّماانا فیه کے معنی میں ہوگا۔۔۔۔یہ بھی احتمال ہے کہ ما کا موصولہ۔۔۔۔یا۔۔۔۔موصوفہ قرار دیکر اس سے زمان مراد لیا جائے۔اور لوٹنے والی ضمیر کو محذوف قرار دیا جائے۔۔۔ اور اب اگر ما مقحمہ ہے، تو فعل کو یا تو مصدر کی تاویل میں کریں گے اور یا اسکو مصدر کا قائم مقام قرار دیں گے، تاکہ وہ قل کا فاعل ہوسکے۔۔۔۔

(کسی کلمہ کو دو متلازم کلمے کے درمیان داخل کرنا تقحیم ہے۔۔۔۔مثلاً: مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان جیسے رجل کا لفظ ید اور من کے درمیان اس قول میں قَطَعَ اللّٰهُ يَدَ وَرَجَلَ مَنْ قَالَهَا ۔۔۔۔اسلئے کہ اصل ترکیب یوں ہے:

قَطَعَ اللّٰهُ يَدَ مَنْ قَالَهَا وَرِجْلَهٗ

۲۔۔۔۔**لَا اِيْمَانَ**۔۔۔الخ: اگر امانت سے اسکا معنی متعارف یعنی لوگوں کے اموال و مجالس کی حفاظت کرنا اور نہ کرنا مراد ہے۔۔۔۔اور۔۔۔۔عہد سے وہی جو لوگوں کے مابین وعدہ و پیمان ہوتا ہے، اسکی نگہداشت مقصود ہے۔۔۔۔تو پھر۔۔۔۔اس ارشاد میں دین و ایمان کی نفی تغلیظ و تشدید کیلئے ہے، جسکا منشاء یہ ہے کہ لوگ اسکی محافظت پر کمر بستہ رہیں۔۔۔اس صورت میں دین و ایمان سے مراد ایمانِ کامل اور دین کامل ہے۔۔۔۔تو منفی یہی ایمانِ کامل اور دین کامل کی ہوگی۔۔۔۔

اور اگر امانت سے مراد تکالیف شرعیہ ہیں جو آیت کریمہ **اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ** کا منطوق ہے۔اور عہد سے مراد وہ پیمان ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے حقوق ربوبیت کی حفاظت کیلئے روزِ الست اپنے بندوں سے لیا تو پھر کوئی اشکال نہیں۔۔۔۔اسلئے کہ۔۔۔۔یہ معنی دین و ایمان کے جملہ اصولوں و فروع کو شامل ہے۔اس تقدیر پر کلام میں تکریر و تاکیر ہے، جسکا منشاء تحقیق و تقریر ہے۔

۳۔۔۔۔یہ بھی احتمال ہے کہ امانت کو معنیٔ عام پر محمول کیا جائے اور عہد کو معنیٔ خاص پر۔اس صورت میں امانت کے بعد عہد کا ذکر تعمیم کے بعد تخصیص کے قبیل سے ہوگا۔

فوائد

۱۔۔۔امانت میں مال وزر، لوگوں کی عزت وآبرو، حتیٰ کہ عورت کی اپنی عفت، سب داخل ہیں، بلکہ سارے اعمالِ صالحہ بھی اللہ کی امانتیں ہیں۔حضور سے عشق ومحبت، حضور کی امانت ہے۔ارشاد ربانی ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ ۔۔۔الخ عہد میں یثاق کے دن رب سے عہد، بیعت کے وقت شیخ کے عہد، نکاح کے وقت خاوند۔۔۔یا۔۔۔زوجہ سے عہد، جو جائز وعدہ دوست سے کیا جائے، یہ سب داخل ہیں، ان سب کا پورا کرنا لازمی ہے۔۔۔۔ناجائز وعدے توڑنا ضروری ہیں۔اگر کسی سے زنا، چوری، حرام خوری یا کفر کا وعدہ کیا، تو اسے ہرگز پورا نہ کرے، کیونکہ یہ رب تعالیٰ کے عہد کے مقابلے میں ہے۔اللہ ورسول سے وعدہ کیا ہے ان سے بچنے کا، لہٰذا ان سے بچے۔

۲۔۔۔اِلَّا قَالَ: یہ حصر اکثر واغلب کا لحاظ کرتے ہوئے ہے۔

۳۔۔۔امانت کے انتفاء سے دین کا کمال اسلئے منتفی ہوجاتا ہے کہ جو امین نہ ہوگا، اسکے نزدیک دوسرے کے اموال واعراض اور بضاع ونفوس کو ضائع کردینا نامناسب نہ ہوگا۔اور ظاہر ہے کہ یہ عمل ایمان کو ناقص کردیگا، بلکہ ایمان کو قلیل تر بنادے گا اور یہ بھی تعجب نہیں کہ ایسا کرنے والا کفر تک پہنچ جائے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ کبھی کبھی گناہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

۴۔۔۔وَلَا دِیْنَ: یعنی بطورِ یقین لِمَنْ لَّا عَھْدَ لَہٗ یعنی جو اپنے عہد وقسم کو پورا نہ کرے۔بتایا جاچکا ہے کہ یہ ارشاد بطورِ زجر وتوبیخ ہے۔اسکی حقیقت مراد نہیں، صرف نفی فضیلت و کمال مقصودِ کلام ہے۔

اس سے حقیقت مراد لینے کی ایک صورت تو وہ ہے جسکا ذکر ہوچکا ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ جسے بعض افراد نے کہا ہے، وہ یہ ہے کہ جو انسان فواحشات اور منکرات کے ارتکاب کی عادت بنالے، کوئی عجب نہیں کہ اسکی دوسری حالت اسے کفر میں ڈالدے جیسا کہ حدیث میں ہے:

مَنْ یَرْتَعُ حَوْلَ الْحِمیٰ یُوْشِكُ اَنْ یَّقَعَ فِیْہِ

۔۔۔یعنی جو کسی ایسی چراگاہ کے کنارے جس میں چرانا ممنوع ہو، اپنے جانوروں کو چرائیگا، کچھ تعجب نہیں کہ وہ اس میں ڈال بھی دے۔

عَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ

﴿رَوَاهُ مُسْلِمٌ﴾

ـ ـ ـ ü ˜ ,جمہ ءحد ی $ û ـ ـ ـ

حضرت عبادہ ابن صامت سے روایت ہے، کہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور آیۃ رحمت ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، کہ جو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یقیناً محمد اللہ کے رسول ہیں۔اس پر اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ حرام فرمادے گا۔

جواہر پارے

۱۔۔۔عَنْ عُبَادَةَ: (بضم العین) حضرت عبادہ ابن صامت جو اکابر انصار اور انکے سرداروں میں سے تھے۔

۲۔۔۔مَنْ شَهِدَ: یعنی جو کوئی صدق ویقین کی توانائی کے ساتھ اس کلمے کو زبان پر جاری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام فرمادے گا۔

۳۔۔۔اس حدیث کی شرح 'حدیث معاذ' کے تحت گزر چکی ہے۔

فوائد

۱۔۔۔قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: یہ اندازِ بیان بار بار اختیار کیا گیا ہے۔

سَمِعْتُ کے بعد دو منصوبوں (حالت نصب میں رہنے والوں) کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کا کہنا ہے کہ اول مفعول ہے اور یقول کا جملہ حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سمعت کلامہ۔۔۔ میں نے آپ کا کلام سنا۔ اسلئے کہ سماعت کا تعلق ذات سے نہیں ہوتا ہے بلکہ کلام سے ہوا کرتا ہے۔۔۔ المختصر۔۔۔ یہاں کلامہ محذوف ہے، حال مذکور جسکی وضاحت کر رہا ہے، پس یہ حال مبینہ (بیان ووضاحت کرنے والا حال) ہے۔ جسکا حذف جائز نہیں۔

علامہ فارسی کا کہنا یہ ہے کہ اگر سَمِعْتُ کے بعد وہ ہو، جو سنا جا سکے جیسے 'سَمِعْتُ الْقُرْآنَ' تو وہ ایک مفعول کی طرح متعدی ہوگا اور اگر ایسی صورت نہ ہو، جیسا کہ حدیث زیر شرح میں، تو وہ دو مفعول کی طرح متعدی ہوگا، پس جملہ یقول اس بنیاد پر سمعت کا مفعول ثانی ہے۔

۲۔۔۔۔مَنْ شَھِدَ اَیْ بِلِسَانِهٖ مَطَابِقًا لِجَنَانِهٖ : یعنی زبان سے اقرار کرے درآنحالیکہ وہ اقرار اسکے دل کے یقین کے مطابق ہو۔

۳۔۔۔۔ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ : ان تمام باتوں کا التزام کرے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئیں۔

۴۔۔۔۔وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ: اوران تمام چیزوں کو قبول کرے جو اللہ کے رسول سے ثابت ہوں۔

۵۔۔۔۔ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْهِ النَّارَ: یعنی اگر وہ مجاز کی روش پر رہا اور مر گیا، تو اللہ تعالیٰ جہنم میں اس کے خلود، (ہمیشہ ہمیشہ) رہنے کو حرام فرمادے گا، بالآخر اسے نجات ملے گی اور جنت نصیب ہوگی اور اگر وہ مطیع وفرمانبردار رہا اور اسی پر موت ہوئی، تو اللہ تعالیٰ جہنم میں اسکے دخول کو حرام فرمادے گا۔رہ گیا فاسق کا معاملہ تو وہ مشیت الٰہی کے تحت ہے۔

۶۔۔۔۔مَنْ شَھِدَ۔۔۔الخ: ممکن ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہو جو ایمان لاتے ہی فوت ہوجائے۔

۷۔۔۔۔ اصل الحدیث متفق علیه من حدیثا عتبان بن مالك و اخرجه ایضًا احد والترمذی و قال ھٰذا حدیث حسن صحیح و اخرج عبد بن حمید نحوه اخرج الطبرانی فی الکبیر عن عتبان بن مالك وابن حبان عن معاذ نحوه وفی الباب عن جماعة من صحابه۔
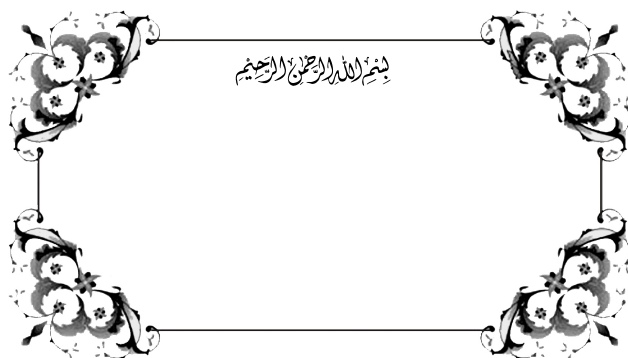
عَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَّاتَ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ ﴿رَوَاہُ مُسْلِمٌ﴾

حضرت عثمان سے روایت ہے کہ جو شخص وفات پا جائے اور وہ اس امر کا یقین رکھتا ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ﴿رواہ مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ : یعنی لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنی ومفہوم پر ایسا یقین اور ایمان ہو، کہ اسکے مخالف تصورات کا دل پر گزر ہونے نہ پائے۔

۲۔۔۔ممکن ہے کہ مذکورہ علم کا حصول موت کے وقت مراد ہو، کیونکہ اس کیلئے بھی ایک خاص فضیلت ہے۔

۳۔۔۔اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہورہی ہے کہ ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے۔

۴۔۔۔یہاں کلمہ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے مراد پورا کلمہ طیب ہے یعنی لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔الغرض۔۔۔حق کی وحدانیت کے ساتھ پیغمبر کی رسالت کا یقین بھی ضروری ہے۔

۵۔۔۔دَخَلَ الْجَنَّةَ : ایسے کو بفضلہٖ تعالیٰ ضرور جنت ملے گی۔اگر وہ بندہ گنہگار رہے، تو اسکی دو صورت ہوسکتی ہے۔

﴿۱﴾۔۔۔دوزخ میں پہنچا کر اور عذاب دوزخ سے گزار کر اسے جنت میں پہنچا دیا جائے۔

﴿۲﴾۔۔۔نبی کریم کی شفاعت سے اسے دنیا ہی میں بخش دیا جائے، اور دوزخ میں ڈالا ہی نہ جائے۔

فوائد

۱۔۔۔آپ کا نام عثمان ابن عفان ابن ابی العاص ابن امیہ ہے۔کنیت ابوعبداللہ اور لقب جامع القرآن ہے۔آپ اموی وقرشی ہیں۔آپ عبد مناف میں حضور ﷺ سے مل جاتے ہیں۔حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر شروع اسلام میں ہی ایمان لائے۔صاحب ہجرتین ہیں۔پہلی ہجرت حبشہ کی طرف اور دوسری ہجرت مدینہ پاک کی طرف۔آپ کا خطاب ذو النورین ہے، کیونکہ حضور کی دو صاحبزادیاں (رقیہ اور ام کلثوم) یکے بعد دیگرے آپکے نکاح میں آئیں۔اولادِ آدم میں کسی کے نکاح میں نبی کی دو بیٹیاں نہیں آئیں۔جنگ بدر میں حضور کے حکم سے بی بی رقیہ کی خدمت (دیکھ ریکھ)

کیلئے مدینہ میں رہے۔آپ کوغنیمت کا حصہ دیا گیا۔صلح حدیبیہ میں آپ حضور کے بھیجے ہوئے مکہ معظّمہ گئے تھے۔حضور نے اپنے بائیں ہاتھ کوفرمایا، یہ عثمان کا ہاتھ ہے،خود انکی طرف سے بیعت کی اور لی۔محرم ۲۴ھ میں تخت خلافت پرجلوہ گرہوئے۔۱۲سال خلافت کی۔۸۲سال کی عمر پاکراسود تجیبی مصری کے ہاتھ سے مدینہ منورہ میں قرآن پڑھتے ہوئے شہید ہوئے۔جنت البقیع میں آپ کی قبر انور زیارت گاہِ مخلوق ہے۔ ﴿مراۃ شرح مشکوٰۃ﴾

۲۔۔۔۔وَهُوَ يَعْلَمُ: یہاں علم سے علم یقینی مراد ہے،اب خواہ وہ زبانی اقرار پرقادر ہونے کی وجہ سے زبانی اقرار بھی کرلے۔۔۔یا۔۔۔قادر نہ ہونے کی صورت میں صرف قلبی حالت پر اکتفاء کرلے ۔۔۔المختصر۔۔۔ارشاد میں کوئی ایسی بات نہیں، جوعلم یقینی کے ساتھ ساتھ تلفظ لسانی کی نفی کرتی ہو۔

۳۔۔۔۔لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ : یہ کلمہ کلمات شہادتین کاعَلَم، ہےاسی لئے اسکے ذکر پر اکتفاءفرمایا گیا ہے۔مثال کےطور پر کہا جاتا ہے کہ: الحمد سناؤ،ال م پڑھو،سیقول،تلک الرسول کی تلاوت کرو، وغیرہ،وغیرہ۔تو اس سے ان لفظوں کی تکرار مقصود نہیں ہوتی، بلکہ پوری سورت سنانے اور پڑھنے کی بات سمجھی جاتی ہے۔۔۔الغرض۔۔۔یہ سارے کلمات اپنی اپنی سورتوں کے عَلَم (نام) ہونے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں،کبھی کبھی توصرف 'لا الہٰ' سے پورا کلمہ مراد لیا جاتا ہے۔۔۔مثلاً:

زبان نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل ۔۔۔دل ونظر جو مسلماں نہیں،تو کچھ بھی نہیں

۔۔۔۔شاعر کی مراد لا الہ سےصرف یہ دو کلمے نہیں، بلکہ پورا کلمہءطیب ہے۔۔۔یونہی:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم ۔۔۔که دانم مشکلات لا اله را

۔۔۔یعنی۔۔۔۔جب میں اپنے کو مسلمان کہتا ہوں،تو میرا بدن کانپ جاتا ہے، اسلئے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی سچی تصدیق کے جو تقاضے ہیں،انکی تکمیل کی راہ میں جومشکلات ہیں،اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔شاعر اپنے اس کلام سے یہ تاثر دینا چاہتا ہے:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔۔۔لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

۔۔۔۔خاکسار کے نزدیک مسلمان ہونا بہت آسان ہے۔۔۔مگر۔۔۔مسلمان بن کر رہنا بہت مشکل ہے۔ کلمہءطیب پر یقین واذعان اور اس پر سچا ایمان،صرف یہ نہیں چاہتا کوئی مسلمان ہوجائے ۔۔۔بلکہ۔۔۔ اسکا اصلی مطالبہ اور سچا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان ہوکر ہی نہ رہ جائے، بلکہ اپنی زندگی کی ہر ہر ساعت میں جہاں رہے مسلمان بنکر رہے اور اسلامی احکامات سے غافل نہ رہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔پورے کا پورا اسلام قبول کرکے خود اپنے پورے کے پورے کو اسلام میں داخل کردے اور اپنے عقیدہ وعمل اور سیرت و

کردار کے لحاظ سے خود اسلام کی چلتی پھرتی تصویر بن جائے۔

۴۔۔۔۔**دَخَلَ الْجَنَّةَ** : خواہ اسے دخول اوّلی حاصل ہو، یہ اس صورت میں ہوگا کہ ایمان کے بعد اس سے کوئی گناہ صادر نہ ہوا ہو۔۔۔یا۔۔۔گناہ تو صادر ہوا، لیکن اس نے سچی توبہ کرلی۔۔۔یا۔۔۔رب کریم نے اسے معاف فرمادیا۔ دخول اوّلی کی مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی گئی، تو پھر اسے دخول آخروی (گناہوں کی سزا کاٹ لینے کے بعد) میسر ہوگا۔ اسلئے کہ رب تبارک وتعالیٰ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا۔ ایمان والوں کو انکی چھوٹی سی چھوٹی نیکی بھی کام آئے گی۔۔۔ دَخَلَ الْجَنَّةَ کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دخولِ جنت کا مستحق ہوجائے گا۔

۵۔۔۔۔امام غزالی 'احیاء العلوم' میں فرماتے ہیں، کہ جس سے شہادتین کی قلبی تصدیق پالی گئی ہو اور وہ زبانی اقرار یا عبادت میں اشتغال سے پہلے ہی وفات پالے، وہ عنداللہ مومن ہے کہ نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔۔۔۔تو جنہوں نے اقرار لسانی کو ایمان کی تکمیل کیلئے شرط قرار دیا ہے، انکے نزدیک اسکی وفات ایمان سے پہلے ہی ہوگئی، لہٰذا وہ مومن نہ ہوسکا۔ امام موصوف نے اس خیال کو فاسد قرار دیا ہے اور حضور کے اس قول کو سند میں پیش کیا ہے۔ سرکار فرماتے ہیں کہ:

يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ

جسکے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا، وہ جہنم سے نکل آئے گا

۔۔۔اور۔۔۔اسکا قلب تو ایمان سے لبریز ہے، پھر اسے مومن کیوں نہ تسلیم کیا جائے؟ جس نے دل سے تصدیق کردی ہے اور اسے کلمۂ شہادتین کے وجوب کا علم بھی ہوا۔۔۔نیز۔۔۔کلمۂ شہادتین کے نطق و اقرار کا مناسب وقت بھی ملا باوجود اسکے اس نے ان کلماتِ طیبات کو زبان سے ادا نہیں کیا، تو اسکا گناہ تارک صلوٰۃ کے گناہ سے ملتا جلتا ہوگا، اسے مومن ہی کہا جائے گا اور اسے ہمیشہ جہنم میں رہنے والا نہیں قرار دیا جائے گا۔ جنکے نزدیک اقرار لسانی ایمان کا جزء۔۔۔یا۔۔۔ایمان کیلئے شرط ہے، انکے نزدیک تارکِ اقرار لسانی تارکِ صلوٰۃ کی طرح نہیں، اسلئے کہ نماز بالاتفاق ایمان کا جزء۔۔۔یا۔۔۔ایمان کیلئے شرط نہیں۔ اس مسلک والے مذکورہ بالا قیاس کو قیاس مع الفارق قرار دیں گے۔۔۔مگر۔۔۔ہمارے امامِ اعظم کے نزدیک اقرار لسانی واجبات اسلام میں سے ہے، نہ کہ واجبات ایمان سے، یعنی اسلامی احکام کے اجراء کیلئے اقرار شرط ہے، نہ کہ نفس ایمان کیلئے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ يَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاالْمُوْجِبَتَانِ قَالَ مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَاتَ لَايُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ ﴿رَوَاهُ مُسْلِمٌ﴾

حضرت جابر سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے، دو باتیں ہیں، جو جنت اور دوزخ کو واجب کرتی ہیں۔ ایک شخص نے پوچھا کہ کون سی چیزیں جنت و دوزخ کو واجب کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا، جو شخص شرک کی حالت میں مرے، وہ دوزخ میں داخل ہوگا اور جو شخص اس حال میں مرے کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ﴿رواہ مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔ثِنْتَانِ: یعنی دو خصلتیں: ایک اشراک (خدا کی ذات وصفات وافعال میں کسی کو شریک کرنا)، دوسری عدم اشراک (خدا کی ذات وصفات وافعال میں کسی کوشریک نہ کرنا) یہاں شرک سے مراد کفر ہے، اورعدم اشراک سے مراد ایمان ہے۔

۲۔۔۔مُوجِبَتَانِ: یعنی اللہ کے حکم اوراسکے وعدہ سے جنت وجہنم کوواجب کرنے والی ہیں۔

فوائد

۱۔۔۔عَنْ جَابِرٍ: آپکا نام جابرابن عبداللہ،کنیت ابوعبداللہ ہے۔انصاری ہیں، سلمی ہیں۔مشہور صحابی، بہت بڑے محدث ہیں۔ نبی ﷺ کے ساتھ ۱۸غزووں میں شریک رہے۔بدر میں بھی ساتھ تھے۔شام ومصر میں قیام رہا۔آخیر میں نابینا ہوگئے تھے۔۹۴ سال کی عمر پا کر ۷۴ھ میں وفات ہوئی۔جنت البقیع میں مزارِ پرانوار ہے۔آپ مدینے کے آخری صحابی ہیں۔﴿مرأة﴾

۲۔۔۔جب کوئی شخص ایسا عمل کرے جس سے جنت یا جہنم واجب ہوجائے، تو کہا جاتا ہے کہ: اوجب الرجل (مردنے واجب کرلیا) یہ ایک محاورہ کی بولی ہے۔اسی طرح حسنته اور سئیته کوموجبہ کہتے ہیں۔اہلسنّت کے نزدیک اعمال صرف سبب ہوتے ہیں۔جنت وجہنم کا وجوب تو صرف اللہ تعالیٰ کے وعدہ ووعید سے ہوتا ہے۔

۳۔۔۔مَا الْمُوجِبَتَانِ: ای السببان یعنی موجب سے سبب مراد ہے۔اسلئے کہ موجب حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے۔۔۔ہاں۔۔۔کفروشرک پرموت جہنم میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے، اور توحیدوایمان پرموت، دخول جنت کا سبب ہے۔

۴۔۔۔کفر عام ہےاورشرک خاص ہے۔ہرشرک کفر ہے، مگر ہرکفرشرک نہیں ہے۔ہرمشرک کافر ہے،مگر ہرکافرمشرک نہیں۔۔مثلاً: شیطان کافر ہے،مگرمشرک نہیں۔آریہ کافرہیں،مگرمشرک نہیں۔مسیلمہ کذاب، قادیانی کذاب اورسارے مدعیان نبوت کاذبہ کافر تھے،مشرک نہ تھے۔جملہ گستاخانِ شان رسالت مآب کافرہیں،مشرک نہیں،وغیرہ،وغیرہ۔توکفرہی جہنم میں ہمیشگی کا سبب ہے۔شرک کفرہی کی ایک بڑی شکل ہے۔توایسے تمام مواقع پرجہاں جہنم میں ہمیشگی اور جنت میں دخول کی بات ہورہی ہو،شرک سے کفر مراد ہوگا، اورعدم شرک سے ایمان۔ایسی صورت میں شرک کا مقابل توحید نہیں، بلکہ ایمان ہے۔

حدیث ۳۳

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فِيْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَاءَ عَلَيْنَا وَخَشِيْنَا اَنْ يُّقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَتَيْتُ حَآئِطًا لِلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُ لَهٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِيْ جَوْفِ حَآئِطٍ مِّنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبِيْعُ الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَاشَاْنُكَ قُلْتُ كُنْتَ بَيْنَ اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَيْتُ هٰذَاالْحَآئِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَهٰٓؤُلَآءِ النَّاسُ وَرَآئِیْ فَقَالَ يَآ اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَعْطَانِیْ نَعْلَيْهِ فَقَالَ اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيْكَ مِنْ وَّرَآءِ هٰذَ الْحَآئِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلُ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَاهَاتَانِ النَّعْلَانِ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِیْ بِهِمَامَنْ لَّقِيْتُ يَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْ يَیَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ يَآ اَبَا هُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِیْ عُمَرُ وَاِذَا هُوَ عَلٰی اَثَرِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهٗ بِالَّذِیْ بَعَثْتَنِیْ بِهٖ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَیَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلٰی مَا فَعَلْتَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ اَبَعَثْتَ اَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِیَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِّهِمْ ﴿رواہ مسلم﴾

-- - Û $ حدیء جمہ ,˜ Ü - --

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے اور ہماری جماعت میں ابو بکر اور عمر بھی تھے۔ اچانک حضور ﷺ ہمارے درمیان سے اٹھے اور باہر تشریف لے گئے اور جب ہمارے پاس واپس آنے میں دیر کی تو ہم ڈرے، کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں آپ کو کوئی ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ یہ خیال کر کے ہم گھبرا گئے اور سب سے پہلا شخص میں تھا جو گھبرا کر اٹھا، پھر ہم سب رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ میں آپ کو ڈھونڈتا ہوا قبیلہ بنی نجار انصار کے باغ کے پاس پہنچا۔ میں باغ کے چاروں طرف دروازے کی تلاش میں پھرا، لیکن کوئی دروازہ نہ ملا۔ اچانک میری نظر ایک نالی پر پڑی جو باہر کے کنویں سے باغ کے اندر گئی تھی۔ میں سمٹا اور نالی کے ذریعہ باغ کے اندر داخل ہو گیا۔ حضور ﷺ وہاں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر فرمایا، ابو ہریرہ، میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، فرمایا تیرا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر آپ اٹھے اور چلے گئے اور واپس آنے میں دیر فرمائی۔ ہم کو یہ اندیشہ تھا، کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ یہ خیال کر کے ہم گھبرا گئے اور سب سے پہلا شخص میں تھا جو گھبرا کر اٹھا اور اس باغ میں آیا۔ میں لومڑی کی طرح سمٹا اور باغ میں داخل ہو گیا اور وہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں۔ آپ نے (سن کر) مجھ کو اپنی دونوں جوتیاں عنایت فرمائیں اور پھر فرمایا میری ان جوتیوں کو لے جاؤ اور جو شخص اس باغ کے باہر ملے اور وہ اس امر کی زبان اور دل سے شہادت دے، کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور دل سے اسکا یقین بھی رکھتا ہو۔ اسکو جنت کی بشارت دے دو۔

(واپسی میں باغ کے باہر) سب سے پہلے مجھ کو عمر ملے اور مجھ سے پوچھا، ابو ہریرہ یہ جوتیاں کیسی ہیں، میں نے کہا یہ جوتیاں رسول اللہ ﷺ کی ہیں، انکو میرے حوالے کر کے اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ، جو شخص تجھ کو ملے اور اس بات کی گواہی دے، کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور دل سے اسکا یقین بھی رکھتا ہو، تو میں اس کو جنت کی بشارت دیدوں (یہ سن کر) حضرت عمر نے میری چھاتی پر (ہاتھ) مارا، کہ میں سرینوں کے بل گر پڑا اور پھر کہا، ابو ہریرہ، واپس چلے جاؤ، میں واپس چلا آیا، اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر زور

زور سے رونے لگا، عمر بھی میرے پیچھے ہی تھے (مجھ کو روتا دیکھ کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ابو ہریرہ، (کیا ہوا) تیرا کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا، راستے میں مجھ کو عمر ملے، میں نے (انکو) اس خبر سے آگاہ کیا، جس پر آپ نے مجھے مامور فرمایا تھا، عمر نے (میرے الفاظ سن کر) میرے سینے پر (ہاتھ) مارا کہ میں پشت کے بل گر پڑا اور پھر مجھ سے کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ یہ (سن کر) فرمایا، عمر تم نے ایسا کیوں کیا۔ عمر نے عرض کیا، یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، کیا آپ نے ابو ہریرہ کو جوتیاں دے کر یہ پیام بھیجا تھا، کہ جو شخص (راستے میں) ملے اور اس بات کی گواہی دے، کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور دل سے اسکا یقین بھی رکھتا ہو، تو اسکو جنت کی بشارت دیدے، آپ نے فرمایا، ہاں۔ عمر نے عرض کیا (یا رسول اللہ) ایسا نہ کیجئے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لوگ (یہ سن کر) اس پر بھروسہ کر لیں گے اور سست ہو جائیں گے، آپ ان کو عمل کرنے دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اچھا (انکو عمل کرنے کیلئے) چھوڑ دو۔ ﴿مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔فِی نَفَرٍ: آدمی کی قوم وقبیلہ۔تین سے دس تک کا گروہ،جس میں عورت نہ ہو۔یہ اسم جمع ہے۔اس لفظ سے اسکا کوئی واحد نہیں،اور کبھی اسکا استعمال قوم وجماعت کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔خواہ جنوں کی قوم وجماعت ہو یا انسانوں کی۔

۲۔۔۔بَیْنِ اَظْھُرِنَا: یعنی ہمارے درمیان سے-:زبانِ عرب میں یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے اور کبھی کبھی قوم کے درمیان مطلقاً اقامت کے معنی میں بھی اسکا استعمال ہوتا ہے۔

۳۔۔۔اَنْ یُّقْتَطَعَ: اقتطاع کا معنی ہے کسی چیز سے کوئی ٹکڑا جدا کرنا،اب اسکا معنی یہ ہوا کہ ہمیں خوف لگا کہ کہیں کسی دشمن وغیرہ سے ہماری غیر موجودگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچے۔

۴۔۔۔فَزِعْنَا: خشیت کا تعلق باطن سے ہے،ظاہر میں اسی خشیت کے آثار کا ظہور فزع کہلاتا ہے۔حضرت ابو ہریرہ کے قول فکنت اول من فزع کے مناسب یہی معنی ہیں۔

۵۔۔۔حَآئِطًا: اسکے اصل معنی 'دیوار' کے ہیں،مگر اس باغ کو بھی حائط کہتے ہیں جو دیواروں سے گھرا ہوا ہو۔چنانچہ اب اسکا استعمال دیوار اور باغ،دونوں معنی میں ہونے لگا۔

۶۔۔۔ھَلْ اَجِدُلَہٗ بَابًا: کھلا ہوا دروازہ۔۔۔المختصر۔۔۔انھوں نے دروازے کی تلاش کی،مگر انہیں کھلا ہوا دروازہ نہیں ملا۔ممکن ہے کہ انھوں نے دیوار کے بعض اطراف کا چکر لگایا ہو ۔۔۔یا۔۔۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سرکار نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا ہو،تاکہ کوئی آنہ سکے۔ویسے ظاہر یہی ہے کہ وہ جس راستے سے داخل ہوئے،اسی راستے سے باغ سے باہر نہیں نکلے،بلکہ اس راستے سے نکلے،دخول کے بعد جو انھیں ملا۔

۷۔۔۔فَاِذَا رَبِیْعٌ: ربیع کا معنی ہے چھوٹی نہر(جسے نالی بھی کہتے ہیں)۔

۸۔۔۔ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَۃٍ: اس میں تین احتمال ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔خارجہ بئر کی صفت ہو۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا،ایسی نالی جو ایسے کنویں سے جاری تھی جو کنواں باغ کے باہر تھا۔

﴿۲﴾۔۔۔ بئر کوتنوین کے ساتھ پڑھا جائے اور خارجہ کو'ہا' کے ضمیر کے ساتھ اور یہ ضمیر الحائط کی طرف لوٹائی جائے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا: بئر فی موضع خارج الحائط۔ یعنی ایسا کنواں جو ایسی جگہ تھا جو باغ سے۔۔۔۔یا۔۔۔۔دیوار سے باہر تھی۔

﴿۳﴾۔۔۔خارجہ کو کسی شخص کا نام قرار دیکر بئر کی اضافت اسکی طرف کردی جائے، یعنی ایسی نالی جو خارجہ کے کنویں سے نکلی تھی۔

۔۔۔۔ان تمام احتمالات میں: پہلا احتمال سب سے زیادہ ظاہر ہے۔ اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ بئر کا اطلاق اگرچہ باغ پر بھی کیا جاتا ہے، جیسے بئر بضاعہ (جو ایک باغ ہے) مگر یہاں بئر اپنے مشہور ومعروف (کنواں کے) معنی ہی میں ہے۔

۹۔۔۔۔فَاحۡتَفَزۡتُ: احتفاز یعنی زانو یا سُرین پر سیدھا بیٹھنا۔ یعنی میں سمٹ گیا، جیسا لومڑی سمٹتی ہے۔

۱۰۔۔۔۔اَبُوۡ هُرَيۡرَةَ ؟: چونکہ دروازہ بند تھا، اسلئے حضور کو حضرت ابو ہریرہ کا آنا عجیب سا لگا، تو آپ نے بطورِ استفہام دریافت فرمایا کہ، کیا تو ابو ہریرہ ہے؟

۱۱۔۔۔۔وَاَعۡطَانِيۡ نَعۡلَيۡهِ: یعنی اپنی نعلین شریفین ہمیں عطا فرمائی، اسلئے کہ عادتاً ایسا ہوتا ہے کہ اگر پہچان کیلئے کوئی نشانی دی جاتی ہے، تو ایسی ہی ہوتی ہے جسے دیکھ کر دیکھنے والا پہچان لے۔ ہوسکتا ہے کہ آپکے پاس اس وقت اسکے سوا کوئی ایسی چیز نہ رہی ہو، جسکو بطورِ نشانی عطا فرماتے۔ نعلین شریفین کو عطا کرنے میں کچھ دوسرے نکتے بھی بیان کئے گئے ہیں۔۔۔۔مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔جسکے پیر میں جوتا ہوتا ہے، اسکو چلنے میں سہولت وآسانی ہوتی ہے، تو نعلین عطا فرما کر، یہ اشارہ فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت انسانیت کے کاموں کی آسانی اور انکی سہولت وراحت کیلئے ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔نعلین شریفین عطا فرما کر شہادت کے بعد استقامت وثابت قدمی کی بشارت بھی دیدی جیسا کہ ارشاد فرمایا: اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسۡتَقِمۡ ((کہو) کہ میں اللہ کو مان گیا اور پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو)۔

۱۲۔۔۔۔حضرت ابو ہریرہ کا اضطراب اور پھر بہ عجلت بارگاہِ رسول میں حاضر ہونا، ایک عاشق صادق کی دلی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ گویا وہ زبانِ حال سے عرض کرتے ہیں کہ، میرا محبوب میری جان کیلئے ایسا ہی ہے، جیسے کہ جان بدن کیلئے، تو اب اسکا یکدم جدا ہوجانا ایسا ہی ہے، جیسے کہ جان بدن سے نکل جائے۔

۱۳۔۔۔حضور ﷺ اس باغ میں رونق افروز ہیں، ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے قیاس و قرینہ سے سمجھ لیا ہو اور یہ بھی کچھ مستبعد نہیں کہ آپ کے مشامِ محبت میں نسیم جمال یار کی خوشبو آ گئی ہو۔ عاشقین کی زبان سے یہ بات بھی بہت صحیح لگتی ہے کہ اے میرے محبوب، آپ کے گیسوئے عنبر بار کی خوشبو لوگوں کو چمن کی طرف کھینچ کر لاتی ہے، ورنہ نسیم سحری کی مہک سے کس کو غرض ہے۔

۱۴۔۔۔حضور ﷺ نے جب ان کے کمالاتِ محبت اور غایت اخلاص کے ساتھ ادنیٰ سی مفارقت نہ برداشت کر سکنے اور بے چین و مضطرب و وحشت زدہ ہو جانے کو ملاحظہ فرمایا، تو آپ عالم قدس کی طرف متوجہ ہو گئے اور رحمت خداوندی حاصل کرنے کی درخواست پیش کر دی۔ پس آپ پر فوراً حدیث شریف میں مذکور خوش خبری و بشارت کی وحی فرمائی گئی۔

۱۵۔۔۔ **فَمَنْ لَقِيْكَ** : اسکا حاصل معنی یہ ہے کہ قلب کی استقامت کے ساتھ شہادتین (توحید و رسالت) کی شہادت دینے والوں کو اس بشارت کی خبر کر دو، یعنی اسکا یہ معنی نہیں کہ جب کوئی تمہارے سامنے شہادت دے، تو پھر تم اس کو بشارت دو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جنکا شاہد ہونا تمہیں معلوم ہے، ان میں سے جن سے ملاقات ہو جائے، انکو بشارت دیدو۔

۱۶۔۔۔ **فَقَالَ ارْجِعْ** : چونکہ حضرت عمر کو نبی کی طرف سے یہ علم ہو چکا تھا، کہ یہ حکم لازمی و ایجابی نہیں ہے، بلکہ اپنے چاہنے والوں کی محبت و اخلاص کو ملاحظہ فرما کر ان کے دلوں کو خوش کرنے کیلئے ایسا ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اسی لئے حضرت عمر نے اس حکم کو واپس لینے کی عاجزانہ درخواست پیش کر دی، اور درخواست کی مصلحت و حکمت کو بھی واضح کر دیا۔ چنانچہ سرکار نے کمالِ رحمت و شفقت کی بنیاد پر جو حکم دیا تھا، مصلحت و حکمت کی طرف توجہ فرماتے ہی اسے واپس لے لیا۔ حضرت عمر کی درخواست قبول فرما لینا ہی دلیل ہے کہ اس سے پہلے جو حکم فرمایا تھا، وہ ایجابی نہیں تھا۔ اگر وہ حکم ایجابی ہوتا، تو سرکار کبھی بھی حضرت عمر کی درخواست قبول نہ فرماتے۔

۱۔۔۔ **فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ** : یعنی کیا تو ابو ہریرہ ہے؟ ممکن ہے یہ استفہام تقریری ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ استفہام اپنی حقیقت پر ہو اور اس وقت آپ پر اسی بشارت کی وحی ہو رہی ہو اور آپ اس

وحی ہونے کے سبب سے خود اپنی بشریت سے غائب ہو گئے ہوں اور ملائے اعلیٰ کی طرف کامل توجہ کی وجہ سے حضرت ابو ہریرہ کو پہچان نہ سکے ہوں ۔۔۔﴿واللہ اعلم بالصواب﴾۔۔۔مذکورہ استفہام کا تقریری ہونا زیادہ ظاہر ہے۔

۲۔۔۔وَهٰٓؤُلَآءِ النَّاسُ وَرَآئِي : یعنی میرے پیچھے رہ جانے والے لوگ منتظر ہیں اس بات کو جاننے کے، کہ آپ کے ساتھ کیا پیش آیا۔

۳۔۔۔اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ : مرقات میں ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس مقام نوری میں حضور ﷺ کو تجلی ءطوری کا حصول ہو گیا ہو، تو آپ نے نعلین شریفین اتار دی اور اپنے اصحاب کو کونین کی دولت عطا فرما دی۔۔۔یا۔۔۔اس میں دین کے تعلق سے اپنے اصحاب کی ثابت قدمی اور دین کیلئے ان کی مخلصانہ انتہائی درجہ کی جدوجہد کی طرف اشارہ ہے۔

نعلین شریفین عطا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر چہ حضرت ابو ہریرہ صحابی ءرسول ہیں، عادل میں انکی خبر مقبول ہے، انکے صدق کو سمجھنے کیلئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔۔۔بایں ہمہ ۔۔۔انکی خبر کی سچائی کی یہ دوسری دلیل بھی انکو حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ رسولِ کریم کی کفش برداری کی سعادت بھی مل جائے، اور یہ ظاہر ہو جائے کہ توحید و رسالت کی قلبی تصدیق صرف رسول کریم کے کفش برداروں ہی کو جنتی بناتی ہے۔

۴۔۔۔يَشْهَدُ : یعنی لوگوں کو خبر دے دو کہ جسکی یہ شان ہوگی، یعنی وہ شہادتین کے اقرار و شہادت کے ساتھ توحید و رسالت پر یقین رکھنے والا ہو، اور اسکے تعلق سے کسی تردد کا شکار نہ ہو۔ اسکے بارے میں اس کو ایسا شرح صدر حاصل ہو چکا ہو، جہاں کسی شک و ریب کی گنجائش نہ ہو، تو پھر وہ جنتی ہے ۔۔۔المختصر۔۔۔جو ان صفاتِ مطلوبہ سے موصوف ہوگا، وہ جنتی ہوگا۔ اسکی بشارت سب کو سنادو۔۔۔ الغرض۔۔۔ارشاد کا مقصد یہ نہیں کہ انکے یقین واذعان واستیقان کو جان لینے کے بعد وہ بشارت دیں، اسلئے کہ 'استیقان قلبی' یہ دل کی کیفیت ہے، جسکو دیکھ کر سن کر معلوم نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔۔۔مَنْ لَقِيَكَ : یعنی جو تجھے دیکھے یا جسے تو دیکھے۔۔۔الغرض۔۔۔جس سے تو ملے یا جو تجھ سے ملے، اور حدیث شریف میں ذکر کردہ صفات سے موصوف ہو، اسے جنتی ہونے کی خوشخبری دیدو۔۔۔المختصر۔۔۔مِنْ وَّرَآءِ هٰذَا الْحَآئِطِ کی قید، قید احترازی نہیں ہے، کہ جو باغ کے پیچھے ملے، اسی کو بشارت دی جائے اور دوسروں کو نہیں۔

۶۔۔۔یہ ارشاد مبارک اہل حق کے مذہب کے صحیح ہونے کی روشن دلیل ہے کہ قدرت کی

صورت یا طلب کی صورت میں، نطق واقرار کے بغیر توحید و رسالت کا اعتقاد نفع بخش نہیں۔اسی طرح نطق واقرار بغیر اعتقاد کے بالاجماع نا قابل قبول ہے۔

۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔دونوں ضروری ہیں، صرف فرق اتنا ہے کہ نطق میں اختلاف ہے کہ وہ ایمان کیلئے شرط ہے یا اسکا رکن (جزء) ہے۔نطق کیلئے یہ بھی گنجائش ہے کہ کوئی عذر ہو، تو یہ ساقط بھی ہوجاتا ہے ۔۔۔۔یہ بھی ذہن نشین رہے کہ نطق امامِ اعظم کے نزدیک عند القضاء، ایمان (جس پر اسلامی احکام کا اجراء کیا جاسکے) کیلئے شرط ہے، نہ کہ عند اللہ ایمان (نفس تصدیق جو مانع خلود نار ہو) کیلئے۔

۷۔۔۔۔**قَلْبُهٗ**: قلب کا لفظ یہاں صرف تاکید اور توہم مجاز کی نفی کیلئے ہے، اسلئے کہ استیقان تو قلب ہی کی صفت ہے، یہ ایسے ہی جیسے کہا جاتا ہے 'رأیتُ بعینی' یعنی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا، تو یہاں 'بعین' کی قید تاکید اور مجاز کے وہم کو دور کرنے کیلئے ہے، اسلئے کہ دیکھا تو آنکھ ہی سے جاتا ہے۔

۸۔۔۔۔**فَضَرَبَ عُمَرُ**: یہاں سیاق وسباق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگتا ہے کہ کچھ باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں۔وہ باتیں کچھ اس طرح کی ہونگی۔حضرت ابوہریرہ کی باتیں سنکر حضرت عمر نے انکو لوٹانے کے ارادے سے فرمایا ہوگا 'ارجع'، لوٹ جا۔حضرت عمر کے نطق کا مطابق صواب ہونا اور آپ کی رائے کا موافق کتاب ہونا، ایک روشن حقیقت تھی، اسکے باوجود حضرت ابوہریرہ نے انکے حکم کو تسلیم نہیں کیا اور لوٹنے سے انکار کیا، کیونکہ آنحضرت ﷺ کا جو ظاہر حکم تھا، وہ ہر حاکم وآمر کے حکم وامر پر مقدم تھا۔۔۔الغرض۔۔۔حضرت عمر کی نظر دینی حکمت و مصلحت پر تھی اور حضرت ابوہریرہ کی نظر ظاہر حکمِ رسول پر تھی۔جب حضرت ابوہریرہ نے حضرت عمر کی بات نہیں مانی، تو آپ جلال میں آگئے ہونگے اور انکو لوٹانے کیلئے انکے سینے پر ہاتھ کی ضرب لگائی ہوگی، اور کمزور ہونے کے سبب وہ گر پڑے ہونگے۔واقعہ کی یہ تفصیل اسلئے قرینِ قیاس ہے کہ حضرت عمر جیسی شخصیت کا کسی باعث اور کسی معقول سبب کے بغیر ابتداءً کسی کو ماردینا، عقل و دانش کی نظر میں بعید تر ہے۔

۹۔۔۔۔**اِرْجِعْ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ**: چونکہ حضرت عمر نے اپنی فراست سے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی، کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوہریرہ کو جو حکم دیکر بھیجا ہے، وہ صرف مومنین کے دل کو خوش کرنے اور ان کو بشارت دینے کیلئے ہے، تو انھوں نے خیال کیا کہ اس بشارت کا چھپالینا انکے حق میں زیادہ بہتر ہے۔اسلئے کہ بشارت سن کر اس بات کا امکان ہے، کہ وہ سست ہوجائیں اور عمل کرنے میں تساہلی برتنے لگیں، خاص کر کہ وہ لوگ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اسی لئے انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے مراجعت (لوٹ جانے) کی بات کی۔

۔۔۔الغرض۔۔۔حضرت عمر کا مقصد رسول کریم کی ذات پر اعتراض کرنا، یا آپ کے حکم کو رد کرنا نہیں تھا۔اس پورے کلام کا حاصل یہ ہے کہ بے شک آنحضرت ﷺ عالمین کیلئے رحمت، مومنین کیلئے رحیم، علی وجہ الکمال، مظہر جمال اور ہر حال میں امت کیلئے طبیب کامل تھے۔جب آپ نے اپنے چاہنے والوں کے خوف و بے قراری اور اضطراب کو ملاحظہ فرمایا، تو بشارت کے ذریعہ انکے علاج کا ارادہ فرمایا۔۔۔الغرض۔۔۔بشارت کے ذریعہ انکے خوف وڈر کو دور کرنا ایک طرح کا معالجہ بالاضداد ہے۔

اب رہا معاملہ حضرت عمر کا، تو آپ مظہر جلال تھے۔آپ نے غور فرمایا کہ اکثر لوگوں پر تکاسل واتکال (سستی اور بھروسہ کر لینے) کا غلبہ ہے، تو انھوں نے خیال کیا، کہ اکثر لوگوں کیلئے معجون مرکب (یعنی خوف وبشارت دونوں) ضروری ہیں۔ بلکہ حالاتِ خوف ہی میں رہنا ان کیلئے زیادہ مناسب ہے۔

آنحضرت ﷺ نے آپ کی رائے سے اتفاق فرما کر ظاہر فرمادیا کہ آپ رضی اللہ عنہ، صاحب مرتبہء عَلِیّہ ومرتبہءجَلِیّہ ہیں، یعنی علم وکرم وشجاعت وشرافت میں ایسی فضیلت وبرتری رکھتے ہیں، جو دوسروں سے آپ کو ممتاز کرتی ہے۔

۱۰۔۔۔بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ: یعنی (آپ پر میرے ماں باپ قربان) اس قول سے اس بات کا جواز نکلتا ہے، کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم پر میرے ماں باپ قربان، خواہ ماں باپ مومن ہوں یا کافر، زندہ ہوں یا مردہ۔

۱۱۔۔۔اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں بھی واضح ہو کر سامنے آگئیں:

﴿۱﴾۔۔۔اتباع کرنے والوں کو اپنے متبوع (جسکی اتباع کی جائے) کے حال کو پورے احتمال کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔۔۔اور۔۔۔تحصیل مصالح اور رفع مفاسد کیلئے انکے ارشادات پر خاص توجہ رکھنی چاہئے۔

﴿۲﴾۔۔۔ایک انسان دوسرے کی مملوکہ زمین پر اسکی اجازت کے بغیر داخل ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اسے مالک مکان سے اپنی محبت وغیرہ کی وجہ سے یقین ہو، کہ وہ ناراض نہیں ہوگا۔حضرت ابو ہریرہ کا باغ میں داخل ہونا، نبی کریم کا اسکو مقرر رکھنا، یعنی ثابت رکھنا اور اس عمل سے منع نہ فرمانا۔۔۔نیز۔۔۔اس عمل کو ناپسند بھی نہ کرنا اسکی واضح دلیل ہے۔۔۔مالک زمین سے محبت والفت۔۔۔اور پھر یہ یقین کہ میرا عمل مالک پر شاق نہیں گزرے گا، تو وہ اس مالک زمین کی دوسری چیزوں سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔۔۔مثلاً: زمین کے سامان سے فائدہ اٹھانا، اس پر لگے درختوں کے پھل کھانا۔۔۔بلکہ۔۔۔اپنے گھر بھی لے جانا، مالک کی سواری پر سوار ہونا، وغیرہ، وغیرہ، ایسا تصرف جو مالک پر گرانی اور اسکی ناراضگی کا سبب نہ ہو۔

عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَفَاتِیْحُ الْجَنَّۃِ شَھَادَۃُ اَنْ لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ ﴿رَوَاہُ اَحْمَدُ﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضور نے مجھ سے ارشاد فرمایا، کہ جنت کی کنجیاں لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ کی شہادت ہے۔ ﴿رواہ احمد﴾

جواہر پارے

ا۔۔۔یہاں لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ سے مراد پورا کلمہ طیبہ ہے، یعنی لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اسکی طرف اشارہ اس سے پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔

۲۔۔۔مَفَاتِیْحُ: جمع لے آئے، مراد اورافراد مومنین کے اعتبار سے۔۔۔یا۔۔۔جنتوں کی کثرت کے اعتبار سے۔۔۔یا۔۔۔درجات ومنازلِ جنت کے تعدد کے اعتبار سے۔گویا یہ ایک کنجی بے شمار کنجیوں کی جگہ پر ہے۔ہر ہر جنت کے ہر ہر درجے، ہر ہر منزل اور جنت میں ہر ہر خواہش۔۔۔نیز۔۔۔ مومنین کے ہر ہر فرد کیلئے یہی ایک کنجی ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ کلمہ کے ہر جزء کو بطور مبالغہ مفتاح قرار دیا ہو۔

فوائد

ا۔۔۔کلمہ سے مراد سارے عقائد اسلامیہ ہیں،لہٰذا منافقین ومرتدین، اگر عمر بھر کلمہ پڑھیں مگر جنتی نہیں۔

۲۔۔۔قَالَ لِیْ: اس قول میں اشارہ ہے کہ جب حضور نے یہ فرمایا کہ اس وقت حضرت معاذ تنہا تھے یا یہ کہ خطاب کا روئے سخن انہی کی طرف تھا۔

۳۔۔۔طیبی فرماتے ہیں کہ مفاتیح الجنۃ مبتدا ہے اور شہادت اس کی خبر اور دونوں میں من حیث الجمع والافراد مناسبت نہیں۔پس یہ شاعر کے اس قول کے قبیل سے ہوگیا، 'دمعی جیاعا'۔ ۔۔۔معی: آفت۔۔جیاعا: یہ جائع کی جمع ہے۔جائع کا معنی بھوکا۔۔۔شاعر نے اپنے قول مذکور میں شدت بھوک سے لاغر ہوجانے والی اونٹنی کی آنت کے ہر ہر جزء کو ایک ایک آنت کی منزل میں کر دیا اور اس طرح بھوک کی شدت کی تصویر کشی کی۔۔۔یونہی۔۔۔وہ شہادت، اعمال صالحہ جسکے تابع

ہوکر کنجی کے دندانے کے طرح ہوگئے ہیں، تو اسکے ہر جزء کو مفتاح واحد کی منزل میں کر دیا گیا ہے۔

۴۔۔۔۔ظاہر یہ ہے کہ شہادت سے مراد جنس شہادت ہے، پس ہر ایک کی شہادت خود اسکے دخول جنت کی مفتاح ہے، خواہ ابتداءً ہو یا انتہاءً۔ رہ گئے اعمال صالحہ، تو وہ مراتب ذات اور درجات کی بلندی کیلئے ہیں۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔ چونکہ شہادت جنت کے ہر ہر دروازے کی کنجی ہے، تو گویا وہ مفاتیح ہیں ۔۔۔یا یہ کہ۔۔۔شہادت مصدر ہے، تو وہ قلیل وکثیر دونوں کو شامل ہونے کے سبب جمع اور غیر جمع، دونوں کی خبر ہوسکتی ہے۔

۵۔۔۔۔شہادت کی تشبیہ کنجیوں سے دی۔ یہ اسلئے کہ جسطرح کنجیاں گھر میں دخول کا سبب ہیں، اسی طرح شہادت جنت میں دخول کا سبب ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔سب دخول ہونے میں دونوں مشابہ ہیں۔۔۔۔

۶۔۔۔۔عبارت یونہی ہونی چاہئے تھی شَهَادَةَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ كَمَفَاتِيحُ الْجَنَّةَ۔اس ارشاد میں حرف تشبیہ کو حذف کر دیا اور ترتیب الٹ کر مشبہ بہ کو مشبہ پر مقدم کر دیا۔اس سے معنی مشبہ کی تحقیق میں زیادتی ومبالغہ مقصود ہے۔

۷۔۔۔۔شرعاً چونکہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت کے بغیر یونہی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت کے بغیر غیر معتبر ہے، اسلئے ایک کے ذکر کے بعد دوسرے کے ذکر کی ضرورت نہیں رہ جاتی، کیونکہ دونوں شہادتیں آپس میں متلازم ہیں۔

۸۔۔۔۔قال فی مجمع الزوائد رواه احمد البزاز وفيه انقطاع بين شهر و معاذ واسمعيل بن عياش روايته عن اهل الحجاز ضعيفة وهذا منها واخرجه ايضا ابوداؤد والحاكم و فى الباب عند الطبرانى فى الكبير عن معقل بن يسار بلفظ لكل شيءٍ مفتاح و مفتاح السموت والارض قول لااله الاالله و يؤيده مااخرجه مسلم من حديث ابى هريره لقنو اموتاكم لااله الاالله۔

عَـنْ عُثْـمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ قَالَ اِنَّ رِجَالًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّـی الـلّٰـہُ عَـلَیْـہِ وَسَـلَّمَ تُوُفِّیَ حَزَنُوْ اعَلَیْہِ حَتّٰی کَادَ بَعْضُھُمْ یُـوَسْـوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَکُنْتُ مِنْھُمْ فَبَیْنَا اَنَا جَالِسٌ مَرَّعَلَیَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ فَلَمْ اَشْعُرْبِہٖ فَاشْتَکٰی عُمَرُ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا ثُـمَّ اَقْبَلَا حَتّٰـی سَلَّمَ عَلَیَّ جَمِیْعًا فَقَالَ اَبُوْ بَکْرٍمَّا حَمَلَکَ اَنْ لَّا تَـرُدَّ عَـلٰـی اَخِیْـکَ عُـمَـرَ سَلَامَہٗ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ فَقَالَ عُمَرُ بَلٰی وَالـلّٰـہِ لَقَـدْ فَعَـلْـتَ قَـالَ قُـلْـتُ وَاللّٰہِ مَاشَعُرْتُ اَنَّکَ مَرَرْتَ وَلَاسَـلَّـمْـتَ قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَغَلَکَ عَنْ ذٰلِکَ اَمْـرٌ فَـقُـلْتُ اَجَلْ قَالَ مَاھُوَ قُلْتُ تَوَفَّی اللّٰہُ تَعَالٰی نَبِیَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَـلَیْـہِ وَسَـلَّمَ قَبْلَ اَنْ نَسْئَلَہٗ عَنْ نَجَاۃِ ھٰذَ الْاَمْرِ قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ قَدْ سَـئَـلْتُـہٗ عَـنْ ذٰلِکَ فَقُمْتُ اِلَیْہِ وَقُلْتُ لَہٗ بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ اَنْتَ اَحَـقُّ بِھَـا قَالَ اَبُوْ بَکْرٍ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَانَجَاۃُ ھٰذَ الْاَمْرِ فَقَالَ رَسُـوْلُ الـلّٰـہِ صَـلَّـی الـلّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبِلَ مِنِّی الْکَلِمَۃَ الَّتِیْ عَرَضْتُ عَلٰی عَمِّیْ فَرَدَّھَا فَھِیَ لَہٗ نَجَاۃٌ ﴿رواہ احمد﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت عثمان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پر آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ نہایت غمگین تھے اور بعض کے دلوں میں (طرح طرح کے) وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اور میں بھی انہی لوگوں میں تھا (اسی حال میں) بیٹھا ہوا تھا، کہ عمر میرے پاس سے گزرے اور (مجھ کو) سلام کیا، لیکن (محویت میں) مجھ کو خبر نہ ہوئی۔ عمر نے (میری اس بے رخی کی) ابوبکر سے شکایت کی اور پھر دونوں میرے پاس آئے اور دونوں نے مجھ کو سلام کیا اور اس کے بعد ابوبکر سے کہا، عثمان، کیا بات ہے، تم نے اپنے بھائی عمر کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا، میں نے تو ایسا نہیں کیا، عمر نے کہا کہ خدا کی قسم تم نے ایسا ہی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کی قسم، نہ تو مجھ کو تمہارا ادھر سے جانا یاد ہے اور نہ تمہارے سلام کرنے کا خیال ہے۔ ابوبکر نے کہا (عمر) عثمان نے سچ کہا، (عثمان) تم کو کسی شغل نے جواب سلام سے بعض رکھا ہے، میں نے کہا، ہاں۔ ابوبکر نے پوچھا، تم کس خیال میں تھے؟ میں نے کہا خداوند تعالیٰ نے اپنے نبی کو وفات دی، اس سے پہلے کہ ہم ان سے اس امر سے (یعنی خطرات و وساوس سے) نجات کا کوئی راستہ دریافت کرتے۔ ابوبکر نے کہا، میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرلیا ہے۔ (یہ سن کر) میں کھڑا ہو گیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ اس امر کے پوچھنے کے ہر طرح مستحق تھے۔ ابوبکر نے کہا میں نے (ایک روز) رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ، اس امر سے نجات کا کیا ذریعہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص ہمارے اس کلمے کو قبول کرلے، جس کو میں نے اپنے چچا (ابو طالب) کے سامنے پیش کیا تھا اور انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، وہی کلمہ اس کیلئے نجات کا ذریعہ ہے ﴿رواہ احمد﴾

۱۔۔۔**یُوَسْوِسُ**: وسوسہ یعنی نفس اور شیطان کی طرف سے بدخیالیاں جن میں نہ کوئی نفع ہے اور نہ کوئی بھلائی۔قاموس میں ہے کہ وسوسہ حدیث نفس وشیطان کو کہتے ہیں جن میں کوئی نفع اور بھلائی نہ ہو۔

۲۔۔۔**بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ** : وسوسہ ہونا یا وسوسہ میں گرنا۔دونوں کا حاصل یہی ہے کہ نفس وشیطان کی طرف سے طرح طرح کی بدخیالیوں میں مبتلا ہونا۔

۳۔۔۔**مَرَّ عَلَيَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ**: حضرت عثمان جس محویت کے عالم میں تھے، جب اس سے افاقہ ہوا، پوری صورت حال ان پر واضح ہوگئی، تب کہیں جا کر آپ کو پتہ چلا کہ حضرت عمر نے آپ کو سلام کیا تھا۔

۴۔۔۔**فَاشْتَكٰى عُمَرُ** : شکایت کی وجہ یا تو یہ تھی کہ سلام کا جواب دینا واجب تھا جسکی ادائیگی حضرت عثمان سے نہ ہوسکی، یا یہ کہ وہ حضرت عثمان کی دعاؤں کی برکت سے محروم ہوگئے، جو سلام کے جواب کی صورت میں انھیں حاصل ہوتیں۔

۵۔۔۔**قُلْتُ مَافَعَلْتُ** ۔۔۔ای ما ترکت رد السلام علیه : یعنی میں نے سلام کا جواب ترک نہیں کیا۔ترک فعل کی تعبیر فعل سے کرنے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔چونکہ جو کچھ ہوا وہ ان کے اختیار سے نہیں ہوا، لہٰذا یہ ان افعال میں سے نہیں، جو اختیار سے صادر ہوتے ہیں اور جن پر مواخذہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ترک فعل بھی تو فعل ہی ہے۔

۶۔۔۔**صَدَقَ عُثْمَانُ**: اسکی دو توجیہہ کی جاسکتی ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔عثمان نے سچ کہا کہ انھیں حضرت عمر کے سلام کی خبر نہ ہوئی۔

﴿۲﴾۔۔۔اے عثمان عمر نے سچ کہا کہ انھوں نے آپ کو سلام پیش کیا تھا۔

۷۔۔۔**قَدْشَغَلَكَ**: یعنی رسول کریم کے وصال پر ملال سے پیدا ہونے والے امر عظیم

نے آپ کو اپنی طرف سے مشغول رکھا، جسکی وجہ سے آپ کسی اور طرف توجہ نہ دے سکے۔
۸۔۔۔۔**مَانَجَاۃِ ھٰذَاالْاَمْرِ** : اس امر کے تعلق سے اصح ارجح اور صواب تر، بات یہ ہے کہ اس سے مراد حدیث نفس اور شیطانی وسوسوں سے نجات ہے، جیسا کہ محمد بن جبیر کی روایت میں اسکی وضاحت یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے حضرت عثمان سے دریافت کیا، کہ آپ نے حضرت عمر کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا، آخر کس خیال میں محو تھے کہ انکا سلام تک نہ سن سکے۔ اسکے جواب میں، حضرت عثمان نے جو بات پیش کی اسکا حاصل وخلاصہ یہ ہے، کہ میرے دل میں شیطانی وسوسہ کے نتیجے میں ایسے خیالات آگئے تھے، جن کو میں اپنی زبان سے ادا کرنا بھی پسند نہیں کرتا اگر چہ پورے روئے زمین کی دولت مجھے حاصل ہو جائے۔

اور جب شیطان نے ان خیالات کا القاء کیا، تو میں اس فکر اور سوچ میں گم ہو گیا اور اپنے دل میں شیطان کے خلاف باتیں کرنے لگا جس نے دل میں وسوسے ڈالے، اور سوچنے لگا کہ کاش میں نے سرکار سے پوچھ لیا ہوتا کہ حضور ان وسوسوں سے جو شیطان دل میں ڈالتا ہے، اس سے نجات کی کیا صورت ہے۔ جس روایت کا یہ ایک ٹکڑا ہے۔ اس پوری روایت کو ابویعلی نے اپنی مسند میں، امام بوصیری نے 'زوائدالعشرہ' میں اور علامہ سیوطی نے 'جمع الجوامع' میں نقل فرمایا ہے۔ امام بوصیری نے اسکی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

۹۔۔۔۔شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث شریف میں وسوسہ سے مراد (جس میں عنقریب لوگوں کے مبتلا ہو جانے کا اندیشہ تھا) یہ ہے:

'آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا، اب دین ختم ہو جائے گا۔
دین کے انوار کافور ہو جائیں گے۔ ہدایت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا'۔

۱۰۔۔۔۔**اَنْتَ اَحَقُّ بِھَا**: یعنی اے صدیق اکبر آپ ہر کارِ خیر میں سبقت فرمانے والے ہیں، علم کے حریص ہیں۔ حضور ﷺ سے کمالِ قرب والے ہیں۔۔۔۔نیز۔۔۔۔آپ محرم اسرار ہیں، تو اس نجات وخصلت اور اس کے تعلق سے سوال کرنے کے آپ سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

۱۔۔۔حَزَنُوا عَلَیْہِ: یعنی آپکے وصال شریف، آپکے جمال جہاں آرا کے پوشیدہ ہو جانے اور آپ کی بارگاہ کی حضوری سے محروم ہو جانے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔جو ظاہری و باطنی علوم و معارف آپ سے حاصل ہوتے تھے، ان کے اب نہ مل سکنے پر غمگین و پژمردہ ہو گئے۔

۲۔۔۔۔بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ: انقضائے دین اور انطفاء نور شریعت کا وسوسہ نفوس کاملہ کیلئے نہایت مہلک ہے، جس سے ان کے حالات میں تغیر، کلام میں بے ربطی اور معاملات میں حیرانی، یہاں تک کہ عقل میں خلل بھی واقع ہوسکتا ہے۔۔۔۔ہوا بھی ایسا کہ سرکار کے وصال پر ملال کی خبر سنکر بعض صحابہ ساکت و صامت ہو کر جہاں تھے وہیں بیٹھ گئے، جیسے کہ ان میں حرکت کی طاقت ہی نہ رہی اور بعض کی دماغی حالت ایسا کنٹرول سے باہر ہوگئی، کہ آپکی وفات کا انکار ہی کر دیا۔بعض تو اتنا آگے بڑھ گئے کہ تلوار لیکر نکل پڑے کہ اگر کوئی کہے گا کہ حضور کو موت آگئی، تو اسکی گردن اڑا دونگا ۔۔۔۔ایسی ہنگامی حالت میں رب کریم نے صدیق اکبر کی فضیلت ظاہر فرما دی اور انہیں اپنے صدق و یقین پر ایسا ثابت قدم رکھا جو اپنی مثال آپ ہے۔

۔۔۔۔اور۔۔۔۔پھر صدیق اکبر کے کلام بلاغت نظام نے وہ کام کیا کہ نکلی ہوئی تلوار نیام میں چلی گئی۔لوگوں کے ہوش و حواس صحیح ہو گئے۔اس موقع پر صدیق اکبر نے قرآنِ کریم کی جن آیاتِ کریمہ کی تلاوت فرمائی، کتنوں کو تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان آیات کا نزول آج ہی ہو رہا ہے۔اس سے پہلے انھوں نے اسے سنا ہی نہیں۔

۳۔۔۔قَالَ اَبُوْبَکْرٍ قَدْ سَئَلْتُہٗ عَنْ ذٰلِکَ۔۔۔ای واجابنی: یعنی میں نے اس کے تعلق سے آپ ﷺ سے سوال کیا اور آپ نے اسکا جواب بھی عطا فرما دیا۔

۴۔۔۔فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبِلَ مِنِّی: یعنی خوشی و رغبت اور جذبہ اطاعت کے ساتھ (جس میں نہ کسی طرح کا نفاق ہو نہ شک و ریب) اگر کوئی میرے اس کلمہ کو دل سے قبول کرلے، جو میں نے اپنے چچا کو پیش کیا تھا، تو انھوں نے اسے قبول نہیں کیا

۔۔۔۔الحضر۔۔۔۔یہی کلمہ وہ ہے جونجات کیلئے کافی ہے، جسے کلمہءشہادت اور کلمہءطیبہ کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

۵۔۔۔۔نَجَاۃٌ: پس یہ اس قبول کرنے والے کیلئے نجات ورہائی ہے۔اسلئے کہ یہ ایسی ہدایت ہے جوعنایت ربانی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔خواہ ابتداء ہی میں حاصل ہوجائے یا آخری وقت میں، خاص کرکے جب وہ حسن رعایت کے ساتھ ہو۔۔۔۔اور اسکی ادائیگی کا جیسا حق ہے، ویسا ہی ادا کیا جائے۔سرکار کے ارشاد کا حاصل یہ ہوا: 'میں نے اس کلمہ کو اپنے چچا کو پیش کیا، جو حالت کفر میں ستر سال گزار چکے تھے۔اگر اس کو ایک بار کہہ دیتے، تو انکا قول واقرار اللہ کے نزدیک عذاب سے انکی نجات و رہائی کیلئے حجت ہوجاتا'۔پھر اس مومن و مسلم کی کیا شان ہوگی جسکے بدن کے گوش و پوست، رگوں کے خون میں اس کلمہ کے اثرات وبرکات شامل ہیں،تو وہ اگر اس کلمے کو دل کی سچائی کے ساتھ ادا کرے گا، تو اس کو عذاب الٰہی سے نجات ورہائی کی عزت وکرامت سے کیوں نہیں سرفراز کیا جائے گا۔

۶۔۔۔۔عَرَضْتُ عَلٰی عَمِّیْ فَرَدَّھَا: ضیاءالقرآن،جلدسوم،صفحہ ۵۰۰ میں زیر آیت: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ بحوالہء سیرت ابن ھشام مذکور ہے۔

'حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بات بھی مروی ہے کہ آخری وقت میں حضرت ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔حضرت عباس نے کان لگا کر سنا،حضور نے جب پوچھا،کیا کہہ رہے تھے،تو آپ نے جواباً عرض کیا وہی کہہ رہے تھے جسکا آپ نے ان سے مطالبہ فرمایا'

۔۔۔۔اسکے بعد حضرت ضیاءالملت قدس سرہٗ رقم طراز ہیں:

'لیکن اگر کسی کے نزدیک دوسری روایتیں اس روایت سے زیادہ قابل اعتبار ہوں، تب بھی اسے آپکے حق میں کوئی ناشائستہ بات کہنے سے احتراز کرنا چاہئے۔آپکی بے نظیر خدمات کا یہ معاوضہ ہماری طرف سے نہیں دیا جانا چاہئے، کہ ہم ممبروں پر کھڑے ہوکر اپنا سارازورِ بیان انکو کافر ثابت کرنے اور انکو کافر کہنے اور کہتے چلے جانے پر ہی صرف کرتے رہیں۔اس سے بڑھ کر ناشکری اور احسان فراموشی کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی'۔

۔۔۔۔چنانچہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

مَسْئَلَةُ اِسْلَامِهٖ خَلَافِيَّةٌ۔۔۔ثُمَّ اِنَّهٗ عَلَى الْقَوْلِ بِعَدَمِ اِسْلَامِهٖ لَا يَنْبَغِيْ سَبَّهٗ وَ التَّكَلُّمُ فِيْهِ بِفُضُوْلِ الْكَلَامِ فَاِنَّ ذٰلِكَ يَتَاَذّٰى بِهِ الْعَلَوِيُّوْنَ بَلْ لَا يَبْعُدُ اَنْ يَكُوْنَ مِمَّا يَتَاَذّٰى بِهِ النَّبِيُّ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ الَّذِيْ نَطَقَتِ الْآيَةُ بِنَاءً عَلٰى هٰذِهِ الرِّوَايَاتِ

بحبّہ ایّاہ والاحتیاط لا یخفی علی ذی فھمٍ۔۔۔ ع۔

لِاَجلِ عَینٍ اَلفِ عَینٍ تکرُّمٍ

حضرت ابوطالب کے ایمان کا مسئلہ اختلافی مسئلہ ہے، اور جولوگ آپ کے ایمان کے قائل نہیں، انھیں بھی یہ مناسب نہیں، کہ اپنی زبان پر کوئی ناروا جملہ لے آئیں، کیونکہ اس سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد کو اذیت پہنچتی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ حضور ﷺ کا دل مبارک بھی رنجیدہ ہوتا ہو۔ ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ ایسے نازک مقامات پر احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

﴿ضیاء القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۰۰﴾

علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ والرضوان نے اس حقیقت کو واضح فرمادیا کہ حضرت ابوطالب کے کفر وایمان کا مسئلہ علمائے ملت اسلامیہ کے درمیان اختلافی ہے۔ اس تعلق سے علماء کرام کے تین گروہ ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔وہ علماءِ کرام جو حضرت ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں۔

﴿۲﴾۔۔۔وہ علماءِ کرام جو آپ کے کفر کے قائل ہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔ وہ علمائے کرام جو اس تعلق سے کسی طرح کا فیصلہ کرنے سے خاموش ہیں اور اس سلسلہ میں سکوت کو بہتر خیال فرماتے ہیں۔

۔۔۔علمائے اہلسنّت کے درمیان مسئلہ زیر بحث میں اس واضح اختلاف نے اس بات کو بھی ظاہر کردیا کہ اگر کوئی مسلمان مذکورہ بالا علماء کرام میں سے اپنے معتمد علماء کرام پر بھروسہ واعتماد کرتے ہوئے انکا مسلک اختیار کرتا ہے، تو اسکی تکفیر وتضلیل تو بڑی بات، تفسیق وتجہیل بھی نہیں کی جاسکتی اور 'للناس فیما یعشقون مذاھب' کہہ کر بحث وتکرار کے راستے کو مسدود کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ ہر صاحب مسلک عالم ربانی اپنے دعویٰ کی دلیل رکھتا ہے، اور وہ اپنی دلیل کی صحت سے مطمئن بھی ہے۔ اپنے اپنے دلائل کی روشنی میں جس نے جو حق سمجھا، اس کو ظاہر کردیا، جس عالم نے دونوں طرف کے دلائل کو ہم پلہ وہم وزن محسوس کیا اس نے کسی طرح کا فیصلہ نہ کرنے میں بھلائی دیکھی، اور مسلک اعتدال کو اپناتے ہوئے محتاط روش اختیار فرمائی اور خاموش رہا۔ توقف فرمانے والوں میں بھی جید علماءِ عارفین ہیں۔۔۔۔

حضرت ضیاء الملت علیہ الرحمۃ نے حضرت علامہ آلوسی قدس سرہٗ کی اتباع کرتے ہوئے حضرت ابوطالب کے 'عدم اسلام' کے قائلین کو جو زریں مشورہ دیا ہے اور ادب کی جو راہ دکھائی ہے، یقیناً وہ اربابِ سعادت کیلئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ میرے خیال میں کسی عاشقِ بارگاہِ رسالتمآب کو اسکو دل سے قبول کر لینے میں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اس تحفہ کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس سے کسی صاحب

مسلک کو اس کے مسلک سے نہیں ہٹایا جا رہا ہے بلکہ بقصد ادب و احترام بارگاہِ نبوی، ایک ایسے غیر ضروری عمل و کردار سے اپنے کو بچانے کی صلاح دی جا رہی ہے، جس سے سادات علویہ تو سادات علویہ خود نبی کریم کو اذیت پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

از خدا خواهیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب
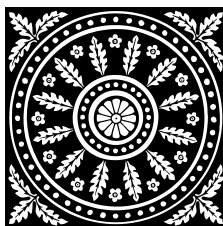
حدیث ۳٦

عَنِ الْمِقْدَادِ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبْرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَّذُلِّ ذَلِيْلٍ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِّنْ اَهْلِهَا اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا قُلْتُ فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ﴿رَوَاهُ اَحْمَدُ﴾

حضرت مقداد سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور کو فرماتے ہوئے سنا، کہ روئے زمین پر کوئی ادنیٰ خیمہ اور کچا گھر نہ رہے گا، مگر اللہ اس میں اسلام کا کلمہ پہنچادے گا۔ عزت والوں کی عزت اور ذلت والوں کی ذلت کے ساتھ یا تو اللہ انھیں عزت دے گا کہ انھیں کلمہ والا بنادے گا یا انھیں ذلیل کردے گا، پس وہ دین کی اطاعت کریں گے۔ میں نے (دل میں) کہا، پھر تو سارا دین اللہ ہی کا ہوگا۔ ﴿احمد﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔۔**عَنِ الْمِقْدَادِ**: آپ اصحاب رسول کے فضلاء ونجباء میں سے تھے۔۔۔نیز۔۔۔ قدیم الاسلام تھے۔حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے آپ سے روایت کی ہے۔آپ کو مقداد بن الاسود کہا جاتا ہے۔اسود کی طرف نسبت اسلئے ہے کہ آپ اس کے حلیف یا ربیب تھے، دراصل آپ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ کندی ہیں۔

۲۔۔۔۔**مَدَرٍ**: (بفتح میم ودال) مٹی کا ڈھیلا۔۔۔**وَبَرٍ** (بفتح داو وبائے موحدہ) اونٹ اور خرگوش کے بال۔حدیث شریف میں بیت مدر سے مراد شہر وقریہ ہے اور بیت وبر سے صحراء وبادیہ ہے، جہاں خیمے والے لوگ رہتے ہیں جیسا کہ عرب کے بادیہ نشینوں کی عادت ہے۔حاصل ارشاد یہ ہے کہ کوئی گھر نہ ہوگا، کیا شہر، کیا دیہات، کیا صحراء، کیا بادیہ۔

۳۔۔۔۔**(اِلَّا اَدْخَلَهٗ) اَیْ اَدْخَلَ اللّٰهُ**۔ پہلے ہی سے معلوم ہونے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔ سیاق کلام کی دلالت کے سبب رسم جلالت کی یہاں پر تصریح نہیں کی۔بعض نسخوں میں 'ادخله الله' ہے،یعنی رسم جلالت کا صریحاً ذکر ہے۔

۴۔۔۔۔**بِعِزِّ عَزِیْزٍ**: ای مُلْتَبِسَةً بِعِزِّ شَخْصٍ یُعِزُّہُ اللّٰهُ بِهَا یعنی یہ کلمہ ملتبس ہوگا۔اس شخص کی عزت کے ساتھ اسے اللہ عزت عطا فرمائے۔۔۔۔بایں طور۔۔۔۔کہ وہ اس کلمہ پر دل کی سچائی کے ساتھ ایمان لے آئے۔۔۔۔نیز۔۔۔۔یہی کلمہ ملا ہوگا اس شخص کی رسوائی کے ساتھ، جسے اللہ رسوا فرما دے، اور وہ ایمان نہ لائے۔

۵۔۔۔۔**یُعِزُّهُمُ اللّٰهُ**: یہ تفصیل اور وضاحت ہے اس بات کی کہ عزت کے ساتھ یا ذلت کے ساتھ دخول کلمہ کی صورت کیا ہے؟۔۔۔۔عزت کے ساتھ دخول یہ ہے کہ جہاں یہ کلمہ داخل ہو وہ اس کلمہ والے ہو جائیں۔۔۔۔اور ذلت کے ساتھ دخول کی صورت یہ ہے کہ وہ اس کلمے پر ایمان نہ لائے، بلکہ اس کا مطیع وفرمانبردار ہوکر جزیہ دینے کی رسوائی قبول کرلے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔یہ کلمہ ہر ہر گھر میں داخل ہوگا اور دین سب کا سب اللہ کیلئے ہو جائے گا۔۔۔۔نیز۔۔۔۔یہ دین ہر دین پر غالب

ہوکر رہے گا۔اب خواہ کوئی اسے بخوشی اختیار کرے، یا بے دلی کے ساتھ اسکی اطاعت پر مجبور ہو۔

۱۔۔۔اَلْمِقْدَادُ: ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ غلام تھے اوراسود نے آپکو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا، آپ چھٹویں مسلمان ہیں۔حضرت علی کے سوا طارق ابن شہاب اور دوسرے لوگوں نے بھی آپ سے روایت کی۔مدینہ سے تین میل دور مقام جرف میں آپ کا وصال ہوا۔لوگ اپنے کاندھے پر لائے اور بقیع میں دفن کیا۔۳۳ھ میں آپ کا وصال ہوا۔اس وقت آپ کی عمر شریف ۹۰ سال کی تھی۔

۲۔۔۔عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ: ای علی وجه الارض من جزیرة العرب وماقرب منه ۔یعنی جزیرۃ العرب اوراسکے قرب وجوار کی ساری زمینوں پر۔۔۔لہٰذا اگر چین کے پیچھے ایک ایسی قوم ہو، جہاں کلمہ اسلام نہیں پہنچا، تواس سے حدیث کے مقصود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔۔۔ہوسکتا ہے کہ پوری روئے زمین ہی مراد ہو، مگر اسکا ظہور حضرت عیسیٰ کے نزول کے عہد میں ہوگا جبکہ روئے زمین پر کفر کی کوئی جگہ نہ ہوگی، ساری مخلوق یا تو برضا ورغبت مسلمان ہوجائے گی۔۔۔یا۔۔۔بہ جبر واکراہ اطاعت شعار رہے گی۔پس دین، کُل کا کُل، اللہ کیلئے ہوجائے گا۔

۳۔۔۔وَذِلِّ ذَلِيْلٍ: یہ حربی اور ذمی دونوں کو شامل ہے اسلئے کہ منکر ہونے کی صورت میں انہیں قید وقتل کی رسوائی اپنانی پڑے گی، یہاں تک کہ طوعاً یا کرہاً سر اطاعت خم کردیں اور جزیہ دینے کی ذلت قبول کرلیں، یہ حدیث اس ارشاد ربانی کا خلاصہ ہے:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿سورۃ الصف:۹﴾

۴۔۔۔مِنْ اَهْلِهَا: یعنی مرنے تک اس کلمے پر ثابت قدم رکھے گا۔

۵۔۔۔یُذِلُّهُمْ: دوسری قوم جو اس کلمے کی طرف ملتفت نہ ہوگی اوراسے قبول نہ کرے گی، تو گویا اس نے اس کلمے کی تذلیل کی، تواب اس کا برابری بدلہ یہ ہے کہ انہیں ذلیل کردیا جائے۔

۶۔۔۔فَیَدِیْنُوْنَ لَهَا: ای یطیعون وینقادون لها۔ حربی اگر تلوار کے خوف سے بادل

ناخواستہ اطاعت کرے جب بھی صحیح ہے۔ یہ اس ارشاد ربانی کی طرف اشارہ ہے:

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾ ﴿سورۃ التوبۃ: ۲۹﴾

یہاں تک کہ دیں جزیہ اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر

۷۔۔۔۔**قُلْتُ**: یا تو حضرت مقداد نے دل میں سوچا۔۔۔۔یا۔۔۔۔حضور کی غیر حاضری میں روایت کے وقت پر۔۔۔۔جبھی تو اس مقام پر حضور کی طرف سے کسی جواب کا ذکر نہیں۔

۸۔۔۔۔واخرجہ ایضاً الحاکم وسفرہ حسن والعرانی فی اکبیر وابیس۔
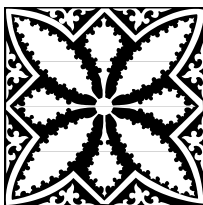
عَـنْ وَهْبِ ابْنِ مُنَبِّهٍ قِيْلَ لَهٗ اَلَيْسَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَـالَ بَـلٰـے وَلٰكِنْ لَّيْسَ مِفْتَاحٌ اِلَّا وَلَهٗ اَسْنَانٌ فَاِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَّهٗ اَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ وَاِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ.

﴿رَوَاهُ الْبُخَارِىُّ فِىْ تَرْجُمَةِ بَابٍ﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت وہب سے روایت ہے کہ ان سے عرض کیا گیا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، جنت کی چابی نہیں، فرمایا کیوں نہیں۔ لیکن کوئی چابی، دندانہ بغیر نہیں ہوتی، تو اگر تم دندانہ والی چابی لیکر آؤ گے، تو تمہارے لئے دروازہ کھلے گا ورنہ نہیں کھلے گا۔

﴿بخاری فی ترجمہ باب﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔۔وَهْبِ ابْنِ مُنَبِّهٍ : (بضم میم وفتح نون وتشدید موحدہ مکسورہ): آپ کی قیام گاہ یمن کے علاقے صنعاء میں تھی۔آپ ثقہ تابعی ہیں، یمن کے قاضی تھے۔۱۱۴ھ میں وصال ہوا۔

۲۔۔۔۔حضرت وہب نے ایک بار جب لوگوں کو عمل کی ترغیب دی اور ترک عمل سے ڈرایا ۔۔۔۔نیز۔۔۔ان دونوں باتوں پر کافی زور دیا، تو اس وقت کسی نے یہ سوال کرلیا۔

۳۔۔۔۔اَلَیْسَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔۔۔الخ: سائل کا منشاء کلام یہ تھا، کہ جب جنت کے دروازوں کی کنجی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ہے تو دروازۂ بہشت کھولنے کیلئے یہی کلمہ کافی ہے، پھر عمل کی کیا شرط، ہو یا نہ ہو۔

۴۔۔۔۔لَهٗ اَسْنَانٌ : دندانہ سے کنایۃً اعمال صالحہ اور ارکانِ اسلام مراد لیا ہے۔اس میں عمل صالحہ کی ترغیب ہے اور اس کیلئے ابھارنا ہے۔اگرچہ عمل ایمان کی اصل حقیقت کا جزء نہیں، لیکن سابقین کے ساتھ دخول جنت اور درجات عالیہ اور مراتب رفیعہ کا حصول اعمالِ صالحہ کے بغیر نہیں ہوسکتا، اگرچہ یہ بات ممکن ہے کہ عفوو مغفرت کے سبب جہنم کے دخول یا خلود سے اصل جنت حاصل ہوجائے۔

۵۔۔۔۔فِیْ تَرْجُمَةِ بَابٍ : علی جهة التعليق ۔تعلیقاتِ بخاری کُل کی کُل متصل وصحیح ہیں، خاص کرکے جب صیغۂ تمریض کے بغیر ذکر کی گئی ہوں، جیسا کہ اصول حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

فوائد

۱۔۔۔۔ وَهْبِ: آپکی کنیت ابوعبداللہ ہے، فارس آپکا وطن تھا۔آپکی حضرت جابر اور حضرت عبداللہ ابن عباس سے ملاقات اور سماعت ثابت ہے۔

۲۔۔۔۔اَلَیْسَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ : اَیِ الْمَقَرُوْنَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ سوال کا حاصل

یہ ہے کہ کیا کلمہ طیبہ،جس میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ دونوں ہیں، جنت کی کنجی نہیں؟ ممکن ہے کہ سوال کرنے والا فرقہ مرجیہ سے تعلق رکھتا ہو، جنکے نزدیک عمل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اسلام لاکر بدترین گناہ بھی برا نہ جانتے تھے۔

۳۔۔۔قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ : یعنی یہ صحیح ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جنت کی کنجی ہے جیسا کہ حدیث سابق میں گزرا، مگر اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ محض اس کلمے کے تلفظ ہی سے جنت کا دروازہ کھل جائے گا اور سابقین کے ساتھ جنت میں دخول میسر آجائے گا، خواہ عمل کرے یا نہ کرے اسلئے کہ اگرچہ کلمہ مفتاح ہے، مگر اسکے لئے نفع بخش نہیں، اسلئے کہ کوئی کنجی خواہ لکڑی کی ہو یا لوہے کی، اکثر ۔۔۔یا۔۔۔عادتاً اس میں دندانہ ضرور ہوتے ہیں اور یہ دندانہ والی کنجی ہی دروازہ کھولنے والی ہے۔

۴۔۔۔طیبی نے کہا کہ اسناں سے مراد ارکانِ اربعہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہے اور ایک قول کے مطابق اس سے مطلقاً اعمالِ صالحہ مراد لئے گئے ہیں، بشرطیکہ انکے ساتھ برے اعمال کا ترک بھی ہو۔

۵۔۔۔فُتِحَ لَکَ : ای اولاً۔ لَمْ یُفْتَحْ لَکَ : ای ابتداءً۔ اس تاویل سے مذہب اہلسنّت وجماعت کے مطابق بات ہوجاتی ہے۔ یہ بات پوشیدہ نہیں، ظاہر تشبیہ لم یفتح لك کے ساتھ ابتداءً اور اولاً کی قید کی متحمل نہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہاں مراد دندانے سے تصدیق قلبی ہے، جس میں کسی شک وریب کی گنجائش نہ ہو۔۔۔نیز۔۔۔اقرار باللسان ہے جس پر نفاق کا اثر نہ ہو اور احکام اسلام کیلئے انقیاد ہے، جس میں جبر وشقاوت کا شائبہ نہ ہو، پس کلمہ اس وقت ان اوصافِ مشتبہ باللسان کے ساتھ فتاح علیم کے اذن کے مطابق اولاً۔۔۔یا۔۔۔آخراً، جنت کی کنجی ہوتا ہے۔

۶۔۔۔رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَرْجُمَۃِ بَابٍ :(بفتح الجیم) امام بخاری کی عادت ہے کہ کبھی کبھی باب کے بعد ایک حدیث معلق بغیر اسناد کے ذکر کردیتے ہیں، جس میں بیان ہوتا ہے اس کا جس پر احادیث باب مشتمل ہوں اور باب کی وضاحت اسی کی طرف کردیتے ہیں۔ امام بخاری کی تعلیقات کی صحت میں اختلاف ہے۔۔۔اصح یہ ہے کہ جس کو امام موصوف صیغہ تمریض (۔۔۔مثلاً: روی ذکر اور قیل) سے بیان کریں وہ ضعیف ہے اور اسکے سوا صحیح ہے۔

۷۔۔۔رواہ البخاری فی اول باب الجنائز تعلیقًا و وصلہ فی تاریخہ الکبیر و فی سنن سعید بن متصور بسند حسن عن وھب بن منبہ نحوہ۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُ کُمْ اِسْلَامَهٗ فَکُلُّ حَسَنَةٍ یَّعْمَلُهَا تُکْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَّ وَکُلُّ سَیِّئَةٍ یَّعْمَلُهَا تُکْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِیَ اللّٰهَ. ﴿مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ﴾

ترجمۂ حدیث

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، جب تم میں سے کوئی اپنا اسلام ٹھیک کرلے، تو جو نیکی بھی کرے گا وہ دس گنا لکھی جائے گی، سات سو گنا تک اور جو برائی کرے گا تو ایک برائی کے عوض میں ایک ہی گناہ لکھا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے ملے۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔اِذَ اَحۡسَنَ۔۔۔الخ : ای اخلصه احسان، اساءت کی ضد ہے۔یعنی جوصدق واخلاص کے ساتھ ایمان لایااور اسلام قبول کیا۔

۲۔۔۔قاموس میں ہے الضعف با لکسر مثل الشی وضعفاه مثلاه۔ ضعف کا معنی مثل ہے۔دوضعف کا معنی دومثل ہوا۔ضعف کا معنی دوچند۔۔۔یا۔۔۔دوچند سے زیادہ (جو غیر محصور ہے) بھی ہوتا ہے پس انکا قول لك ضعفه کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے دوچند۔۔۔یا۔۔۔سہ چند۔۔۔یا۔۔۔اس سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔۔۔بِعَشۡرِ اَمۡثَالِهَا۔۔۔الخ: صدق واخلاص کا جودرجہ ہوگا، نیکیوں کا وہی تناسب ہوگا۔

۴۔۔۔لَقِيَ اللّٰهَ: یہ موت سے کنایہ ہے۔۔۔الحاصل۔۔۔تاحیات نیکی اور بدی کے تعلق سے یہی قانون الٰہی جاری رہے گا۔

۱۔۔۔اِذَا اَحۡسَنَ۔۔۔الخ: ارشادربانی ہے:

مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ ﴿سورۃ النساء:۱۲۵﴾

جس نے جھکادیا اپنے کو اللہ کیلئے اور وہ مخلص ہے

۔۔۔۔حدیث وآیت میں احسان کا ایک ہی مفہوم ہے۔جسکی اوپر وضاحت ہوچکی۔

۲۔۔۔تُكۡتَبُ لَهٗ: ایک نسخے میں صرف تکتب ہے مگر مراد یہی ہے۔

۳۔۔۔بِعَشۡرِ اَمۡثَالِهَا : یعنی کم ازکم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا۔جیسا

موقع ویسا ثواب، جیسا اخلاص ویسا اجر۔۔۔۔ یہ عام جگہوں کی نیکیوں اور بدیوں کا ذکر ہے، ورنہ حرم مدینہ طیبہ کی ایک نیکی کا ثواب پچاس ہزار اور مکہ مکرمہ کی ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے۔۔۔۔ یونہی ۔۔۔حرم مکہ معظّمہ میں ایک گناہ ایک لاکھ کے برابر، اور گناہ ایجاد کرنے والے پر تمام گناہگاروں کا عذاب۔ ایک نیکی کے بدلے دس گنا یا اس سے زیادہ دینا صرف فضل خداوندی ہے۔

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴿سورۃ البقرہ:۲۶۱﴾

اور اللہ بڑھائے جسکے لئے چاہے

۴۔۔۔تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا: جسطرح احوال واشخاص واعمال کے اعتبار سے نیکیوں کے درجات ہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔ سیئات بھی زبان ومکان اور اشخاص انسان ومراتب عصیان کے اختلاف سے مختلف کیفیت رکھتی ہیں، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ ایک برائی کا بدلہ ایک ہی گناہ قرار دیتا ہے، بیشک:

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿سورۃ ال عمران:۳۰﴾

اور اللہ بے حد رحمت والا ہے اپنے بندوں کیلئے

۵۔۔۔حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهُ: یہاں تک کہ وہ اللہ سے ملاقات کرے قیامت کے دن اور وہ اسے جزا دے یا معاف فرما دے۔ چونکہ اسکا وقوع متحقق ہے، اسلئے لفظ ماضی اختیار کیا۔

کقوله تعالٰی۔۔۔ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ۔۔۔ ﴿سورۃ النحل:۱﴾

آیا ہی رکھا ہے اللہ کا حکم

۶۔۔۔واخرجه ايضاً احمد والبيهقی۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَجُلًا سَئَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَ اسَرَّتُکَ حَسَنَتُکَ وَسَآءَ تُکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَاالْاِ ثُمُ قَالَ اِذَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ شَیْئٌ فَدَعَہٗ ﴿رَوَاہُ اَحْمَدُ﴾

حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے۔ فرمایا کہ جب تمہیں اپنی نیکی خوش کرے اور اپنی برائی غمگین کرے، تو تم مومن ہو۔ عرض کیا یارسول اللہ گناہ کیا ہے۔ جو چیز تمہارے دل میں چبھے اسے چھوڑ دو۔ ﴿احمد﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔مَا الْاِیْمَانُ: یعنی ایمان کی صحت اور صدق کی نشانی کیا ہے؟

۲۔۔۔اِذَا سَرَّتْكَ۔۔۔الخ: یعنی اللہ کی توفیق اور اعانت کے شکرانے میں۔۔۔نیز۔۔۔ رب تعالیٰ کی بارگاہ کے قرب کی امید میں، تم سے جو عمل صادر ہو، وہ تمہیں شاد وخوشحال کردے۔

۳۔۔۔وَسَآءَتْ۔۔۔الخ: یعنی خدا کی بارگاہ سے دوری وحجاب کی کراہت اور عذاب الٰہی کے خوف کے پیش نظر تجھ سے ہونے والی بدی تجھے رنجیدہ اور بدحال کردے۔

۴۔۔۔فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ: پس تو مومن صحیح الایمان ہو، کیونکہ یہ خدا کی ذات اور اس کے احکام پر یقین اور تصدیق پائے جانے کی علامت ہے۔۔۔نیز۔۔۔قیامت کے دن اور جزاء اعمال پر ایمان کی نشانی ہے۔ جملہ مواضع یقین میں سے (جن پر یقین رکھنا بندے کیلئے لازمی ہے) ایک یہ بھی ہے، کہ بندہ اس بات پر یقین کرلے، کہ ہر ہر عمل کی جزاء ہے خواہ اچھی ہو یا بری۔

۵۔۔۔شیخ امام عالم عارف عبدالوہاب المتقی المکی قدس اللہ روحہ واوصل الینا فتوحہ۔ اپنے رسالہ 'حبل المتین فی تقویة الیقین'، میں گوہرافشاں ہیں کہ حضور ﷺ نے جن جن باتوں کی خبر دی ہے، ان سب پر یقین واجب ہے اور وہ باوجود کثیر اور بے شمار ہونے کے انکا مرجع صرف چار چیزیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔توحید: یعنی وہ جان لے کہ خدا ایک ہے، جو تمام صفات کمال سے موصوف ہے اور جو کچھ عالم میں ہو رہا ہے۔۔۔مثلاً: نفع وضرر، خیر وشر، منع وعطا، یہ سب اسی کے حکم وتقدیر سے ہے۔ پس ضار ونفع اور معطی ومانع وہی ہے۔ اس عقیدہ کا فائدہ یہ ہوگا، کہ مومن نفع وضرر کے وجود وعدم وجود کے تعلق سے مخلوقات کی طرف متوجہ نہ ہوگا اور اس پر بھروسہ واعتماد نہ کرے گا۔

﴿۲﴾۔۔۔توکل واعتماد: یعنی خدائے عزوجل نے اپنے سارے بندوں کو رزق رسانی کی جو ضمانت لی ہے اس پر کامل بھروسہ ہو۔ اس عقیدہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ بندہ مومن نہ طلب کی ضرورت محسوس کرے گا اور نہ اسباب کے فقدان کے وقت تردد واضطراب کا شکار ہوگا۔

﴿۳﴾۔۔۔ثواب وعقاب کے ذریعہ جزائے اعمال پر یقین: اسکا فائدہ یہ ہوگا کہ بندہ مومن طاعات الٰہی کی طرف بڑھے گا اور گناہوں سے بھاگے گا۔

﴿۴﴾۔۔۔یقین کرنا اس بات پر کہ خدائے تعالیٰ اپنے بندے کے تمام احوال پر خواہ وہ ظاہر

ہوں یا پوشیدہ، ہر حال میں باخبر ہے۔اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔اسکا فائدہ یہ ہوگا کہ بندہ مومن اپنے ظاہر و باطن میں کوشش بلیغ کرتا رہے گا۔

۶۔۔۔۔شیخ عارف باللہ ابن عطاء اللہ اسکندری شاذلی 'کتاب الحکم' میں فرماتے ہیں کہ طاعت وعبادات چھوڑنے پر رنجیدہ خاطر نہ ہونا اور زلات و ناکردنی افعال پر نادم وشرمندہ نہ ہونا قلب کی موت ہے۔

۷۔۔۔۔کتاب الحکم کے قول مذکور کی شرح میں سیدی احمد بن زواق۔(لمعات کے ایک نسخے میں)فرماتے ہیں کہ حیات قلب کی دلیل تین چیزیں ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔تاثر بالعوارض:پس جو قلب اچھے کو اچھا اور برے کو برا سمجھے وہ زندہ ہے، ورنہ مردہ ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔تشوق بالقوام۔پس جو قلب اس چیز کا طالب ہے اور اسکی طرف شوق ظاہر کرتا ہے جس سے اسکا وجود قائم ہے یعنی تقویٰ، تو وہ زندہ ہے، ورنہ مردہ ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔تطعم الوقائع:پس جو قلب حسنات سے لذت حاصل کرے اور سیئات سے بے مزہ ہو جائے اور کھڑا ہو جائے، تو وہ صحتمند ہے، ورنہ مریض ہے۔اس طرح قلب کی تین قسمیں نکلتی ہیں:

﴿۱﴾۔۔قلب مشروح۔۔یہ فرمانبردار اور مومن کا قلب ہے۔

﴿۲﴾۔۔قلب مزبوح۔۔یہ کافر اور منافق کا قلب ہے۔

﴿۳﴾۔۔قلب مجروح۔۔یہ گنہگار مومن کا قلب ہے۔

۸۔۔۔۔**فَمَا الْاِثْمُ**:یعنی وہ علامت کونسی ہے، جس سے سمجھ لیا جائے کہ یہ جرم کا کام ہے۔

۹۔۔۔۔**اِذَا حَاكَ**۔۔۔الخ: یعنی جب تیری ذات میں کوئی چیز اسطرح جم جائے اور اثر انداز ہو کہ وہ خلش پیدا کردے اور تمہیں تردد میں ڈال دے، تیرے دل کو مضطرب اور بے قرار کردے، اور تیرے سینے کو انشراح نہ دے سکے، تو سمجھ لو کہ وہ جرم کا کام ہے۔لہٰذا اسے ترک کردو۔

۱۰۔۔۔۔**اِذَا حَاكَ فِی نَفْسِكَ**:میں نفس سے مراد وہ مقدس اور شریف ذات ہے، جو نور ایمان اور زیور تقویٰ سے آراستہ ہو۔یہی وہ نفس ہے جس میں گناہ سے نفرت اور کراہت پیدا ہوتی ہے اور جرم کی چیز پر خود اس کا ضمیر اسے آگاہ کردیتا ہے۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔ایسا پاک وصاف دل اگر کسی کام کرنے میں متردد ہوا اور خلجان قبول کرے، تو یہ علامت ہے کہ وہ کام کرنے کے لائق کام نہیں۔۔۔۔المختصر۔۔۔۔یہاں عام مومنوں کا دل مراد نہیں، جن میں بعض تو برائی کو اچھائی سمجھتے لیتے ہیں اور اچھے کو برا قرار دیتے ہیں، معصیت وکدورت کی ظلمت میں گھرے رہنے کے سبب۔

۱۱۔۔۔حدیث شریف میں 'استفت قلب' اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو۔ذہن نشین رہے کہ قلب کا فتویٰ اسی جگہ معتبر ہے جہاں دلائل شرعی (قرآن وحدیث واجماع کے نصوص) مفقود یا متعارض ہوں۔۔۔نیز۔۔۔اقوال علماء اس سلسلے میں تعارض وتخالف رکھتے ہوں۔ایسی جگہ ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کیلئے شرح صدر اور فتویٰ قلب معتبر ہے۔

۱۔۔۔**فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ** : یعنی مومن کامل طاعت اور معصیت میں امتیاز رکھتا ہے اور ان پر قیامت کے دن جزاء وسزا کا اعتقاد رکھتا ہے۔بہ خلاف کافر کے، جسکے نزدیک طاعت ومعصیت میں کوئی فرق نہیں اور محاسبہ آخرت کا کوئی تصور نہیں۔

۲۔۔۔**فَمَاالْاِثْمُ اَیْ مَاعَلَامَتُہٗ** : چونکہ علامت گناہ کی وضاحت میں کوئی نص صریح یا نقل صحیح نہیں تھی، تو اسکا معاملہ مشتبہ ہوگیا، جبھی سائل نے سوال کرلیا۔

۳۔۔۔**فَدَعَہٗ اَیْ اُتْرُکْہٗ**: یہ ارشاد سرکار کے اس فرمان کی طرف ہے:

دع ما یریبك الی مالا یریبك

جو بات تمہیں شک میں ڈال دے اور بے قرار کردے اسے چھوڑ دو

اور اسے اختیار کرو جو نہ تو شک میں ڈالے اور نہ مضطرب کرے۔

۴۔۔۔**فَدَعَہٗ**: اسکا ایک معنی یہ بھی لیا جاتا ہے کہ اسکو احتیاطاً چھوڑ دو، جبکہ احتیاط ترک میں ہو اور اگر اسکا کرنا اولیٰ ہو فاترك ضده تو اسکی ضد اور اسکے خلاف کو چھوڑ دے۔

۵۔۔۔ایک نسخے میں حاك کی جگہ جاء ك (بصیغۃ الماضی من المجیء) ہے۔

۶۔۔۔رجال احمد رجال الصحیح ماخلاالمطلب بن عبد اللّٰہ فانه ثقة ایضاً ولکنه مدلس ولم یسمع من ابی موسیٰ فهو منقطع وعند الطبرانی والکبیروالاوسط عن ابی امامة وفیه یحیٰی بن ابی کثیر وهومدلس وان کان من رجال الصحیح وذکرتدلیسه بالشك فالحدیث حسن وایضا اخرجه ابن حبان والبهقی والضیاء فی المحتارة والحاکم و قال فی السراج المنیر وهو حدیث صحیح و فی الباب عند ابی یعلی والبخاری عن عمروصحیح وعند احمد الطبرانی فی الکبیروالحاکم عن ابی موسی نحوه۔

عَنْ عَمْرِوبْنِ عَبَسَةَ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ مَّعَكَ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ قَالَ حُرٌّ وَّ عَبْدٌ قُلْتُ مَاالْاِسْلَامُ قَالَ طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ مَاالْاِيْمَانُ قَالَ الصَّبْرُوَ السَّمَاحَةُ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْاِسْلَامُ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ خُلُقٌ حَسَنٌ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ قَالَ طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ قُلْتُ اَىُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تَهْجُرَمَاكَرِهَ رَبُّكَ قَالَ فَقُلْتُ فَاَىُّ الْجِهَادِاَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَجَوَادُهٗ وَ اُهْرِيْقَ دَمُهٗ قَالَ قُلْتُ اَىُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ ﴿رَوَاهُ اَحْمَدُ﴾

حضرت عمرو بن عبسہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ حضور اسلام میں آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ فرمایا ایک غلام، ایک آزاد، میں نے عرض کیا اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات کرنا اور کھانا کھلانا۔ میں نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر اور سخاوت۔ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کونسا اسلام بہتر ہے؟ فرمایا جسکی زبان و ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں۔ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کونسا ایمان افضل ہے؟ فرمایا اچھے عادات۔ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کونسی نماز افضل ہے؟ فرمایا لمبا قیام۔ فرماتے ہیں میں نے پوچھا کونسی ہجرت بہتر ہے؟ فرمایا یہ کہ جو رب کو ناپسند ہو اسے چھوڑ دو۔ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا کونسا جہاد بہتر ہے؟ فرمایا جسکے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور اس کا خون بہا دیا جاوے۔ فرماتے ہیں میں نے پوچھا گھڑی کونسی بہتر ہے؟ فرمایا رات کا آخری درمیانی حصہ۔ ﴿احمد﴾

جواہر پارے

۱۔۔۔اِبْنِ عَبَسَةِ (بفتحات): آپ جلیل القدر صحابی ہیں۔تیسرے یا چوتھے مسلمان ہیں۔آپ کے بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے، اسلام لانے اور رخصت ہونے کا قصہ غرابت وجلالت سے خالی نہیں۔

۲۔۔۔اَتَيْتُ۔۔۔الخ: یہ آغاز اسلام کی بات ہے جبکہ حضور مکہ شریف میں تھے۔

۳۔۔۔مَنْ مَّعَكَ۔۔۔الخ: یعنی اس اسلام میں آپ کا موافق کون ہے۔

۴۔۔۔قَالَ حُرٌّ وَّ عَبْدٌ: حضور نے فرمایا اس امر میں میرے ساتھ ایک آزاد ہے اور ایک بندہ۔آزاد سے مراد حضرت ابوبکر ہیں اور بندہ سے حضرت بلال۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بندہ سے مراد زید بن حارثہ ہیں۔پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اسلئے کہ مسلم شریف کی ایک اور روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت بلال تھے۔۔۔۔ایک قول کے مطابق ارشاد کا حاصل یہ ہے، کہ میرے ساتھ ہر انسان ہے خواہ وہ آزاد ہو یا بندہ۔

اس صورت میں یہ خبر ہو جائے گی اسلام کے مستقبل کی، جبکہ وہ اتنا پھیل جائے گا کہ جزیرۃ العرب کا کوئی گھر نہ ہوگا جہاں اسکی جلوہ باریاں نہ ہوں، خواہ وہ بندے کا گھر ہو یا آزاد کا۔۔۔۔اب سائل کے سوال کا منشا یہ ہو جائیگا کہ آپ کے ساتھ امر اسلام میں کون کون موافقت کرے گا؟ اس کے جواب میں سرکار نے فرمایا ہر آدمی خواہ آزاد ہو یا بندہ۔

۵۔۔۔مَاالْاِسْلَامُ۔۔۔الخ: اسلام کے علامات وخصال کیا ہیں۔

۶۔۔۔طَيِّبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ: یعنی خوش کلامی ونرم گوئی اور لوگوں کو کھانا کھلانا۔غالبًا اس جواب سے صفات حمیدہ اور مکارم اخلاق کا ذکر مقصود ہو، اور پھر ان میں سے صرف دو صفتوں یعنی تواضع وسخاوت پر اکتفاء کرنا شائد اسلئے ہو کہ مخلوق الٰہی تک انہیں دو صفات کے اثرات پہنچتے ہیں۔۔۔۔یا۔۔۔۔اسلئے کہ سائل کے حال کے مناسب انہیں کا ذکر تھا۔۔۔۔اس تمام ارشاد کے ذریعہ مکارم اخلاق کیلئے برانگیختہ کرنا مقصود ہے اور واضح کر دینا ہے کہ مکارم اخلاق ہی اسلام

ہے۔اسی لئے سائل نے سوال کیا کہ کونسا اسلام افضل ہے،یعنی کونسا اخلاق افضل ہے،تو گویا وہ اسلام کے خصال کے بارے میں جاننا چاہتا ہے،تو حضور نے اشارہ کر دیا کہ وہ مکارم اخلاق ہیں۔

پھر سائل نے افضل اخلاق سے متعلق سوال کیا، جسکے بغیر اسلام نہ صحیح ہو نہ مکمل ہو۔جواباً حضور نے فرمادیا کہ وہ ایذاء خلق سے نفس کو روکنا ہے۔مکارم اخلاق سے آراستہ ہونا تحلیہ ہے اوراذیت خلق سے نفس کوروکنا تخلیہ ہے۔تزکیہ قلوب سے چونکہ تخلیہ مقصود ہوتا ہے اسلئے ذکر میں اسکومقدم رکھا۔

جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اسلام نام ہے نفس کو رذائل سے خالی کرنے کا اوراسے فضائل سے آراستہ کرنیکا۔جواب میں حضور نے یہ بھی ارشادفرمادیا کہ ایمان کی تمام خصلتوں کا حاصل وخلاصہ صبرو سماحت ہے۔صبر اور سماحت سے اشارہ ہے کہ ترک منہیات اور فعل مامورات کی طرف چنانچہ حضرت امام حسن بصری کا ارشاد ہے:

اَلصَّبْرُ عَنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَالسَّمَاحَةُ عَلٰى اَدَاءِ فَرَائِضِ اللّٰهِ

۔۔۔رہ گیا خلق حسن، تو یہ ایمان کے افضل خصال میں سے ہے، اسلئے یہ اصل اعمال بھی ہے اوراعمال میں سب سے زیادہ دشوارترین بھی۔۔۔۔نیز۔۔۔۔مخلوق کیلئے سب سے زیادہ نفع بخش بھی۔

۷۔۔۔۔مختلف احادیث میں جب اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو سرکار نے الگ الگ خصلتوں کا ذکر فرمایا۔ایسا لگتا ہے کہ حضور نے ہر سائل کو اسکی حالت کے پیش نظر جواب عطا فرمایا، جو خصلتیں اسکے حال کے زیادہ مناسب ملائم تھیں، انکا ذکر فرمادیا۔

۸۔۔۔۔**اَیُّ الصَّلٰوۃِ اَفْضَلُ** ۔۔۔الخ: یعنی نماز کے افعال وارکان میں سب سے بہتر رکن کونسا ہے۔

۹۔۔۔۔**طُوْلُ الْقُنُوْتِ** : قنوت کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے۔۔۔۔مثلاً: طاعت، خشوع، صلوٰۃ، دعا، قیام، سکوت۔یہاں مراد قیام ہے۔اس باب میں علماء کا اختلاف ہے کہ طول قیام افضل ہے یا درازئ سجود؟ بعض کے نزدیک طول قیام افضل ہے اور بعض کے نزدیک درازئ سجدہ اور بعض کا کہنا یہ ہے کہ شب کی نماز میں طول قیام افضل ہے اور دن میں درازئ سجدہ۔۔۔۔بعض کا کہنا یہ ہے کہ دونوں رکن فضیلت میں مساوی ہیں۔فضیلت قیام قرآن کریم کی قرأت کے سبب ہے اور فضیلت سجدہ تذلل وخشوع کی ہیئت کی وجہ سے۔حنفی مذہب میں قیام افضل ہے، اسلئے کہ اس میں مشقت بیشتر اور خدمت زیادہ تر ہے۔

۱۰۔۔۔۔**اَنْ تَهْجُرَ** ۔۔۔الخ: تیراان تمام چیزوں کو چھوڑ دینا جوتمہارے پروردگار کو پسند

نہ ہواور جس سے تمہارا رب راضی نہ ہو۔

۱۱۔۔۔قَالَ فَقُلْتُ فَاَیُّ الْجِهَادِ ۔۔۔الخ: راوی حدیث فرماتے ہیں کہ اسلام کے جملہ احکام وارکان سے متعلق سوال کر لینے کے بعداور انکا جواب سن لینے کے بعد میں نے جہاد کے بارے میں سوال کیا جو دین کے اعلیٰ وارفع ارکان میں سے ہے۔

۱۲۔۔۔مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَاُهْرِيْقَ دَمُهٗ : یعنی وہ جہاد افضل ہے جس میں سوار و سواری دونوں کام آجائیں۔ یہ بات اسی وقت ہوگی، جبکہ مجاہد نے جہاد میں کمال سعی واجتہاد اور زبردست مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا ہواور جذبہء شہادت لے کر آگے بڑھا ہواور پھر شہید ہوگیا ہو۔۔۔۔اسکے پیش نظر صرف ثواب آخرت رہا ہو، ایسے شخص کا جہاد یقیناً افضل جہاد ہے، جو خدا کی خوشنودی کیلئے قربان ہوگیا اور اپنے دامن کو غنیمت و مال دنیا سے ملوث نہیں ہونے دیا۔

۱۳۔۔۔اَیُّ السَّاعَاتِ۔۔۔الخ: جب نماز کے افضل رکن کو معلوم کر چکا، تو اس نے اسکے افضل وقت کی بھی تحقیق کرنی چاہی۔ غالبًا اسکے سوال کا مقصد یہ تھا کہ نماز شب کے قیام کیلئے بہتر ساعت کی وضاحت حاصل کر لی جائے۔ لہٰذا جب اس نے سوال کیا، کونسی ساعت اور کون سا وقت قیام کیلئے بہتر ہے، تو حضور نے جواب عطا فرمایا کہ: جوف اللیل الآخر رات کا وہ درمیانی حصہ جو جانب آخر میں ہے۔ رات کا جوف آخر سے رات کا چوتھا پہر یا پانچواں پہر مراد ہے۔ چھٹاں پہر بھی مراد ہوسکتا ہے۔ رات کا آخری چھٹا حصہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

۱۴۔۔۔مذکورہ بالا تشریحات نے واضح کر دیا کہ سائل کا سوال ایمان واسلام کی حقیقت سے متعلق نہ تھا، بلکہ انکی افضل ترین خصلتوں اور شاخوں سے متعلق تھا۔۔۔۔اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ سرکار نے جو جواب دیا، سائل کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اسکے مناسب عطا فرمایا ہے۔

تشریحِ لغات

-- آ --

آثار: (اثر کی جمع)۔۔سنت۔۔رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ۔۔صحابہء کرام کے اقوال وافعال۔

آمیزش: ملاوٹ۔

-- ا --

اباحت: شرع میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر پابندی نہ ہونا۔

ابلاغ: پہنچانا۔۔بھیجنا۔۔تبلیغ۔۔اشاعت۔

ابنیت: بیٹا ہونا۔۔فرزندی۔۔بیٹا ہونے کی حیثیت۔

اتباع واذناب: پیروی کرنے والے و پیچھے آنے والے۔

اتہام: تہمت۔۔بہتان۔۔شک وشبہ۔

اجتناب: پہلو بچانا۔۔پرہیز کرنا۔۔بچاؤ۔۔کنارہ کشی۔

اجماع: (فقہ) مسلمان مجتہدین کا کسی امر شرعی پر متفق ہونا۔

احترازی: احتراز سے متعلق۔۔پرہیز۔۔کنارہ کشی۔۔علیحدگی۔

احتمالات: (احتمال کی جمع)۔۔شک وشبہ۔۔وہم وگمان۔

احداث: نئی بات نکالنا۔۔جدت طرازی۔

اختراع: ایجاد کرنا۔۔طبیعت سے نئی بات پیدا کرنا۔

اختصار: خلاصہ۔۔طوالت کی ضد۔

اختصاص: خاص کرنا۔۔خاص ہونا۔۔خصوصیت رکھنا۔

اخذ: لے لینا۔۔پکڑ لینا۔۔اختیار کرنا۔

ادعاء: دعویٰ کرنا۔۔اپنی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو واقعی نہ ہو۔

اذعان: یقین۔۔بھروسہ۔

استبعاد: دوری اور علیحدگی چاہنا۔

استحضار: حاضری چاہنا۔۔یاد۔۔یادداشت۔

استحقاق: سزاوار ہونا۔۔مستحق ہونا۔

استدلال: دلیل۔۔برہان۔۔ثبوت۔۔دلیل طلب کرنا۔۔دلیل لانا۔

استشہاد: شہادت طلب کرنا۔۔گواہی چاہنا۔

استطاعت: طاقت۔۔قدرت۔۔بساط۔۔دسترس۔۔مقدور۔

استعارہ: علم بیان کی اصطلاح میں مجاز کی ایک قسم جس میں کسی لفظ کے مجازی اور حقیقی معنی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہوتا ہے اور بغیر حروفِ تشبیہ کے حقیقی معنی کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً 'نرگس' کہہ کر 'آنکھ' مراد لینا۔

استغراق: خدا کی یاد میں محو ہو جانا۔

استفادہ: فائدہ حاصل کرنا۔۔نفع اٹھانا۔

استفہام: دریافت کرنا۔۔سمجھنے کی کوشش کرنا۔۔پوچھنا۔

استقامت: کسی امر پر مضبوط رہنا۔

استقرار: ٹھہرنا۔۔قرار پکڑنا۔۔طے پانا۔۔قائم ہونا۔

استنباط: نکالنا۔۔چننا۔۔نتیجہ اخذ کرنا۔

استیصال: بیخ کنی۔۔جڑ سے اکھیڑنا۔

استیقان: جاننا۔۔یقین کرنا۔

استیلا: غلبہ۔۔غالب ہونا۔۔قابو میں رکھنا۔

استیمان: برکت حاصل کرنا۔۔قسم کھلانا۔

اشتغال: مشغول ہونا۔۔مصروف ہونا۔۔مصروفیت۔

اشد واشق: شدید ترین۔۔سخت ترین۔۔نہایت سخت۔

اشدیت: نہایت شدید ہونا۔

اشرار: شریر کی جمع۔

اشکال: مشکل پیش آنا۔۔مشکل۔۔دشواری۔۔دقت۔

اصنام: (صنم کی جمع)۔۔بت۔۔مورتی۔

اعتزال پسندی: فرقہء معتزلہ کو پسند کرنا۔

اعراض: منہ پھیرنا۔۔بچنا۔۔روگردانی کرنا۔
اعواض: بدلہ۔
افادہ: نفع۔۔یافت۔۔تعلیم۔۔تلقین۔۔تربیت۔
افترا: جھوٹا الزام۔
افراد وانواع: قسم۔۔جنس۔
افراط وتفریط: کمی بیشی۔
اقترانِ عمل: عمل کے نزدیک ہونا۔۔عمل کرنا۔
اقتصار: مختصر کرنا۔۔کافی سمجھنا۔۔ایک بات پر ٹھہر جانا۔
اکتفاء: کفایت کرنا۔۔کافی سمجھنا۔۔کافی ہونا۔۔بس کرنا۔
التزام: کسی بات کو لازم کر لینا۔۔ضرور قرار دے لینا۔
الحاد: سیدھے راستے سے کترا جانا۔۔دین حق سے پھر جانا ۔۔ملحد ہو جانا۔
امتثال امر: حکم کی تعمیل۔
امتناع: روک۔
امثال ونظائر: مثل ومانند۔
امصار: (مصر کی جمع)۔۔بہت سے شہر۔
انتباذ: نبیذ بنانا۔۔کھجور وغیرہ سے کشید کر کے نشہ آور چیز بنانا۔
انتفاع: فائدہ اٹھانا۔۔نفع پانا۔
انذار وانزجار: ہٹ جانا و پلٹ جانا۔
انس: محبت۔۔لگاؤ۔
انقیاد: تابع ہونا۔۔مطیع ہونا۔۔فرمانبرداری۔
انہماک: مصروفیت۔۔محویت۔۔انتہائی مشغولیت۔
ایجابی: منظور کر لینے والا۔۔قبول کر لینے والا۔
ایہام: شک یا وہم میں ڈالنا۔۔شک یا وہم ہونا۔

۔۔ ب ۔۔

بابِ مناکحت: نکاح کے باب میں۔۔نکاح کے معاملے میں ۔۔شادی کے تعلق سے۔
باطلہ وعاطلہ: باطل۔۔بے اصل۔۔غلط۔۔ناحق۔۔ فضول۔۔مہمل۔۔بیہودہ۔
بالاستقلال: مضبوطی سے۔۔مستقل مزاجی سے۔
بالائے طاق: فراموش کیا ہوا۔
بالجہر: با آوازِ بلند۔۔تیز آواز میں۔۔اونچی آواز سے۔
بالکلیہ: بالکل ہی۔۔پوری طرح سے۔
بسط: تفصیل۔۔تشریح۔۔وضاحت۔
بضاع ونفوس: پونجی۔۔دولت۔۔نفس۔۔جان۔
بطریق اجمال: اختصار کے ساتھ کہنا۔۔مختصر طور پر۔
بطورِ قاعدۂ کلیہ: اس عام قاعدہ یا اصول جو سب پر لاگو ہو، کے طور پر۔
بُعد: دوری۔۔فاصلہ۔۔مسافت۔
بلاد وامصار: قصبے اور شہر۔
بلیغ رد: کامل طور پر کسی بات کو واپس موڑ دینا۔۔شاندار مخالفت۔

۔۔ ت ۔۔

تارک الدنیا: دنیا چھوڑنے والا۔۔دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنیوالا۔۔دنیا سے علیحدہ ہو کر رہنے والا۔
تارکین: (تارک کی جمع)۔۔چھوڑنے والا۔۔ترک کرنے والا۔
تاکید اکید: سخت حکم۔۔سخت اصرار۔
تاکیدی: ضروری۔۔سخت۔۔اصرار کا۔
تاویل: شرح۔۔بیان۔
تبعیت: مطابعت۔۔اتباع۔۔پیروکاری۔۔تقلید۔۔نقل ۔۔اطاعت۔۔فرمانبرداری۔
تبعیض: جدا جدا کرنا۔۔تمیز کرنا۔
تجرد: شادی نہ کرنا۔۔دنیا ترک کر دینا۔۔تنہائی۔۔خلوت گزینی۔
تحذیر وتخویف: ہوشیار کرنا۔۔خبردار کرنا۔۔خوف دلانا۔۔ڈرانا۔
تحریم خلود نار: آگ میں ہمیشہ نہ رہنے کی ممانعت۔
تحصیل: حاصل کرنا۔۔وصول کرنا۔۔جمع کرنا۔۔سیکھنا۔
تحقیر: نفرت۔۔حقارت۔۔بے قدری۔۔ذلت۔۔بے حرمتی۔
تحکیم: حکم بنانا۔
تخلیص: بچانا۔۔چھڑانا۔۔خلاصی۔۔آزادی۔

تذکیر: بیان۔۔ذکر۔۔یاد۔

تراخی: دیر۔۔تاخیر۔

ترتب: مرتب ہونا۔۔ترتیب پانا۔۔نتیجہ دینا۔

ترسیل: بھیجنا۔۔روانہ کرنا۔

ترشح: ظاہر ہونا۔۔آشکارا ہونا۔

ترک: چھوڑنا۔

ترک وقطع: چھوڑنا اور کاٹنا۔

تزویج: شادی کرنا۔۔نکاح کرنا۔

تساہلی: سستی۔۔غفلت۔۔آلکسی۔

تسویہ: برابر کرنا۔۔ٹھیک کرنا۔۔سیدھا کرنا۔

تشبیہ وتعطیل: صفات باری تعالیٰ کے انکار کرنے والوں کا مذہب۔

تشریک: شرکت۔

تصریح: صاف طور پر بیان کرنا۔۔واضح کرنا۔

تصغیر: چھوٹا کرنا۔۔تخفیف۔

تصویب: سچا کہنا۔۔منظوری۔۔تصدیق۔

تطویل: دراز کرنا۔۔لمبا کرنا۔

تطہیر: پاک کرنا۔۔پاکی۔

تعجیل: جلدی کرنا۔۔جلدی۔۔عجلت۔

تعزیراً: سزا کے طور پر۔

تعقل: سمجھنا۔۔سوچنا۔۔غور کرنا۔

تعمیم: عموم۔۔عموم کرنا۔۔عمومیت۔

تغلیباً: یہ تغلیب سے ہے۔۔غلبہ پانا۔۔تسلط پانا۔

تفنن: طرح طرح کا ہونا۔

تفوق: برتری۔۔فوقیت۔۔بڑائی۔۔فضیلت۔

تفویض: سپرد کئے گئے۔۔حوالے کئے گئے۔

تقدیس: پاکیزگی۔۔پاکی۔۔تقدس۔

تقدیم: ترجیح۔۔فوقیت۔۔مقدم سمجھنا۔

تقصیرات: کوتاہیاں۔۔خطا۔۔قصور۔۔بھول چوک۔۔سہو۔

تمکن: جگہ پکڑنا۔۔اختیار ہونا۔۔طاقت۔۔اختیار۔۔قابو۔

تنزلات: نیچے اترنا۔۔گھٹاؤ۔۔زوال۔۔تخفیف۔

تنزیہہ: پاکی۔

توجیہہ: وجہ بیان کرنا۔۔باعث بتانا۔۔دلیل لانا۔۔دلیل۔۔وجہ۔

توضیح: واضح کرنا۔۔شرح۔۔وضاحت۔۔کھول کر بیان کرنا۔

توہم واحتمال: وہم۔۔وسواس۔۔شک۔۔گمان۔

-- ﴿ ج ﴾ --

جدیر: اہل، شائستہ۔

جرعہ کشی: گھونٹ گھونٹ کر کے پینا۔۔پینے کی عادت۔۔برداشت۔

جلیس: ساتھی۔۔رفیق۔۔ہم نشین۔

جمعیت خاطر: دل کا اطمینان۔۔بےفکری۔۔دل جمعی۔

جویاں: ڈھونڈنے والا۔۔تلاش کرنے والا۔

-- ﴿ چ ﴾ --

چیستاں: پہیلی۔۔معمہ۔

-- ﴿ ح ﴾ --

حجابات: پردہ۔۔نقاب۔۔شرم لحاظ۔

حد: سزا جو شریعت اسلامیہ کے مطابق دی جائے۔

حدائق: (حدیقہ کی جمع)۔۔باغات۔

حذاقت: عقلمندی۔۔دانائی۔

حرفِ نداء: وہ لفظ جو بلانے کیلئے استعمال ہو، جیسے 'یا'۔

حصر: گھیرنا۔۔احاطہ کرنا۔۔منحصر کرنا۔

حصولِ فراغ: کشادگیء برکت کیلئے۔

حیطہء بیان: احاطہء بیان۔۔دائرۂ بیان۔

حظوظِ نفسانیہ: حیوانی مزے۔۔جماع۔۔

حلاوت: لذت۔۔مزہ۔۔ذائقہ۔

حلت وحرمت: حلال وحرام ہونا۔

-- ﴿ خ ﴾ --

خاکساری: عجز۔۔انکساری۔۔عاجزی۔۔فروتنی۔

خارجیت نوازی: خارجی فرقے کی طرفداری۔۔ظاہری امور پر زور دینے کے مسلک کی طرفداری۔

خسیس: کنجوس۔۔بخیل۔۔تنگ دل۔۔نالائق۔

خوگر: جسے کسی بات کی عادت پڑ گئی ہو۔

خویش: قریب کا۔۔رشتے کا۔۔اپنا۔

۔۔ ﴿ د ﴾ ۔۔

داعی: دعوت دینے والا۔۔بلانے والا۔

داعی اجل کو لبیک کہنا: مرجانا۔۔وفات پاجانا۔

دبیز: موٹا۔۔گف۔۔مضبوط۔

دراز قامت: لمبا قد۔۔اونچا قد۔

دراز گوش: لمبے کانوں والا جانور۔۔گدھا یا خچر وغیرہ۔

درشتی: سختی۔۔بے رحمی۔۔بدخلقی۔

دروغ: جھوٹ۔۔کذب۔۔بہتان۔

دعائم: ستون۔۔کھمبا۔

۔۔ ﴿ ذ ﴾ ۔۔

ذوقِ حسی: مزہ جو محسوس کیا جاسکے۔

ذوقِ معنوی: حقیقی مزہ۔۔حقیقی لطف۔

ذہول: غفلت۔۔بھول۔

۔۔ ﴿ ر ﴾ ۔۔

رداءِ وصال: ملاپ کی چادر۔۔ملاپ کا پردہ۔۔اوڑھنی جس میں دو ملتے ہوں۔

رذائل: کمینہ پن کی حرکتیں۔۔خراب باتیں۔

رفع: بلندی۔۔بلند کرنا۔

رفع مفاسد: برائیوں کو ختم کرنا۔۔فتنے دور کرنا۔

رمق: تھوڑی سی بھی جان۔۔رہی سہی جان۔۔آخری سانس۔

۔۔ ﴿ ز ﴾ ۔۔

زجر و توبیخ: ڈانٹ ڈپٹ۔

زلات: (زلت کی جمع)۔۔قدم کا بہک جانا۔

زن: عورت۔

زنادقہ: (زندیق کی جمع)۔۔وہ شخص جو خدا کی وحدانیت کا قائل نہ ہو۔

زہاد: (زاہد کی جمع)۔۔دنیا سے رغبت نہ رکھے والا۔۔متقی۔۔پرہیزگار۔

زیغ و فتور: کمی۔۔خرابی۔۔ٹیڑھا پن۔۔نقص۔

۔۔ ﴿ س ﴾ ۔۔

سد باب: قطعاً روک دینا۔۔بالکل ختم کردینا۔

سماحت: فیاضی۔۔سخاوت۔۔خوش طبعی۔

سنن: سنت کی جمع۔

سنویہ: سال میں ایک بار۔۔سالانہ۔

سیئات: برائیاں۔۔بدیاں۔

۔۔ ﴿ ش ﴾ ۔۔

شاداں و فرحاں: خوشحال۔۔خوش۔۔شادماں۔

شرو قبائح: بدیع۔۔برائی۔۔فساد۔۔بری باتیں۔۔نیچ حرکتیں۔

شہادت لسانی: زبانی شہادت۔۔زبانی اقرار۔

شہود: حاضر ہونا۔۔اہل تصوف کی اصطلاح میں وہ درجہ جس میں جلوۂ حق بلکہ ہر شئے عین حق نظر آئے۔

۔۔ ﴿ ص ﴾ ۔۔

صادر: نافذ۔۔جاری۔

صباحت: گوراپن۔۔خوبصورتی۔۔جمال۔

صراحت: تشریح۔۔وضاحت۔

صعوبت: دقت۔۔مشکل۔۔تکلیف۔

صغر سنی: بچپن۔۔کم عمری۔

صفوف: (صف کی جمع)۔۔ایک لائن میں۔۔ایک ساتھ۔

۔۔ ﴿ ض ﴾ ۔۔

ضرب و شتم: مارپیٹ۔۔برا بھلا کہنا۔

ضلالت: گمراہی۔۔گناہ۔۔خطا۔

فقدان: کمی۔

۔۔ ﴿ ع ﴾ ۔۔

عارض: رخسارہ۔۔گال۔۔رخ۔

عالمِ بے استطاعی: استطاعت نہ ہونے کی حالت میں۔

عتق: آزادی۔۔رہائی۔۔آزاد کرنا۔۔رہا کرنا۔

عصبیت: طرفداری۔۔رشتہ داری۔۔قرابت۔

عصمت: پارسائی۔۔پاکدامنی۔۔پرہیزگاری۔۔بے گناہی۔

عصیان: گناہ۔۔جرم۔۔خطا۔۔قصور۔

عقاب: دکھ۔۔تکلیف۔۔عذاب۔۔سزا۔

علقہ ومضغہ: گوشت اور لوتھڑا۔

عمارت وسقایت: مکان و پانی پلانا۔

عمریہ: عمر میں ایک بار۔

عمل جوارح: انسانی بدن کے اعضا کا عمل۔

عوارض: (عارضہ کی جمع)۔۔پیش آنے والی چیزیں۔

۔۔ ﴿ غ ﴾ ۔۔

غایت قرب: نہایت قربت۔

غنائم: (غنیمت کی جمع)۔۔مالِ غنیمت۔

۔۔ ﴿ ف ﴾ ۔۔

فرامین: (فرمان کی جمع)۔۔حکم۔۔احکامات۔

فرعیت: ثانویت۔۔ثانوی حیثیت۔

فرمودات: فرمایا ہوا۔۔ارشاد۔۔حُکم۔

فروتنی: عاجزی۔

فروع: (فرع کی جمع)۔۔شاخیں۔

فسق: نافرمانی۔۔جرم۔۔بدکاری۔۔گناہ۔

فصحاء: (فصیح کی جمع)۔۔خوش بیان۔۔شیریں کلام۔۔رواں زبان میں بات کرنے والا جسکے کلام میں فصاحت ہو۔

فضیحت: ذلت۔۔بدنامی۔۔رسوائی۔

۔۔ ﴿ ق ﴾ ۔۔

قانع: قناعت کرنے والا۔۔جو مل جائے، اسی پر راضی رہنے والا۔

قاہر: قہر کرنے والا۔۔غالب۔

قباحت: دشواری۔۔دقت۔۔مشکل۔۔مصیبت۔

قذف وشتم: گالی گلوچ۔۔دشنام۔۔کسی پر زنا کی تہمت لگانا۔

قرطاس: صفحات۔

قرین قیاس: وہ بات جسے عقل قبول کرے۔

قصاص: بدلہ۔۔جزا۔۔مکافات۔۔خون کا بدلہ خون۔

قصد: ارادہ۔

قصد تقرب الی اللہ: اللہ کے قریب ہونے کا ارادہ۔

قضیوں: جملے۔۔فقرے۔۔عبارت کے ٹکڑے۔

قیاس: (منطق)۔۔دو جملوں سے مرکب قول، جس سے نتیجہ لازم آئے۔

۔۔ ﴿ ک ﴾ ۔۔

کتمان: چھپاؤ۔۔پوشیدگی۔

کج روی: ٹیڑھی چال چلنا۔۔الٹے راستے پر چلنا۔

کما حقہ: پورے طور پر۔۔جیسا کہ حق ہے۔

کنایۃً: اشارۃً۔۔اشارے سے۔۔ضمناً۔۔مجازاً۔

کوردہ: کم آبادیا چھوٹا گاؤں جسے کوئی جانتا نہ ہو۔

۔۔ ﴿ گ ﴾ ۔۔

گوشمالی: سزا دینا۔۔کان کھینچنا۔

۔۔ ﴿ ل ﴾ ۔۔

لاینحل: جو حل نہ ہو سکے۔۔مشکل۔۔پیچیدہ۔

لطافت فہم: عقل و دانائی کی باریکی۔

لوثِ نطفہ: نطفہ کی آمیزش۔

-- ﴿ م ﴾ --

ماکولات: کھانے۔۔کھانے کی چیزیں۔

مآل: مرجع۔۔جائے رجوع۔

ماثور: وہ جو حدیث سے معلوم ہو۔

مامور: حکم کیا گیا۔۔اجازت دیا گیا۔۔مقرر۔

مامورات: مقررات۔۔متعین احکامات۔

ماندگی: تکان۔۔تھکن۔

مانع خلودِ نار: ہمیشہ کیلئے دوزخ میں رہنے سے جو چیز روکے۔

مانع دخولِ نار: دوزخ میں داخل ہونے سے جو چیز روکے۔

مانعین: رکاوٹ کرنے والے۔۔منع کرنے والے۔

ماوشما: ہم تم۔۔عام لوگ۔۔ہر کس و ناکس۔

مبالغہ: کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔۔حد سے زیادہ تعریف یا برائی کرنا۔۔حد سے زیادہ بڑھانا۔۔زیادہ گوئی ۔۔کسی کام میں سخت کوشش کرنا۔

مبایعت: باہم خرید و فروخت۔

مبتداء: اصطلاح علم نحو میں جملہ اسمیہ کا پہلا جز جسکے متعلق کوئی خبر دی جائے۔

مبتدئین: ابتداء کرنے والے۔۔شروع کرنے والے۔

مبداء: نقطہ آغاز۔۔نکلنے کی جگہ۔

مبہم: وہ جسکا مطلب صاف نہ ہو۔

متأخرین: (متأخر کی جمع)۔۔پیچھے آنیوالے لوگ۔ آخیر زمانے والے۔

متانت علم: علم کی پختگی۔

متبادر: جلد ذہن میں آنے والا۔

متشابہات: (متشابہ کی جمع)۔۔قرآن شریف کی وہ آیتیں جن کے معنی خدائے تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔۔وہ آیات جن کے ایک سے زائد معنی ہو سکتے ہیں۔

متصرف: قبضہ میں رکھنے والا۔۔قابض۔

متصف: جسکے ساتھ کوئی صفت لگی ہو۔۔صفت رکھنے والا۔

متضمن: داخل کیا ہوا۔۔شامل کیا ہوا۔

متعارض: ایک دوسرے کے خلاف۔

متعدی: نحو میں وہ فعل جو مفعول کو چاہے۔

متفرع: کسی چیز سے اسکی شاخ کی طرح نکلنے والا۔

متقدمین: اگلے زمانے کے۔۔سابقین۔

متکفل: کافی۔۔کفالت کرنے والا۔۔مکمل ذمہ دار۔

متکلمین: (متکلم کی جمع)۔۔وہ لوگ جو مذہبی امور عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔۔علم الکلام کے ماہر۔

متنفس: انسان۔۔آدمی۔۔بشر۔۔نفر۔

متوسطین: (متوسط کی جمع)۔۔اوسط درجہ والے۔۔درمیان والے۔

متہم: جس پر تہمت لگائی گئی ہو۔

مجتہدین: (مجتہد کی جمع)۔۔کتاب و سنت سے دینی مسائل نکالنے والے۔

مجرد: (نحو)۔۔وہ کلمات جن میں حرفِ اصلیہ ہوں، کوئی حرف زائد نہ ہو۔

مجرورات: وہ کلمے جنکے آخیر کے حرف کے نیچے کثرہ یا زیر آئے۔

مجمل: اجمال کیا گیا۔۔جس میں اختصار برتا گیا۔۔مختصر کیا گیا۔

محاسبہ: حساب۔۔شمار۔۔پڑتال۔۔حساب کے مطابق پوچھنا۔۔ اپنے آپ کا حساب لینا۔

محذور: جس چیز سے پرہیز کرنا چاہئے۔

محذورات: جن چیزوں یا باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

محذوف: حذف کیا گیا۔۔علیحدہ کیا گیا۔۔الگ کیا گیا۔نکالا گیا۔

محرک: ابھارنے والا۔۔اکسانے والا۔

محظورات: ناجائز۔۔خلافِ قانون۔۔ممنوع۔

محکوم: تابع۔۔ماتحت۔۔زیر فرمان۔

مدون: جمع کیا ہوا۔۔ترتیب دیا ہوا۔

مذموم: بری۔۔خراب۔۔قبیح۔۔جسکی برائی کی جائے۔

مرابطت: آپس کے تعلقات۔

مرادف: ہم معنی، جیسے 'خانہ' مرادف ہے 'گھر' کا۔

مراقبہ: سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کا دھیان کرنا۔

مرتب: ترتیب دیا گیا۔۔اکٹھا کیا گیا۔۔تالیف کیا گیا۔

مرجیہ: ایک فرقے کا نام۔
مساعدت: یاری۔۔یاوری۔۔اعانت۔۔مدد۔
مساوات: برابری۔۔ہمسری۔
مساویانہ: برابری کا۔
مستبعد: دوراز قیاس۔۔دشوار۔
مستحب: پسند کیا گیا۔۔اصطلاحِ فقہ میں وہ فعل جسے آنحضرت ﷺ نے پسند فرما کر خود کیا ہو یا اسکا ثواب بیان فرمایا ہو۔
مستحسن: نیک۔۔پسندیدہ۔۔خوب۔۔بہتر۔
مستدعی: ملتجی۔۔التجا کرنے والا۔۔چاہنے والا۔
مستعد: آمادہ۔۔تیار۔۔کمربستہ۔
مستفاد: فائدہ حاصل کیا ہوا۔۔وہ چیز جو فائدے میں حاصل ہو۔
مستقر: ٹھہرنا۔۔قرار پکڑنا۔
مستعمل: استعمال میں لایا گیا۔۔استعمال ہوتا ہے۔
مستلزم: کوئی کام اپنے اوپر لازم کرنے والا۔
مسدود: بند کیا گیا۔۔روکا گیا۔۔بند۔۔رکا ہوا۔
مسکرات: (مسکر کی جمع)۔۔نشہ لانے والی چیزیں۔
مسموع: سنی ہوئی۔
مسئول: سوال کیا گیا۔۔جس سے سوال کیا جائے۔
مشتے نمونے از خروارے: ڈھیر میں سے مٹھی بھر۔۔تھوڑے سے نمونے سے کل چیز کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔
مشروعیت: شرعاً جائز ہونا۔۔شرعی جواز۔
مصاحبت: ہم نشینی۔۔ساتھ رہنا۔۔ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔
مصداق: وہ شئے جس پر کسی معنی کا اطلاق ہو۔
مصر: اصرار کرنیوالا۔۔کسی چیز پر اڑ جانیوالا۔
مضحکہ خیز: ہنسی مذاق کی (بات)۔۔ہنسانے والی (بات یا حرکت)۔
مطاع و متبع: اطاعت کیا گیا۔۔وہ شخص جسکی اطاعت کی جائے۔
مطرود: دھتکارا ہوا۔۔نکالا ہوا۔۔مردود۔
معاصی: (معصیت کی جمع)۔۔گناہ۔۔قصور۔۔خطا۔۔نافرمانی۔
معتدبہ: بہت سے۔۔تعداد میں بہت زیادہ۔
معتزلہ: روشن خیال مسلمانوں کا ایک فرقہ جو نقل کی بجائے عقل پر زور دیتا تھا۔۔یونانی فلسفے سے متاثر تھا اور عقلیت پسند کہلاتا تھا۔اسکا سرخیل خلافت بنی عباس کا قاضی القضاۃ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید عقلاً معلوم ہو سکتی ہے۔اسلئے وحی کے بغیر ہی اہل عقل وحکمت توحید پر ایمان لا سکتے ہیں۔۔ یہ لوگ اللہ کو منزہ عن الصفات خیال کرتے تھے،یعنی خدا میں متضاد صفات نہیں ہو سکتیں۔مامون رشید کے دور میں یہ سرکاری مذہب تھا۔
معدن و مخزن: نکلنے کی جگہ۔۔جہاں سے کوئی چیز نکلے۔
معرفت: پہچان۔
معروضات: (معروضہ کی جمع)۔۔عرض۔۔گزارش۔
معصیت: گناہ۔۔قصور۔۔خطا۔۔نافرمانی۔
معمہ: مخفی۔۔پوشیدہ۔۔مبہم چیز۔۔پہیلی۔۔پیچیدہ بات۔۔ الجھا ہوا مسئلہ۔
مغایرت: غیریت۔۔اجنبیت۔۔ناموافقت۔
مفاسد: (مفسدہ کی جمع)۔۔فساد۔۔خرابیاں۔۔برائیاں۔۔ فتنے۔۔جھگڑے۔
مفتاح: کنجی۔۔چابی۔۔تالی۔
مفروضہ: فرض کیا گیا۔
مفقود: غائب۔۔ناپید۔۔ندارد۔
مفوض: سپرد کیا گیا۔
مقارن و متصل: قریب۔۔نزدیک۔۔ملی ہوئی۔
مقتضائے وقت: وقت کی ضرورت کے تحت۔
مقتضی: تقاضہ کرنے والا۔۔چاہنے والا۔
مقرب: قربت والے۔۔قریب والے۔
مقہور: قہر کیا گیا۔۔جس پر غصہ ہو۔
ملاحدہ: (ملحد کی جمع)۔۔کافر۔۔بے دین۔۔راہِ حق سے پھرا ہوا۔
ملتبس: مبہم۔۔غیر واضح۔
ملذذات: لذیذ چیزیں۔۔لذت والی چیزیں۔
ملکہ: مہارت۔
ملکہ ءراسخہ: پکی مہارت۔۔مضبوط استعداد۔۔پکی قابلیت۔

مناصب: (منصب کی جمع)۔۔رتبہ۔۔مرتبہ۔۔درجہ۔
مناقب: (منقبت کی جمع)۔۔تعریفیں۔۔خوبیاں۔۔
اصحابِ کبار کی مدح۔
منتفی: فنا ہونے والا۔۔نیست ہونے والا۔
منتہی: کامل کرنے والا۔
مندوبات: انتخاب کی گئی۔
منزہ: عیبوں سے بری۔۔پاک۔۔مبرہ۔
منصرف: اصطلاحِ صرف ونحو میں وہ صیغہ جسکی گردان ہوسکے۔
منکرین: انکار کرنے والے۔
منقبض: اپنے آپ کو کھینچ کر رکھنا۔۔اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔
منہدم: گرا ہوا۔۔مسمار۔۔زمین بوس۔۔ختم ہو جانا۔
منہیاتِ شرعیہ: شرع اسلام میں منع کی ہوئی چیزیں۔۔اسلامی
قانون کے تحت جو بری باتیں ہوں۔
مواظبت: ایک کام ہمیشہ کئے جانا۔۔کام میں لگے رہنا۔
موانعات: رکاوٹ پیدا کرنے والی چیزیں۔
موجودومکون: ایجاد کرنیوالا۔۔نئی بات نکالنے والا۔۔
پیدا کرنیوالا۔
موذی: اذیت دینے والی چیزیں۔
موضوع: وضع کیا گیا۔۔بنائی گئی۔۔اختراع کی گئی۔
موشگافیوں: بال کی کھال اتارنا۔۔تنقید کرنا۔۔نکتہ چینی کرنا۔

۔۔ ﴿ ن ﴾ ۔۔

ناجی: نجات والا۔۔
نافرمودات: جنکا حکم نہیں دیا گیا۔۔جو باتیں نہیں فرمائی گئیں۔
ناقض: توڑنے والی۔
ناکردنی: نا کرنے کے لائق۔
نامشروع: شرع کے موافق نہ ہونا۔۔جائز نہیں کیا گیا۔
نجباء: (نجیب کی جمع)۔۔شرفا۔۔شریف لوگ۔
نسیان: بھول چوک۔
نصوصِ شرعیہ: اسلامی شرع کے تعلق سے قرآن کریم کی وہ آیات
جن کے معنی صاف اور صریح ہوں۔
نقیض: الٹا۔۔برعکس۔۔ضد۔

۔۔ ﴿ و ﴾ ۔۔

واہمہ: قوت تصور۔۔وہ قوت جس سے ایسی باریکیاں اور جزئیات
معلوم ہوتی ہیں جنکا تعلق محسوسات سے ہے۔۔وہم۔۔
گمان۔۔خیال۔
وساطت: واسطے سے۔
وطی: جماع کرنا۔

۔۔ ﴿ ہ ﴾ ۔۔

ہجرت کبریٰ: بڑی ہجرت۔
ہیئت کذائی: موجودہ حالت۔۔جیسی کہ حالت ہے۔
ہیئت مخصوصہ: خاص شکل جو مخصوص کر دی گئی ہو۔

۔۔ ﴿ ی ﴾ ۔۔

یافت: نفع پانا۔۔حاصل کرنا۔

ہماری دوسری مطبوعات:

اردو ترجمۂ قرآن بنام 'معارف القرآن'
مترجم: مخدوم الملۃ علامہ سید محمد اشرفی جیلانی المعروف بہ حضور محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ

قرآن کریم کا اردو زبان میں نہایت ہی آسان، سلیس اور انوکھا ترجمہ جسکا مطالعہ کرنے سے قرآنِ کریم کا مفہوم دل ودماغ میں اترتا چلا جاتا ہے۔ مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ نے اس ترجمہ کا شروع کا حصہ دیکھ کر فرمایا،
'شہزادے، آپ اردو میں قرآن لکھ رہے ہو۔۔۔'

'سید تفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی' ﴿جلد اوّل﴾ ۴۴۸ صفحات

مفسر اوّل: الٓمّٓ ۱ محدث اعظم ہند، حضرت علامہ سید محمد اشرفی جیلانی قدس سرہ
مفسر دوم: سیقول ۲ تلک الرسل ۳ شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی

'سید تفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی' ﴿جلد دوئم﴾ ۴۲۴ صفحات

مفسر: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی

'سید تفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی' ﴿جلد سوئم﴾ ۳۹۲ صفحات

مفسر: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی

'مسئلہ قیام وسلام اور محفل میلاد' ﴿۶۴ صفحات﴾

'محبت رسول ﷺ روح ایمان' ﴿۹۵ صفحات﴾
('حدیث محبت' کی عالمانہ، فاضلانہ اور محققانہ تشریح)

'تعلیم دین وتصدیق جبرائیل امین' ﴿۱۱۰ صفحات﴾
('حدیث جبرائیل' کی فاضلانہ تشریح)

'فریضۂ دعوت وتبلیغ' ﴿۳۶ صفحات﴾

'مقالاتِ شیخ الاسلام' ﴿۱۴۰ صفحات﴾

'اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ' ﴿۳۲ صفحات﴾
'حدیث نیت' کی محققانہ تشریح'

'دین کامل' ﴿۳۲ صفحات﴾

'نظریۂ ختم نبوت اور تحذیر الناس' ﴿۴۶ صفحات﴾

'تصدیق نامہ'

میں نے گلوبل اسلامک مشن، ﴿نیویارک، یوایس اے﴾ کی کتاب، بنام:

'الاربعین الاشرفی' ﴿فی تفہیم الحدیث النبوی ﷺ﴾

کی طباعت کے وقت اسکے ہر صفحہ کو حرفاً حرفاً بغور پڑھا ہے۔

تصدیق کی جاتی ہے کہ اس میں موجود قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ اور احادیث شریفہ کے الفاظ اور اعراب دونوں بالکل صحیح ہیں۔ اور میرا یہ سرٹیفکیٹ درستگی اور اغلاط سے پاک ہونے کا ہے۔ دورانِ طباعت اگر کوئی زیر، زبر، پیش، جزم، تشدید یا نقطہ چھپائی میں خراب ہوجائے تو اسکا متن کتابت کی صحت سے تعلق نہیں ہے۔۔۔علاوہ ازیں ۔۔۔کتاب ھٰذا میں کوئی مضمون ملک وملت کے خلاف نہیں ہے۔

المصدق

Syed Mohd. Azmat Ali Noori
Research & Registration Officer Auqaf
Sind.

سیّد محمد عظمت علی نوری
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر
(محکمہ اوقاف،سندھ) کراچی

فقط

عبدالله وسایا خان بلوچ
منظور پروف ریڈر
وزارت مذہبی امور
پاکستان اسلام آباد
515 پریت آباد حیدرآباد

اس میں شک نہیں کہ حدیث پاک کی شرح محبت وادب والا ہی کرسکتا ہے۔ جسکی محبت عقل کے تابع ہو، وہ نہ سمجھ سکتا ہے، نہ بیان کرسکتا ہے۔۔۔ روح کو عقل کے تابع ہونا چاہئے کہ فیض کے دروازے کھلے رہیں اور مضمون وارد ہوتے رہیں۔ الحمدللہ! شارح محترم علامہ سید محمد مدنی میاں مدظلہ العالی علم وفضل اور صاحب قلب ونظر ہیں۔۔۔ آپکی تصانیف آپکے علم وفضل پر گواہ ہیں، مولیٰ تعالیٰ اہلسنّت وجماعت پر آپ کا سایہ قائم رکھے، امین۔۔۔

﴿مسعود ملت، ماہر رضویات، ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد﴾

ظاہر ہے کہ 'تفہیم الحدیث' یعنی حدیث رسول مکرم ﷺ کو سمجھانا بغیر سمجھانے والے کے کیونکر ہوگا اور یہاں ظاہر میں وہ کتاب 'الاربعین الاشرفی' ہے۔ جو شیخ طریقت، رہبر شریعت، شیخ الحدیث، جامع المنقول والمعقول، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی کی تصنیف لطیف ہے۔ اظہر من الشّمس ہے کہ تفہیم بغیر فہم کے یعنی سمجھانا بغیر سمجھنے کے کیسا ہوگا؟ کہ تفہیم موقوف ہے فہم پر۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث مبارک کو سمجھانے کیلئے پہلے اسے سمجھنا ضروری ہے اور فہم دین کہ حدیث رسول مصطفیٰ ﷺ دین مقبول کی اصل ثانی ہے، ہر کس وناکس کو کب حاصل؟ بلکہ وہ خوش نصیب جسکے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین متین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔۔۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

مَنۡ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيۡرًا يُفَقِّهۡهُ فِی الدِّيۡنِ

﴿متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح: صفحہ ۳۲﴾

اللہ تعالیٰ جسکے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کا فقیہ بنا دیتا ہے

رب کریم کا کرم ہے کہ حضرت شارح کو اپنے اسلاف واکابرین کا علمی وروحانی فیض بالعموم اور محدث اعظم ہند حضرت علامہ سید محمد کچھوچھوی علیہ رحمۃ کا بالخصوص عطا ہوا، جو آسمان شریعت وطریقت اور معرفت کے ایک تابندہ ستارے ہیں اور آپ ان ہی کے فرزندار جمند اور 'الولد سر ابیہ' کے کامل مصداق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ متعدد خوبیوں سے متصف ہیں بلکہ اپنی حد میں جامع الصفات ہیں۔ خصوصاً تحریر وتقریر میں کہ آپکی تصانیف سنیہ اور خطابات رفیعہ اہل اسلام کے قلوب و اذہان میں فہم دین کے وہ تخم بو رہے ہیں جو آنیوالے کل میں علمی وعملی پھلدار تناور شجر کی صورت میں ظاہر ہونگے۔۔۔

﴿مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی، کراچی، پاکستان﴾

حقیقت یہ ہے کہ شرح سے قاری کو حضرت شارح مدظلہ کی رسول علیہ السلام سے والہانہ وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ واضح رہے کہ وابستگیٔ رسول ﷺ کے بغیر اتنی عمدہ گفتگو متصور نہیں ہوسکتی۔ جو شخص ذاتِ رسول ﷺ پر اپنی متاعِ حیات قربان کرچکا ہو، وہی اتنی حسین تفسیر کرسکتا ہے۔ آپ بہت ہی حکیمانہ انداز میں امت مسلمہ کو رسول اللہ ﷺ اور محبوبانِ بارگاہِ الٰہی سے وابستگی کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں اور اس دعوت کیلئے مختلف لب ولہجے میں ذہن انسانی سے خطاب فرما ہیں۔۔۔

﴿علامہ مفتی سید محمد فخر الدین علوی، نیوجرسی، امریکہ﴾

شارح

شیخ الاسلام والمسلمین

حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی